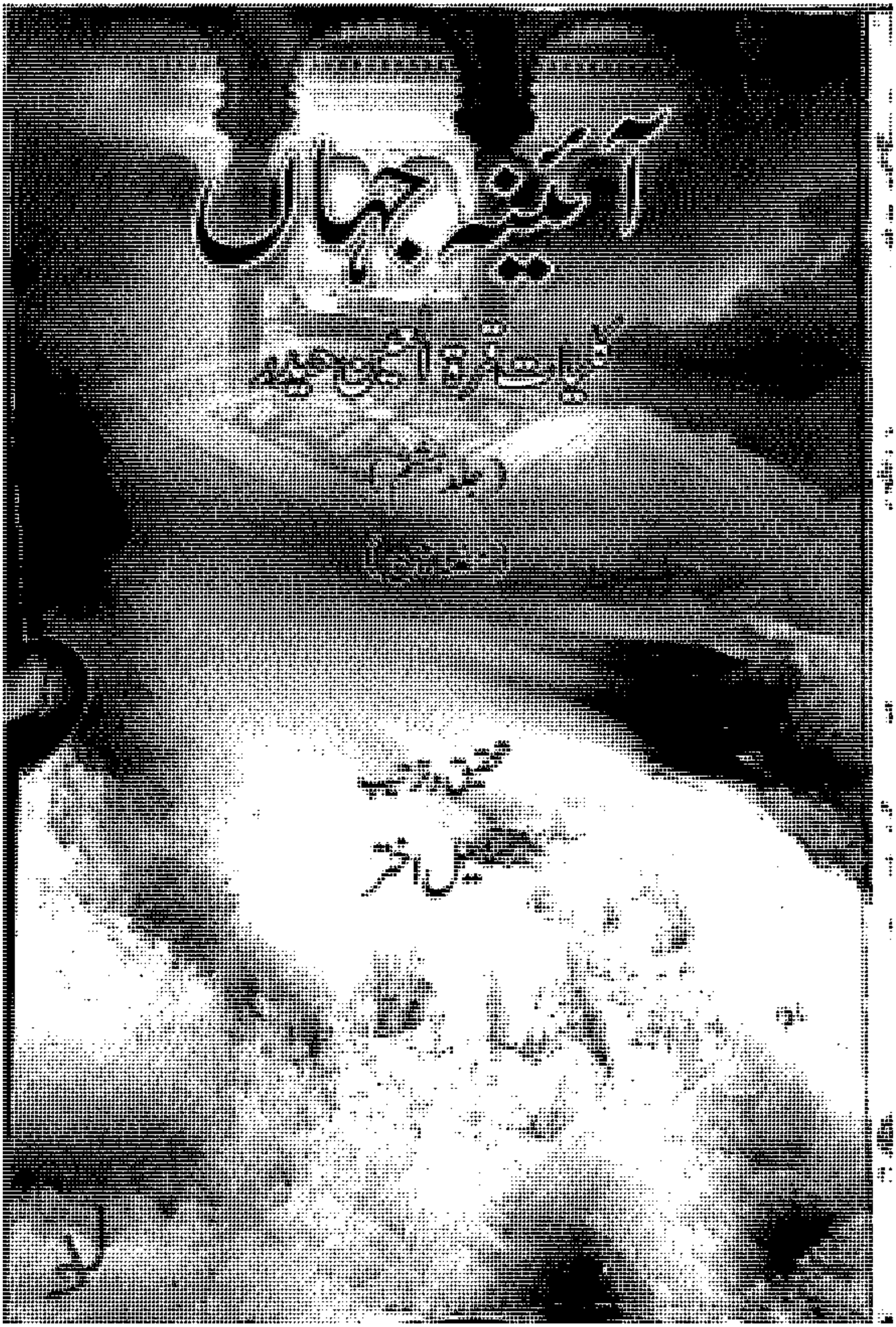

آئینۂ جہاں
کلیاتِ قرۃ العین حیدر
تحقیق و ترتیب
جمیل اختر

آئینۂ جہاں

کلیات قرۃ العین حیدر

(مضامین)

(جلد ہشتم)

تحقیق و ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2016
تعداد	:	550
قیمت	:	-/130 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1892

Aaina-e-Jahan

Kulliyat-e- Quratulain Haidar Vol. 8

By: Jameel Akhtar

ISBN :978-93-5160-126-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔ 110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔ 110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائریکٹر

مقدمہ vii

دیباچہ

ترکش 1

جاڑے کی چاندنی 19

قندیل چین 25

آگ کا دریا 61

ہوائے چمن میں خیمۂ گل 67

تعارف

سات کہانیاں 117

میرا پیغام محبت ہے 123

تخیلات 147

پیش لفظ

نوائے سروش 159
آئینہ جہاں 167
گذشتہ برسوں کی برف (صدائے آبشاراں از فراز کہسار آمد) 197

افتتاحی خطبہ

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت 217

ترجمے

یہ غلط بریں ار مانوں کی (نہور) 221
سجاد حیدر 231
تین جاپانی کھیل 237
غزل پارے 261

مقدمہ

قرۃ العین حیدر کی کلیات سازی کا کام میں نے ان کی اجازت سے ان کی حیات میں ہی شروع کر دیا تھا۔ افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل تین جلدیں اور ایک نیا افسانوی مجموعہ 'قندیل چین' ان کی حیات میں ہی شائع ہو چکا تھا لیکن عینی آپا اس کی خوشی نہ دیکھ سکیں کتاب شائع ہونے کے فوراً بعد خرابی صحت کی وجہ سے داخل اسپتال ہوئیں اور پھر جاں بر نہ ہو سکیں اور اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد بھی میں اپنے کام سے کبھی غافل نہیں رہا۔ بلکہ اپنے محدود وسائل میں رہ کر کام کرتا رہا۔ اس لیے کہ کوئی ادارہ پروجیکٹ مکمل ہونے پر کتاب تو شائع کر دیتا ہے لیکن بنیادی مآخذ کی تلاش و جستجو کے لیے جو اصراف خطیر ہوتا ہے اس کا بار اٹھانے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ اردو ادب کی افسوس ناک صورت حال ہے۔ ایسی صورت میں کسی فرد واحد کے محدود وسائل سے کوئی بڑی امید کرنا بعض وقت مایوسی کا سبب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی فرد واحد انجمن اور ادارے سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے اور اس کا یہی نادر کارنامہ فرد کی انفرادیت کو ادب کے افق پر اجاگر کر کے اس کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے اور ادبی تاریخ ایسے منفرد جیالوں سے جگمگا رہی ہے۔ ورنہ اردو ادب کی دگرگوں صورت حال میں اس کی ساری وراثت تہہ و بالا ہو جاتی اور سارا سرمایہ تہہ تیغ ہو جاتا۔ لیکن

ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا ساز گار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کر لیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو بچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المناکی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... سر دم دکھم دکھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سر سید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذر آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ

ادبی ذوق وشوق رکھنے والے افراد نے بے سروسامانی کے عالم میں ایسے محیرالعقول کارنامے انجام دیے جس کی نظیر کسی اور زبان کے ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ بار بار مغرب کا حوالہ دینے اور مغرب کی نقالی سے اردو ادب کی اصناف کو مالا مال کرنے والوں نے مغرب کی طرز فکر اور ان کے طرز عمل کو تحقیق وتنقید کے لیے معیار کیوں نہیں بنایا جس سے اردو ادب کی پس ماندگی کو دور کیا جا سکتا اور اعلیٰ ادب اور اعلیٰ تحقیق وتنقید کے لیے فضا سازگار ہوتی۔ گفت وشنید کی حد سے آگے، عملی طور پر یہ معاملہ کبھی جا بھی سکے گا؟ شاید کبھی ایسا ہوا تو وہ اردو ادب کی خوش حالی کا دن ہوگا۔

قرۃ العین حیدر کی وفات کے بعد ان کی کلیات کو مکمل کرنے کا کام چیلنج سے بھرا ہوا ہے۔ عمر بھر اپنی اور ہندستانی وراثت کے بکھرے ہوئے باب کو مجتمع کرنے والی خاتون کی اپنی وراثت کی محافظت خطرے میں ہے۔ اس بے بسی پر ادب کی رکھوالی کرنے والے ادارے وافراد کیا اپنی آنکھیں خشک کر لیں گے۔ چھوڑی ہوئی دولت پر دعویٰ کرنے والے تو پچاسوں رشتہ دار جس کے نہیں بھی ہوں تو بھی نکل آتے ہیں، لیکن ادبی وراثت کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اس کی اولاد بھی۔ میں نے یہ صورت حال اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ قرۃ العین حیدر جن کے رشتے دار دنیا کے کئی براعظموں میں پھیلے ہوئے ہیں اور قرۃ العین حیدر کا ادبی سرمایہ بھی دنیا کے کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے، ہندستان اور پاکستان کی حد تک تو میں جانتا ہوں کہ کسی رشتہ دار میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس عظیم کام کو منصوبہ بند طریقے سے کر سکے۔ ہاں دنیاوی دولت پر قبضہ ان کی زندگی میں ہی ان کی خدمت کرنے والوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد وہ تاریخی مکان جس میں مصنفہ نے آخری سانس لی تھی اور جسے انھوں نے اپنے پیسوں سے خریدا تھا، اسے فوراً ہی بیچ ڈالا۔ اس حادثے پر جتنا بھی غم کریں کم ہے۔ انگلستان میں ادیبوں کے محفوظ مکان کا معائنہ کرنے والی خاتون کی اپنی ذاتی وراثت اتنی جلد بے نام ونمود ہو جائے گی، ایسا انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ آج ان کی روح اس واقعہ پر سخت تکلیف محسوس کر رہی ہوگی کہ جس بات کے لیے میں زندگی بھر لڑتی رہی، احتجاج کرتی رہی، آج وہی بات، وہی حادثہ، تاریخ کی وہی المنا کی میرے ہی ساتھ پیش آئی۔ عبرت ناک... عبرت ناک... سردم دکھم دکھم...

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

قرۃ العین حیدر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

''بانو کے مکان کی تاریخی اہمیت کا مجھ کو بے حد احساس تھا۔ گزشتہ ادوار میں اسی مکان کے آس پاس ان زمانوں کے نامور شعراء کے مکانات بھی موجود تھے۔ وہ کیسا پرفسوں زمانہ رہا ہوگا۔ انگلستان، فرانس، جرمنی اور روس کے اہل نظر نے اپنے عہد رفتہ کے مشاہیر کے مکانات کو اسی طرح سجا بنا کے رکھا ہے اور میں یہ رونا ہمیشہ روتی رہتی ہوں کہ مرزا غالب کے مکان میں کوئلے کی دکان کھل گئی۔''

اسی مضمون میں آگے چل کر اس موضوع پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''راجستھان کے دور اندیش چھوٹے بڑے راجاؤں نے اپنے محلات اور حویلیاں ٹورسٹ انڈسٹری میں شامل کر دی ہیں لیکن لکھنؤ کا قدیم تعمیراتی سرمایہ غائب ہوتا جا رہا ہے۔ میں پہلے بھی یہ نوحہ گری کر چکی ہوں کہ علی گڑھ کے وہ پھوس والے بنگلے جو جان کمپنی نے بنوائے تھے اور انگریزی سرکار نے کالج کے لیے سرسید کی نذر کر دیے تھے، ان کے موجودہ وارثوں کے خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ان کو نذرِ آتش کر دیا۔

لندن کے ایک میوزیم میں ایک بہت بڑا کمرہ سترہویں صدی کے ساز و سامان سے اس طرح سجایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مکین ابھی ابھی اٹھ کر باہر گئے ہیں۔ یہ کمرا نشیب میں ہے اور اس پر چھت سے ذرا نیچے چاروں طرف گیلری ہے۔ تماشائی اس گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو بغور دیکھ سکتے ہیں۔

اسی طرح میں نے امریکہ کے ایک عجائب خانے میں گزشتہ کسی صدی کا کمرہ ایسا پایا جس میں ایک متوسط الحال خاندان کا Living Room کے طور پر سجایا گیا تھا جس میں آتش دان کے پاس دادی اماں کی آرام کرسی اور اس کے برابر میز پر ان کی عینک اور سینے پرونے کی ٹوکری بھی موجود تھی۔ انگلستان اور یورپ میں گزشتہ صدیوں کے شاعروں اور ادیبوں کے مکان ان ہی کے ذاتی سامان یا اس کی ہو بہو نقل سے آراستہ

کیے گئے ہیں۔ میں یہ بھی لکھ چکی ہوں کہ روس میں پشکن کے گھوڑے کی
ایال کو جس چوبی کنگھے سے سنوارا جاتا تھا وہ کنگھا بھی محفوظ ہے۔ جس
زمانے میں ہمارے ترقی پسندوں نے ہر پرانی چیز کو منسوب کیا، اس وقت
تک شاید ان میں سے کوئی بندہ روس نہیں گیا تھا۔

چنانچہ عزیز بانو کا مکان بھی لکھنؤ کے چند اور مکانات کی طرح
National Heritage میں شامل کرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کو ضرور یہ
رائے دیتی مگر وہ خود ہی غائب ہو گئیں۔"

قرۃ العین حیدر کا مکان بھی نیشنل ہیریٹج میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ تاریخ کی یہ دردناکی شاید انسان کا مقدر ہے۔ تاریخ کے بہاؤ اور وقت کی جبریت کا قہر جب سونامی کی صورت میں نازل ہوتا ہے تو سب کچھ تاخت و تاراج کر دیتا ہے اور انسان محض ایک بے بس تماشائی کی طرح حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی تو اس عبرت ناک منظر پر چند آنسو نکل بھی آتے ہیں اور کبھی استعجابی شدت سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی اس بے بسی اور دردناکی کی گہرائیوں میں بار بار ڈوب کر حقیقت کا ادراک کرانے والی خاتون کو کیا پتہ تھا کہ صدیوں سے دہرائی جانے والی اس کہانی کا انجام اتنا دردناک ہوگا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

آج قرۃ العین حیدر کی برسی پر چراغاں کرنے والے بھی نہیں رہے۔ عقیدت کے دو پھول چڑھانا تو دور کی بات ہے۔

مونس ہے بعد مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

کیا قبرستان کا یہ سناٹا بھی ادبی سرگوشیوں میں تبدیل ہو کر انھیں خراج عقیدت پیش کر سکے گا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

اردو ادب کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنفہ لحد میں ضرور خوابیدہ ہے لیکن ان کے چاہنے والے انھیں اتنی جلد فراموش کر دیں گے، اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لیکن حقیقت اور سچائی بڑی جابر چیز ہے۔ جب سامنے آتی ہے تو بھرم تار تار کر دیتی ہے۔ آج وہ بھرم تار تار ہو گیا جو داستان طراز تھی۔ وہ خود داستانِ عہد گل ہو گئی۔ تاریخی بصیرت کا رفیع الشان احساس دلانے والی تخلیقی ہستی کا اس طرح ناپید ہونا دوسروں کے لیے زبردست عبرت کا مقام ہے۔ کیا وقت اس حیرت و استعجاب کو کم کر سکے گا؟ ہمیں اس لمحے کا انتظار رہے گا۔

آج قرۃ العین حیدر دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اس تاریخی قبرستان میں جہاں انھوں نے علم و ادب کی عظیم المرتبت ہستیوں، دانشورانِ ملت اور بانیانِ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان پناہ لی ہے، سے باہم مشاورت ضرور کر رہی ہوں گی کہ آخر یہ ستم ظریفی ہماری قوم میں ہی کیوں ہے۔ تاریخی حامل کی عظیم المرتبت ہستیوں کے درمیان رہ کر بھی اس قدر بے بسی کا احساس کیوں ہو رہا ہے۔ یہ قوم اپنے لعل و گہر کی عظمت کو کب پہچانے گی؟ کب انھیں عزت و توقیر ملے گی؟ میں تو یہاں اس لیے آئی تھی کہ ان لوگوں کے درمیان میں کبھی فراموش نہیں کی جاؤں گی۔ میں نے اپنا سارا ادبی سرمایہ اس دانش گاہ کو اس لیے بخش دیا تھا کہ کم از کم ہر برس یہ لوگ میری لحد پر عقیدت کے دو پھول ہی ڈال کر میری عزت افزائی کریں گے۔ لیکن یہ تو میرا میوزیم (آرکائیو) بنا کر بیٹھ گئے۔ میرے نام کا گیٹ بھی وہاں بنایا جہاں علم و ادب کی ہستیوں کا گزر ہی نہ ہو۔ بھلا اسٹیڈیم سے متصل گیٹ سے میرے نام کی کیا نسبت؟ دانش گاہ کا مین گیٹ جہاں غالب غزل سرا ہیں اگر میرے نام کا ہوتا تو شاید کچھ مناسبت بھی معلومات ہوتی کہ میں وہاں سے شعبۂ اردو پر بھی نظر رکھ سکتی اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی، پھر تو میری روح بھی خوش ہوتی اور میری ہستی کا وجود اس طرح ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

تاریخی بصیرت کی حامل ہستیوں کا یہ حشر عبرت ناک ہے۔ غالب کی حویلی کی بازیابی کے لیے صدیوں تک تحریک چلی پھر حکومت نے موقع پرستی کی سیاست سے فائدہ اٹھانے کے لیے واگزاری کی بھی، وہاں تو معاملہ غاصبانہ قبضے کا تھا اس لیے واگزاری ہو گئی۔ یہاں تو مکان

فروخت کر دیا گیا ہے جس کی واگذاری ممکن ہی نہیں۔ تاریخ کی بوالعجبیاں بھی عجیب وغریب ہیں۔ عظمت رفتہ پر تاسف کرنے اور آنسو بہانے والی اور یہ ڈھائی ہزار سالہ ہندستانی تاریخ کے وقوع کو کھنگالنے کے بعد کف افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تو میرا ماضی، میرا عظیم الشان ماضی، میری عظیم الشان روایات کی یاد کر کے اس پر آنسو بہا کر دل کو مطمئن کر لیا۔ یہاں تو ماضی کی عظیم الشان روایات سے حال کا عظیم الشان رشتہ باقی رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن زر پرستی کی ہوس میں، ہندستانی تہذیب وثقافت کی بقاو تحفظ کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کے صلے میں انھیں انعام بھی کیا دیا کسی دوسرے نے نہیں خود ان کے اپنوں نے جو ان کے جذبات اور ان کی عظیم الشان تخلیقی وراثت کی قدر و قیمت کو پہچان نہ سکے جو کل تک ہماری عظمتوں کی پہچان تھے اور جس پر انعام واکرام کی بارش ہو رہی تھی اور آج خود ان کے اپنوں نے ان کی وراثت کی پامالی کر کے ان کی عظمتوں کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو لعنتوں کی بارش ہوگی، مگر کس پر۔ یہ وہ مقام عبرت ہے جس سے ہر کسی کو سبق لینا چاہیے۔

قرۃ العین حیدر پر میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں تو زندگی کے ان کے مشن کے تحت میں بے حد جذباتی ہو جاتا ہوں۔ اور میں قطعاً یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کی عظمت کو خواہ اس کا اپنا ہی کیوں نہ ہو داغ دار کرے۔ دنیا ان کو عزت کے منڈولے میں بٹھانا چاہتی ہے اور اپنے ہیں کہ قدر کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہاں تو بات کلیات سازی کی چل رہی تھی اور موضوع بہک کر کہاں سے کہاں چلا گیا۔ سوال وراثت کی حفاظت کا تھا۔ میں نے اپنے ناتواں کندھوں پر اس بارگراں کو اٹھا تو لیا ہے لیکن کیا وسائل کے بغیر کئی ملکوں میں بکھری ان کی تحریری وراثت کو مکمل طور پر سمیٹنا ممکن بھی ہو سکے گا۔ میرے خیال میں اس کا سیدھا سچا جواب نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہ کوشش کیوں کر رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ زندگی میں کسی پر اتنا اعتماد آپا نے نہیں کیا جتنا مجھ پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلیات کی تدوین جیسے مشکل کام کے لیے خود سے میرا انتخاب کیا اور میں نے ان کی زندگی میں اس اعتماد کو وقار بھی عطا کیا۔ اور کلیات کی تین جلدیں سجا سنوار کے انھیں پیش بھی کر دیں۔ اب سوال آگے کا ہے۔ مجھے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ مختلف صورتوں میں اپنی تحریروں میں جلوہ گر ہو کر مجھ سے

سوال کرتی ہیں کہ باقی بچا کام کب ہوگا؟ بس یہی بات مجھے کچوکے لگاتی ہے۔ میں نے آپا سے وعدہ کرلیا ہے کہ مجھ سے جہاں تک بن پڑے گا میں اس کام کو ضرور انجام دوں گا۔

ان کے انتقال کو آٹھ سال بیت گئے۔ اس بیچ میں تنکا تنکا جمع کرتا رہا۔ اب جا کر اتنا کچھ جمع ہو سکا کہ آپا کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاید میری یہ کاوش علم وادب کے قدر دانوں میں ان کا اعتماد مضبوط کر سکے گی۔ یہ کوشش فرد واحد کی ضرور ہے لیکن یہ کام انسان کو ایک انجمن، ایک ادارہ بنا دیتا ہے۔ خدا کرے میری یہ سعی جمیلہ انھیں شہرت دوام عطا کر سکے اور علم وادب کے سرمایۂ افتخار میں بیش قیمت اضافہ ثابت ہو۔

کلیات کی پہلی چار جلدیں افسانے، ناولٹ اور ایک نیا افسانوی مجموعہ قندیل چین پر محیط ہیں۔ اب کلیات کی پانچویں جلد سے تقسیم کچھ اس طرح ہے۔

Vol. - 5 : رپورتاژ	Vol. - 9 : خاکے
Vol. - 6 : رپورتاژ	Vol. - 10 : انٹرویوز
Vol. - 7 : مضامین	Vol. - 11 : انٹرویوز
Vol. - 8 : مضامین	

اس کے علاوہ ان کے تراجم، بچوں کی کہانیاں، صحافتی مضامین، فلم ریویو، کتابوں پر تبصرے، خطوط اور دیگر دوسری چیزیں۔ یہ سب قصہ اگلے پڑاؤ کا ہے۔ سلسلہ تلاش وجستجو جاری ہے۔ تحقیق اپنی منزل طے کر رہی ہے۔ فی الوقت درج بالا سات جلدیں پیش خدمت ہیں۔

جلد 7 اور 8 مضامین پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین میں اول مضمون سے لے کر اب تک کے تقریباً تمام مضامین شامل ہیں جو میری تحقیق میں دستیاب ہو سکے ہیں۔ اور جس کو پہلی بار اس ترتیب کے ساتھ یکجا کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل بھی اس سرمایے کو یکجا کرنے کی کوشش دو بار کی گئی لیکن مکمل سرمایے کی یکجائی ممکن نہیں ہو سکی۔ وجہ فرد واحد کے محدود وسائل، دوسرے تحقیقی مہم جوئی کی کمی۔ کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ افسانوی نثر کی ملکہ کے غیر افسانوی نثر کا دفتر اس قدر پھیلا ہوا اور وسیع ہوگا اور اس میں تراجم کے علاوہ شخصی خاکے، تعارفی تحریریں، مذاکرے، مباحثے، تبصرے،

تقریریں، تعزیتی مضامین، تنقیدی مضامین اور دیگر بہت سی تحریریں جو پہلے سے موجود کسی زمرے میں آسانی سے نہیں رکھی جاسکتیں۔ اور نہ ہی ان تحریروں کو آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ فکشن کی ملکہ کا یہ سرمایہ اپنی جگہ اتنا ہی اہم ہے۔ یہ ادبی وراثت اپنی ادبی اہمیت رکھتی ہے اور قرۃ العین حیدر کے ادبی سفر کی داستان میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مصنفہ کا تخلیقی وژن اور ان کے فکری میلانات کے نشیب و فراز کی منزلوں کا اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے فنی رویے کو بھی سمجھنے میں مدد ملے گی۔

یہ تمام مضامین مختلف حالات و کیفیات میں وقتی مطالبے و تقاضے کے تحت لکھے گئے ہیں جو مختلف النوع موضوعات پر ہیں۔ غیر افسانوی نثر کا یہ سرمایہ بھی کافی وقیع ہے۔ جو اس تخلیقی فن کارہ کے وسعت ذہنی کا پتہ دیتے ہیں۔ اپنے پورے ادبی سفر کے دوران ان کی نظر کن کن موضوعات پر رہی، فکشن کے علاوہ ان کی دلچسپی کے میدان اور کیا کیا تھے۔ تخلیقی بصیرت کے افق کو اونچائیوں سے ہم کنار کرنے والی ادیبہ نے اپنے تنقیدی شعور کا احساس اپنے قاری کو کس طرح کرایا۔ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے۔ باضابطہ ناقد نہیں ہونے کا بار بار اعلان کرنے والی مصنفہ نے نقادوں کی زبان گنگ کر دی۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا، حق ادا کر دیا۔ تخلیقی عمل میں کارفرما تنقیدی شعور نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک فن کار ایک بہتر ناقد بھی ہوتا ہے۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون 'اسلام دوسروں کی نظر میں' ہے۔ یہ مضمون 1942 میں لکھا گیا۔ اس وقت قرۃ العین حیدر تقریباً پندرہ برس کی تھیں۔ اور یہ مضمون بنات میں شائع ہوا تھا۔ عنوان مضمون ہی 'در فکر سے گوندھ لڑیاں کئی' کے مصداق ہے۔ یہ عمر اور یہ فکر گہر آب دار کیا کہنا۔ بہت سے لوگ معترض بھی ہوں گے کہ یہ تجزیاتی عنوان اور یہ بالغ فکر اور یہ عمر۔ تعجب خیز نہیں۔ آپ شاید بھول گئے کہ 'برس تیرہ یا کہ ہے چودہ کا سن' Syndrome تو ہمارے یہاں ہمیشہ سے رائج ہے۔ پھر یہ قصہ تو خاندانی روایات سے جڑا ہوا ہے۔ خود ان کی والدہ نذر سجاد حیدر نے اختر النسا 'ناول' بہ عمر چودہ سال لکھا تھا۔ ان کی دوست حجاب امتیاز علی نے اپنا افسانہ 'میری ناتمام محبت' گیارہ برس کی عمر میں تصنیف کیا تھا۔ 'معشوق چہاردہ سالہ' ہماری ادبی روایت کی ایک ادا ہے۔ اور

پھر یہ کہ رحم اللہ کے ایسے تیز وطرار اور Precocious بچے بھی عجوبہ روزگار نہیں۔ بالخصوص ایسے طبقے میں جہاں ان کی تربیت ہی ایسے ماحول میں ہورہی ہو جہاں علم وادب کے فیضان ہر چہار سو جاری و ساری ہوں۔ تخلیق کے سوتے روایات کے بطن سے جب پھوٹیں گے تو پھر بصیرت و بصارت سے مملو تخلیقی وژن کا بھرپور احساس ہونا فطری ہے۔

قرۃ العین حیدر کے یہ تمام مضامین تنقیدی شعور سے مالا مال نظر آتے ہیں۔ سماجی تجزیوں اور ادبی تبصروں میں جو گہرائی ہے وہ ان کے مختلف علوم کے وسیع تر مطالعے کے غماز ہیں۔ کوئی بھی مضمون کسی بندھے ٹکے نظریے یا ضابطے یا فکری رویے سے اثر پذیری کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک نئے تناظر میں دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش کا پیش خیمہ لگتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر یا اپروچ میں تنگ نظری کے بجائے تنوع ہے۔ یہ مضامین روا روی میں نہیں پڑھے جاسکتے بلکہ سنجیدہ مطالعہ کے متقاضی ہیں۔

قرۃ العین حیدر لاکھ بریت کا اعلان کریں کہ صاحبان اردو تنقید میرا میدان نہیں۔ لیکن وہ ان تمام مضامین میں معصومانہ طور پر تنقیدی منصب کو ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام مضامین ایک طویل مدت کے دوران لکھے گئے ہیں لہٰذا ذہنی ارتقا اور تبدیلی فکر یا فن کار کے بدلتے زاویۂ نگاہ کے مختلف موڑ اور پڑاؤ کے نشیب وفراز کے فطری عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے اردو تنقید کے اسٹیریو ٹائپ کو چیلنج کیا ہے۔ جس پر روایتی، مکتبی نقاد لاکھ ناک بھوں چڑھائیں لیکن ان مضامین کو جو منفرد تنقیدی بصیرت کے حامل ہیں، ادبی تنقید کے خانہ سے خارج کر پائیں گے؟ میرا خیال ہے شاید کبھی نہیں بلکہ تنقیدی سرمایے کا بیش بہا اثاثہ ضرور تصور کیا جائے گا۔

غیر افسانوی نثر کا یہ خزانہ اپنی مقدار و کیت و حجم کے لحاظ سے بہت زیادہ بھلے ہی نہ معلوم ہو لیکن اپنے اسلوب، انداز بیان، ندرت فکر، وسعت خیال اور موضوع سے اچھوتے برتاؤ کی وجہ سے تنقیدی توریت کا درجہ رکھتے ہیں۔

قرۃ العین کی ان بکھری ہوئی تحریروں کو مجتمع کرنے میں بہت سے افراد اور اداروں نے میری معاونت کی ہے جن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر

نجیب اختر، برادر عزیز کفیل اختر، ڈاکٹر ارشد رضا بھاگلپور، عزیزی جاوید اختر، بزرگ محترم مہر الٰہی ندیم صاحب، برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر تحسین فراقی (لاہور)، ڈاکٹر آصف فرخی (کراچی)، صبا اکرام (کراچی)، علی حیدر ملک (کراچی)، پروفیسر مرزا حامد بیگ (لاہور)، پروفیسر غلام حسین ساجد (لاہور)، پروفیسر علی احمد فاطمی، چودھری ابن النصیر (ایڈیٹر 'پہچان')، شمع افروز زیدی (ایڈیٹر 'بیسویں صدی')، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں (رام پور) کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ تحقیق کے مشکل مرحلے میں ان تمام لوگوں کا پر خلوص تعاون مجھے ملتا رہا ہے تبھی تنکا تنکا جمع ہوسکا، اور جو رہ گیا ہے وہ بھی انشاءاللہ حاصل ہو جائے گا۔

اداروں میں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ، انصاری لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرۃ العین حیدر آرکائیو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افراد کا بھی شکریہ لازم ہے جن کی پر خلوص معاونت نے تحقیق کے مرحلے کو آسان بنا دیا فرداً فرداً سب کا نام گنوانا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے کرم خاص کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

قومی اردو کونسل کا شکریہ بھی ضروری ہے اس لیے کہ ان کے تعاون کے بغیر کلیات کی طباعت کا خواب ادھورا رہتا۔ لہٰذا میں قومی کونسل کے تمام افراد کا جنھوں نے کلیات کی طباعت و اشاعت کے کسی بھی مرحلے میں مدد کی میں فرداً فرداً سبھوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب آخری شکریہ نوجوان دوست تنویر احمد کا جن کی محنت شاقہ سے کلیات کمپوزنگ کے دشوار گزار مرحلے سے گزر کر مکمل ہوئی اور طباعت تک پہنچی۔

بیوی اور بچوں کا شکریہ کیا ادا کروں، ان کی حق تلفی کا مجھے شدید احساس ہے لیکن ملول خاطر نہیں ہوتے۔

جمیل اختر

موبائل: 9818318512

ای میل: jameelakhtar786@yahoo.com

جنوری 2015

نئی دہلی

ترکش

جاوید اختر ہندستانی Popculture کے ایک معمار ہیں اور موجودہ Yuppy culture کے ایک درخشندہ نمائندے۔ ان کی فلموں کا متنازعہ فیہ دائرۂ اثر اتنا وسیع ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک سنجیدہ ادبی کتاب کا ایک ہزار جلد کا ایڈیشن بحرالکاہل میں تیرتے مٹر کے دانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق چاول پر 'قل ھو اللہ' بھی لکھ رہے ہیں۔ لہٰذا اس مضمون میں ان کی اس آبائی کاری گری پر تھوڑی سی روشنی ڈالوں گی۔

جاوید کا نام لوگوں کے ذہن میں ایک جلوس یا کریڈٹ ٹائٹل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مجاز، صفیہ، جاں نثار اختر، شبانہ، کیفی، زیادہ پڑھے لکھے حضرات مضطر خیرآبادی اور مولانا فضل حق خیرآبادی کو بھی یاد کر لیتے ہیں کہ موصوف کے اجداد تھے۔

جاننا چاہیے کہ شمالی ہند کی تہذیب کے یہ مراکز روہیل کھنڈ، اودھ اور پورب دیس سے لے کر بہار تک پھیلے ہوئے تھے اور اپنے مدارس، کتب خانوں اور علم پرور خانوادوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ 1947 کے بعد اس عظیم الشان تمدن کی خاموش بے آواز تاراجی بغداد اور اندلس اور دِلّی اور لکھنؤ کی تباہیوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھی کہ اس کے بعد برباد ہونے کے لیے اب کچھ

باقی نہیں رہا۔ وہاں جو کھنڈر اب نظر آتے ہیں، یہ خوب صورت بارونق مکانات تھے۔ متمدن کنبے ان میں بستے تھے۔ یہ مقامات مسلم اشرافیہ کے گڑھ تھے۔ آج سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل چند نوجوان انھیں قصبات سے نعرہ زن نکلے۔ سجاد ظہیر، سبط حسن، مجاز، علی جواد زیدی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر وغیرہ ان سے ذرا سینئر۔ قصبہ ملیح آباد کے جوش شاعر انقلاب کہلائے۔ جس جماعت سے ان نوجوانوں نے ناتا جوڑا اس نے غیر دانش مندانہ نظریہ سازی کی، مذہب پر حملے صحیح مارکسزم رہی ہو لیکن غلط سیاست تھی۔ انھوں نے مذہب پرست عوام کو اپنے خلاف بھڑکا دیا اور آزادی کے فوراً بعد جن سنگھ اور جماعت اسلامی کے لیے گل پوش راستہ ہموار کیا۔ شاباش۔ ایک وقت تھا کہ یہی عوام پارٹی کی قیادت کے منتظر تھے۔ آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر۔ اب انھیں ڈھونڈ... یہ جنگجو کامریڈ شاعر تھے، مجاز نے آہنگ کا انتساب اس طرح کیا تھا:

فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل و جگر ہیں۔

سردار اور مخدوم کے نام جو میرے دست و بازو ہیں۔

آج کا انفراد بت پرست تنہائی پسند شاعر ایسا انتساب نہیں کرے گا۔

یہ زیادہ تر Minor Key کے شاعر تھے۔ انھوں نے چند تابندہ نظمیں اردو کو دیں۔ یعنی...

لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب۔

اُردو کے نوعمر طالب علم کے لیے وہ دور ایک Legend بن چکا ہے لیکن مجھے یاد ہے۔ مثلاً ایک گھپ اندھیری رات ایک صاحب لمبے بالوں والی ٹوپی اوڑھے (جیسی آج کل وی پی سنگھ اوڑھتے ہیں) انگلیوں میں جلتا سگریٹ، مبزے پر چلے آرہے ہیں۔ والدہ کو اپنی کتاب 'آہنگ' پیش کرتے ہیں یا گرمیوں کی ایک شام سفید براق، کپڑے پہنے جوش صاحب گھوڑا گاڑی سے اتر کے اندر آتے ہیں یا ایک چاندنی رات والدہ مجاز کو اپنی اوک لینڈ میں بٹھال کر دلکشا ایک دعوت میں لے جاتی ہیں جہاں وہ 'اندھیری رات کا مسافر' پڑھتے ہیں۔ ایک مور ٹہلتا ہوا لان پر آجاتا ہے۔ چاند مور اور شاعر۔ ایک ہائیکو۔

یا صفیہ آپا...

. دارالسراج، 01، لال بہاری لال روڈ سے چہل قدمی کرتی 12، فیض آباد روڈ والدہ سے ملنے آتی ہیں۔ دبلی پتلی۔ سفید ساری پہنے۔ ہنستی مسکراتی۔

ان کی شادی کے بعد سنا گیا کہ مجاز نے بہنوئی کو ایک عدد وہسکی کی بوتل تحفے میں دی۔ مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ اُردو شاعروں کی بلانوشی کا آج تک نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ نہیں کیا گیا۔

ملک آزاد ہوا۔

بھارت سرکار نے ہندی روسی بھائی بھائی کا نعرہ بلند کیا اور اپنے کیمونسٹوں کو جیلوں میں ڈالا۔ ترقی پسند شعرا نے پنڈت نہرو کے لیے کہا، مارے ساتھی، جانے نہ پائے۔ جہاں گیا ہے چیانگ کائی، وہیں جائے گا نہرو بھائی۔

اردو پر پیغمبری وقت پڑا۔ یوپی کے زمین داری ابولیشن میں ایک ہار یکی یہ تھی کہ اُردو کلچر بھی اس کے ساتھ اُڑ گئی۔ لیکن پنجاب سے جو ہندو سکھ شرنارتھی فلم ساز آئے انھوں نے محض اُردو پڑھی تھی۔ علاوہ ازیں پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' سے لے کر 1947 تک فلموں کی زبان اردو ہی تھی۔ مکالموں کی برجستگی اور روانی اور تہذیبی نفاست اور فلمی نغموں کی دل نشینی جو نیو تھیٹرز کے آرزو لکھنوی کی دین تھی، اس کے بدولت آزادی کے بعد بھی گو اردو سرکاری طور پر ختم کردی گئی فلموں میں اس سخت جان خانہ بدوش زبان کا بول بالا رہا لیکن وہ ہندی کہلائی (یعنی ایک پوری زبان کو ہائی جیک کر کے اس کا نام بدل دیا گیا)۔ چنانچہ فلم انڈسٹری اردو اہل قلم کے لیے ذریعہ معاش بنی۔ ساحر بطور گیت کار بہت کامیاب رہے۔ کرشن چند، بیدی، مجروح، سردار جعفری، مہندر ناتھ، راجہ مہدی علی خاں، شکیل بدایونی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، شاہد لطیف، اختر الایمان سبھی بمبئی کی فلمی دنیا میں آباد ہو گئے۔ جاں نثار اختر کے نام بھوپال میں وارنٹ نکلا۔ انڈر گراؤنڈ تھے، بمبئی آئے۔ بمبئی میں وہ فلم انڈسٹری کے Juggernaut جلوس میں شامل ہو گئے۔

صفیہ آپا نے بھوپال کے حمیدیہ کالج میں ملازمت کی اور نہایت بہادری سے اپنے دونوں بچوں کو پالا۔ شدید ذہنی اور جذباتی اور معاشی تکالیف کو بڑے حوصلے سے جھیلا اور اپنے خطوں کے

روپ میں اپنے رنج والم اور عالی ہمتی کی دستاویز چھوڑ گئیں۔

'زیرِ لب' صفیہ اختر کے مکاتیب کے مجموعے کا نام ہے۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں بہت دھوم مچی۔ یہ تعریف، توصیف بھی وقت کی عجب ستم ظریفی تھی۔ یہ خطوط بعض جگہ ایسے لرزہ خیز ہیں گویا موت کی کال کوٹھری سے لکھے گئے ہوں۔ لیکن ان کو پڑھ کر جاوید اختر کے اولین ذہنی تربیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ 1960 سے شروع ہوتے ہیں جب جاوید کی عمر پانچ سال کی تھی۔

صفیہ اپنے شوہر کو ساتھی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ وہ دونوں گویا دو سپاہی جو ایک خوش آئند مستقبل کے لیے لڑ رہے ہیں جو سرخ سویرے کا مستقبل ہے۔

یہ بہت ہی اندوہ ناک تحریریں ہیں۔

نئی انقلابی عورت ہونے کے باوجود صفیہ اختر ایک بے انتہا پتی ورتا، روایتی ہندستانی بیوی، آدرش مہیلا، چرنوں کی داسی، خدائے مجازی کی کنیز معلوم ہوتی ہیں جو شوہر کی ایک نظر کرم اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہاں اور محتاج ہے۔ وہ علامہ راشد الخیری کی کسی مظلوم ہیروئن کی طرح بار بار اپنے بچوں کا واسطہ دیتی ہیں۔ جادو بہت یاد کر رہا ہے۔ سلمان تمھیں بلا رہا ہے۔ کب آؤ گے ساتھی۔

لیکن کامریڈ پتی دیونا آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں۔

آزادی کے فوراً بعد فلمی صنعت جن اردو ادیبوں کو راس آئی ان میں عصمت آپا بھی شامل تھیں۔ چنانچہ صفیہ اختر اپنے ایک خط میں پوچھتی ہیں "عصمت اپنے نئے فلیٹ میں منتقل ہو گئی ہوں گی۔ ان کی ریاست کا کیا حال ہے۔ جادو کی انقلاب پسندی اپنے عروج پر ہے۔ بمبئی گورنمنٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نوراللہ صاحب سے انھوں نے باقاعدہ ایشیا، روس اور اسٹالن کی خوب خوب باتیں کر ڈالیں۔ نوراللہ مجھ سے کہنے لگے کہ ایسے انقلابی بچوں کے ساتھ تو آپ کو بمبئی گورنمنٹ میں ملازمت ملنے کا کوئی امکان نہیں۔"

اس خط پر اٹھارہ نومبر 1950 کی تاریخ پڑی ہے یعنی اس وقت جاوید کی عمر تقریباً چھ سال کی رہی ہوگی۔ ایسے بچوں کو Enfant Terrible کہا جاتا ہے۔ گھر کے انقلابی اور سیاسی ماحول

سے متاثر ہونا بھی بچوں کے لیے ناگزیر تھا۔ ہند اور پاکستان میں اشتمالیوں کے لیے بڑی ہی آزمائش کا دور تھا۔ گرفتاریاں جاری تھیں، چھاپے پڑتے تھے اردو ادب روز بروز زیادہ کٹر پنتھی ہوتا جارہا تھا (ایک خاتون اردو ادیب ایک جلسے میں کہنے لگیں آج ہمارے قلم سرخ ہونے چاہئیں ہمارے افسانے سرخ ہونے چاہئیں ہمارے ناول سرخ ہونے چاہئیں۔ ہماری نظمیں سرخ ہونی چاہئیں ہماری غزلیں سرخ ہونی چاہئیں۔ مجاز سامعین میں موجود تھے، کھڑے ہو کر فرمایا محترمہ کم از کم گلابی کی اجازت دے دیجیے۔ سردار، مجروح، کیفی شاید جیل جا چکے تھے یا جانے والے تھے حتیٰ کہ بھوپال میں اختر جمال کو ان کے چھ ماہ کے بچے کے ساتھ قید کر لیا گیا تھا۔

جاوید جب باپ کے ایک شعر پر تنقید کرتا ہے تو ماں فخر سے جاں نثار اختر کو لکھتی ہیں "وہ تم جیسے رومانی انقلاب پسندوں سے آگے ہوگا۔ وہ فرار کا قائل نہیں ہو سکتا، وہ ڈٹ کر لڑے گا اور تم سے آگے بڑھ جائے گا۔" (15 اپریل 1951 کا خط)

اسکول میں بچوں نے قومی جھنڈے تیار کیے تو جاوید نے درانتی اور ہتھوڑے والا سرخ پرچم بنایا، پھر وہ شوہر کو مزید اطلاع دیتی ہیں "جادو پاس ہی لیٹا ہوا مجھ سے افسانے گڑھ رہا ہے، بعض وقت ایسی ادبی گفتگو کرتا ہے کہ حیران ہو جاتی ہوں۔ ابھی ایک دو دن کی بات ہے، بائی پڑھنے آئی تھی اسے میں جوش کے پانچ جرعے پڑھا رہی تھی۔ آخری حصے میں زمیں مست فلک مست کی تکرار ہے۔ جادو سن کر بولا امی یہ تو ابی کے 'جاگا قلم جاگی کتاب' سے ملتا ہوا ہے۔ یہ عمر اور یہ ناقدانہ نگاہیں! دیکھو یہ جوہر یونہی ضائع ہوتا ہے یا اپنی آب و تاب سے چمکتا ہے۔"

افسوس کہ وہ اپنے لڑکوں کی غیر معمولی کامرانی دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ پائیں۔

ایسے ہونہار بروا کو جو عمر چھ سال اسٹالن زندہ باد کہہ رہا تھا، بڑے ہو کر کمیونسٹ پارٹی کا ہول ٹائمر بننا چاہیے تھا مگر ماں کے بے وقت انتقال کے بعد آٹھ برس کی عمر سے جاوید نے یتیمی اور بے گھری کی تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ چارلس ڈکنز کے کسی ننھے مصیبت زدہ کردار کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں وہ ماں کی توقعات پوری کرنے کے لیے ایک شعلہ جوالا پارٹی ورکر بن سکتا تھا۔ مگر طرزِ تپاک اہلِ دنیا دیکھ کر اس کا دل اتنا جلا کہ اس نے لڑکپن میں ہی طے کر لیا کہ وہ خود دولت

مند بنے گا۔ بچپن لکھنؤ (ننہال) اور علی گڑھ (خالہ حمیدہ سالم کے گھر) میں گزرا۔ البتہ مباحثوں اور بیت بازی میں برق تھے۔ تقریروں کے انعامی مقابلے جیتے، جب بمبئی پہنچے تو چھ دن بعد آدھی رات کو برستی بارش میں والد کے مکان سے نکلنا پڑا (والد عقد ثانی کر چکے تھے) فٹ پاتھ پر رہے۔ فاقے کیے، گزر اوقات کے لیے کارڈ شارپنگ کو بھی اپنا پیشہ بنایا۔ یہ ان کی نوعمری کے مزید ڈرامائی واقعات ہیں۔ محض اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کے بل بوتے پر دنیا سے لڑے۔ حس ظرافت اور فن لطیفہ سازی و مجلس آرائی ماموں مجاز سے ملا تھا۔ 'زیرلب' کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی کٹھن زمانے میں صفیہ اختر کے سنس آف ہیومر نے بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

جاوید اختر خود ساختہ کامیاب آدمی کی کلاسک مثال ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی کم ذہین نہیں ہیں۔ وہ بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام بعنوان 'کوبکو' شایع ہو چکا ہے۔ بچپن میں دونوں بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ 'لڑائی لڑائی' کھیلتے۔ ایک دوست 'امریکی شیطان' بنتا تھا۔ برادر خورد سلمان بحیثیت سائیکواینالسٹ اسی شیطانی ملک امریکہ کے ایک متمول شہری ہیں۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

غالباً موسم سرما 1964 میں مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں روشن دان کے راستے خالدہ ادیب خانم پر گل باری کی جارہی تھی (جو علی گڑھ کی ایک دل پذیر روایت ہے) اس کے بعد یلدرم نے ایک تعارفی تقریر کی اور ایک نوجوان شاعر اسرار الحق مجاز نے ایک نظم نذر خالدہ پڑھی۔ والد مرحوم نے جلسے کے بعد احباب سے کہا یہ لڑکا آگے چل کر بڑی شہرت حاصل کرے گا۔ 1967 میں بمبئی کے ایک سنیما ہال میں جاں نثار اختر کی اپنی فلم 'بہو بیگم' کے پریمیر پر واجدہ تبسم نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا "یہ اختر بھائی کا بیٹا جادو ہے۔" تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں پیش گوئی کروں کہ یہ لڑکا آگے چل کر بہت شہرت حاصل کرے گا۔ مجھے تو وہ یتیم سا معلوم ہوا۔ اس نے کلائی میں پیوں والا کڑا پہن رکھا تھا اور کچھ آشفتہ سر سا نظر آتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کڑا کڑے وقت میں کام آنے والے ایک سکھ دوست کی نشانی تھی۔

چند سال بعد بطور اسکرپٹ رائٹر جاوید نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی، اور جب سنجیدہ

شاعری مجھے سنائی تو مجھے تعجب نہیں ہوا کیونکہ مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھلاتا ہے۔

جاوید ایک خوش گو خوش فکر قادر الکلام Post Modern شاعر ہیں۔

تازہ کاری، گہرائی اور تنوع، دیانت، جذبات اور زندگی نئے مفاہیم کی تلاش ان کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔

نازک خیالی اور فصیح البیانی ان کو ورثے میں ملی ہے۔ وہ بعض اوقات روایتی شعر کہہ لیں مگر بری شاعری نہیں کر سکتے۔

'ترکش' غم جاناں اور غم دوراں کے تیروں سے پر ہے۔ بچپن کی شیریں یا تلخ یادیں ہر ادیب یا شاعر کے لیے دیرپا ثابت ہوئی ہیں۔ جاوید اختر کی چند ایسی نظمیں جوان کے زخم خوردہ جذبات اور احساس کی آئینہ دار ہیں شفاف آتم کتھا کے طور پر پڑھی جا سکتی ہیں۔

جب وہ کم عمر ہی تھا
اس نے یہ جان لیا تھا کہ اگر جینا ہے
بڑی چالاکی سے جینا ہوگا
آنکھ کی آخری حد تک ہے بساطِ ہستی
اور وہ معمولی سا اِک مہرہ ہے
ایک اِک خانہ بہت سوچ کے چلنا ہوگا

(ایک مہرے کا سفر)

بمبئی پہنچ کر اور باپ کے گھر سے نکلنے کے بعد تیسرے دن کے فاقے کی دل خراش و سہل ممتنع میں یوں ڈھلتی ہے:

میرے گھر میں چولہا تھا
روز کھانا پکتا تھا

......

ماں عجیب تھی میری

روز اپنے ہاتھوں سے
مجھ کو وہ کھلاتی تھی
کون سرد ہاتھوں سے
چھو رہا ہے چہرے کو
اِک نوالا ہاتھی کا
اِک نوالا گھوڑے کا
اِک نوالا بھالو کا

(بھوک)

یہ محض مضمون آفرینی نہیں، متواتر فاقہ کشی کے بعد لمسی اور سمعی التباس کا تجربہ عین ممکن ہے۔

صفیہ اختر کے خطوط کے سیاق و سباق میں دیکھیے تو اس نظم کا کرب ناک تاثر دو چند ہو جاتا ہے۔ مائیں لاڈلے ننھے بچوں کو اسی طرح بہلا پھسلا کر کھلاتی ہیں۔

اک نوالا ہاتھی کا
اک نوالا گھوڑے کا
اک نوالا بھالو کا

مہرہ اپنی منزل مقصود پر پہنچتا ہے:

آسودگی سے دل کے سبھی داغ دھل گئے
لیکن وہ کیسے جائے جو شیشے میں بال ہے

غالباً یہ ماں کا غم ہے۔

جاوید نے اپنی فلموں میں ایک ستم رسیدہ ماں کا کردار بلاوجہ تخلیق نہیں کیا جس کی طرف سے ظالم سماج کو للکارنے والا ایک دیو قامت سرکش برہم نوجوان (امیتابھ بچن) اسکرین پر نمودار ہوا۔ اس بنیادی پلاٹ کے اجزائے ترکیبی میں Populist نسخے کی کیمیا پنہاں تھی۔ عوام نے اپنی

تمام محرومیوں اور دُکھوں کا بدلہ لینے والے اس کالی اوتار کو دل و جان سے قبول کیا اور دُھن برسایا:

غم بکتے ہیں
بازاروں میں غم کافی مہنگے بکتے ہیں
لہجے کی دکان اگر چل جائے تو
جذبے کے گاہک
چھوٹے بڑے ہر غم کے کھلونے
منہ مانگی قیمت پہ خریدیں...(غم بکتے ہیں)
اپنی محبوبہ میں اپنی ماں دیکھیں
بن ماں کے لڑکوں کی فطرت ہوتی ہے

کہا جاتا ہے تنہائی فن کار کا مقدر ہے۔ میرا خیال ہے ایک پرفورمنگ آرٹسٹ (اداکار، رقاص، موسیقار) اتنا تنہا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے فن کے مظاہرے میں دوسروں کا اشتراک بھی شامل رہتا ہے۔

ادیب، شاعر، مصور بے حد اکیلے سمجھے جاتے ہیں۔ اس تنہائی کی ایک Mystique بن گئی ہے اور اس کی مختلف پرچھائیاں ہیں۔ دو سال قبل اتوار کی ایک روشن خوش گوار صبح ٹرین مضافات کے پھولوں سے بھرے راستے سے گزرتی لندن جا رہی تھی جب حسب معمول ایک کوچہ گرد گویا کمپارٹمنٹ میں آیا اور گٹار پر گانے لگا Bye bye happiness... hello loneliness

حسب معمول کسی نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔

لیکن مجھے وہ سارے مطمئن خوش پوش، خاموش مسافر چند لمحوں کے لیے اس نغمے میں شریک سے معلوم ہوئے۔ جیسے تنہائی تنہائی سے بات کرتی ہو۔

گیت ختم کر کے وہ اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ کسی نے اس کی ہیٹ میں سکے بھی نہیں ڈالے۔

تنہائی جاوید کا بھی ایک پسندیدہ مضمون ہے:

اس کے ایک ہاتھ میں ہے جیت اس کی
دوسرے ہاتھ میں تنہائی ہے

حصولِ مقاصد کے بعد اکیلے پن کا احساس ایک عالمگیر تجربہ ہے، بالخصوص مغرب میں یہ تنہائی بعض اوقات ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔

دنیائے دوں سے حسب دل خواہ دام وصول کرنے کے بعد راوی کو چین لکھنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا ہوتا نہیں، فتح مند انفرادیت پسندی پھر بھی غیر مطمئن رہتی ہے۔ ایک پر آسائش زندگی گزارتے ہوئے شاعر اپنے لڑکپن کی محرومیوں اور کلفتوں کو بھی محبت سے یاد کرتا ہے۔

اس معاملے میں جاوید اختر زہرہ نگاہ، اختر الایمان اور افتخار عارف کے ہم نوا ہیں۔

ذہن و دل آج بھوکے مرتے ہیں
اُن دِنوں ہم نے فاقے جھیلے ہیں

وہ کمرہ یاد آتا ہے جو برے وقت میں ان کی جائے پناہ تھا، کھردرے شفیق باپ کی طرح مشکل سے کھلنے والا دروازہ، گستاخ منھ پھٹ آئینہ، بے ہنگم بوڑھی اَنا سی الماری، ذہانت سے بھری مسکراہٹ جیسا دریچہ، اس پر جھکی بیل کی سبز سرگوشی، سنجیدہ اُستانیوں جیسی کتابیں، وہ کمرہ پیار سے ماں کی طرح ڈانٹتا تھا۔ یہ کیا عادت ہے۔ جلتی دوپہر میں مارے مارے گھومتے ہو تم۔

میں اب جس گھر میں رہتا ہوں
بہت ہی خوب صورت ہے
مگر اکثر یہاں خاموش بیٹھا یاد کرتا ہوں
وہ کمرہ بات کرتا تھا (وہ کمرہ یاد آتا ہے)

ایک یہ گھر جس گھر میں میرا ساز و ساماں رہتا ہے
ایک وہ گھر جس میں میری بوڑھی نانی رہتی تھیں

یہ شعر پڑھ کر مجھے لکھنؤ کے دارالسراج کا سادہ گھریلو ماحول یاد آ گیا۔ بظاہر یہ جاوید اختر

کی بے ساختہ آپ بیتی ہے مگر بوڑھی نانی ایک علامت بھی ہیں۔ قدیم اقدار کی محافظ، بے غرض، بے لوث، محبت کی پتلی، صابر و شاکر، بھولی۔

گھر سے چلا تو دل کے سوا پاس کچھ نہ تھا
کیا مجھ سے کھو گیا ہے مجھے کیا ملال ہے

اس شعر میں مجھے ایک قلندرانہ کیفیت اور خیر آباد کی خانقہی موسیقی کی گونج سنائی دی، گو خود شاعر کو اس گونج سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند، عملی، شہری آدمی ہیں۔ ان کا کوئی ذہنی یا جذباتی رابطہ اپنے والدین کے اس نیم دیہی نیم خانقہی فیوڈل معاشرے سے بھی نہیں ہے۔ ان کے ماں باپ خود اس معاشرے کو مسترد کر چکے تھے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ جاوید نے غیر شعوری طور پر اُردو کلچر کے ذریعے اس خانقہی تہذیب کی اہم ترین خصوصیات یعنی سیکولر اور انسان دوست اقدار کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ ان کا ویلیو سسٹم صحیح ہے، اور وہ بنیادی طور سے ترقی پسند ہیں۔ وہ عورت کی بھی، بہت عزت کرتے ہیں اور اس کی ہمسری اور برابری کے قائل ہیں۔ اپنی بیٹی زویا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں...

یہ ان لوگوں کا رَستہ ہے
جو خود اپنے تک جاتے ہیں
اپنے آپ کو جو پاتے ہیں
تم اس رَستے پر ہی چلنا
مجھے پتہ ہے
یہ رَستہ آسان نہیں ہے
لیکن مجھ کو یہ غم بھی ہے
تم کو اب تک
کیوں اپنی پہچان نہیں ہے

(دوراہا)

بعض اوقات آج اور کل کے ادب میں حیرت انگیز مماثلت ملتی ہے۔

جو سزا چاہے عدالت دے دے
فیصلہ سننے کو تیار ہوں میں
ہاں گنہگار ہوں میں

(جرم اور سزا)

ان اشعار میں مجاز کا لہجہ جھلکتا ہے۔

جاوید کے شاہکار 'میں اور میری آوارگی' کا جوشِ بیاں اور صوت و آہنگ کی طغیانی مضطر خیر آبادی کے اس شعر کی یاد دلاتی ہے جو متعدد صفحات پر محیط ہے، تو یہ اُردو کی جادو بیانی ہے جو پلٹ پلٹ کے دکھاتی ہے ایک ہی تصویر...

جاوید اپنے عہد کے شعری مزاج کے نمائندے ہیں اور ہر اچھا شاعر دوسرے اچھے شاعر کی یاد دلا سکتا ہے۔

اونچی عمارتوں سے مکاں میرا گھر گیا
کچھ لوگ میرے حصے کا سورج بھی کھا گئے

یہاں جاوید محمد علوی اور ندا فاضلی کے ہم زبان ہیں۔

سب ہوائیں لے گیا میرے سمندر کی کوئی
اور مجھ کو ایک کشتی بادبانی دے گیا

یہاں عزیز بانو وفا ساحل پر کھڑی ملتی ہیں۔

'وقت' میں جوگی نامے کی روایت کی دھیمی سی بازگشت ہے۔ حال ہی میں، میں نے یہ نظم سن کر جاوید سے کہا کہ یہ تو کچھ برگساں کے 'آن واحد' کا سا چکر معلوم ہوتا ہے۔ کہنے لگے آپ بھول گئیں پندرہ سولہ سال قبل آپ ہی نے تو مجھ سے برگساں کے فلسفہ وقت کا ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسی مسئلے پر بہت سوچا۔

سوچ اور تجسس انسان کو خوب سے خوب تر کی طرف لے جا سکتا ہے۔

کیوں ہیں کب تک ہیں کس کی خاطر ہیں
بڑے سنجیدہ مسئلے ہیں ہم

مہرہ غم ذات سے غم کائنات کی طرف سفر کرتا ہے۔ جاوید اختر مدر ٹریزا سے کہتے ہیں:

مجھ کو تیری عظمت سے انکار نہیں (لیکن)
تو نے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا
کس نے ان بدحالوں کو بدحال کیا ہے

پچھلی نسل کا Self-righteous پر دگریسو شاعر خود ہی یہ جواب نہ دیتا...

میں ٹھہرا خودغرض
بس اک اپنی ہی خاطر جینے والا
میں تجھ سے کس منھ سے پوچھوں...
پوچھوں گا تو مجھ پر بھی وہ ذمے داری آجائے گی
جس سے میں بچتا آیا ہوں
بہتر ہے خاموش رہوں میں

(مدر ٹریزا)

آہنی پردہ روس اور مغرب کے درمیان سے اٹھ کر ہم اہل جنوب ایشیا کی عقلوں پر پڑ گیا۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے سے مزید بدگمان اور متنفر ہوتے جا رہے ہیں۔

چنانچہ جب جاوید اختر کہیں:

آؤ اب ہم اس کے بھی ٹکڑے کر لیں
ڈھاکہ راولپنڈی اور دِلّی کا چاند

تو راولپنڈی کا انٹلکچوئل پوچھے گا کیوں صاحب آپ چاند کو سالم رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟ ان کے کنے تاریخِ اُردو ادب یوں لکھی جاتی ہے، "ولی دکنی پاک و ہند میں سترھویں صدی میں پیدا ہوئے"... ہمارے کنے مغل ہسٹری سیاسی اکھاڑہ بن چکی ہے۔

'پربت پہ پھول کھل رہے ہیں بیٹھا ہے غار میں درندہ'

یہ ایک کامیاب تصویری شعر ہے۔

فسادات پر اُن گنت نظمیں لکھی جا چکی ہیں۔ ایک Ritual ہے جو ہر خونریزی کے بعد دہرایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں شاعر کی بے بسی پر نوحہ زن ہیں (وہ اگر پارلیمنٹ میں بھی پہنچ جائے تو کچھ نہیں کر سکتا) کچھ عرصے بعد سیاسی پارٹیاں دوسرا فساد برپا کروا دیتی ہیں اور مزید دل دوز نظمیں۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، راہی معصوم رضا، جاوید اختر سب نے فسادات پر بہت پر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ ادبی روایت کا تسلسل اسے کہتے ہیں۔

یہ نظریہ کہ ہنگامی حالات کا ادب زندہ نہیں رہتا، صحیح نہیں۔ ہمارے شہر آشوب آج کی داستان معلوم ہوتے ہیں۔ چند مثالیں اور لیجیے، ڈبلیو بی ایٹس کا ایسٹر 1916 عیسوی منٹو کے افسانے، وارث شاہ کے متعلق امرتا پریتم کی پنجابی نظم، کلام فیض۔

اب جو بھی لکھا جائے گا زیادہ تر کرائسس کا ادب ہوگا۔ صورت حال محض ہنگامی نہیں رہی، تاریخ اُلٹ گئی ہے۔ ہندو ورلڈ ویو اور اسلامک ورلڈ ویو پر دھواں دھار تقریریں اور سیمینار ہو رہے ہیں اور ووٹ ڈالے جا رہے ہیں۔

تیز ترک گامزن... تیز ترک گامزن...

جب ابن آدم کی سائیکی پوری طرح بدل جائے گی اور Genetic Engineering سے نہیں بلکہ ذہن شوئی کے ذریعے ایسا ہوگا۔ اس وقت بہت جلد آنے والی صدی کے آغاز ہی میں افراد اور فرقوں اور قوموں کی جمالیات، طرز فکر اور ذرائع ابلاغ دوسری شکلیں اختیار کر لیں گے۔ انیسویں صدی کے آخر میں رومان، جمال پرستی اور غنائیت کا مغربی ادب میں فروغ ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کے روحانی ویرانے میں ایلیٹ نے ویسٹ لینڈ لکھی، پروگریسیو تحریک نے امید پرستی کا چلن عام کیا۔ ہیروشیما کے بعد سے انسان کے دل میں اجتماعی خودکشی اور خواہش مرگ کچھ خود جاگی ہے کچھ دنیا کے Power Brokers نے جگائی ہے۔ نوجوانوں کے اندر تنہائی اور تشدد پسندی بھری ہوئی ہے۔ وہ Hard Rock اور Hard Metal کے ذریعے باہر آ رہی ہے اور ہماری

فلموں میں بھی دھوم دھڑکے سے نمودار ہو چکی ہے۔ لیکن اب زوال پرست مغرب کے مقابلے میں سوشلسٹ بلاک کے صالح، نیک خو نوجوانوں کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ نوجوان بھی سوشلزم کے خاتمے کے بعد آناً فاناً جرائم پیشہ بن گئے۔ ع

بیٹھا ہے غار میں درندہ

ایک ناقابل فراموش چند سکنڈ کا منظر میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ اسرائیلی بمباری کے بعد ایک فلسطینی عورت اپنے گم شدہ بیٹے کا فوٹوگراف مجمع میں ہر ایک کو دکھلاتی پھر رہی تھی اور کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا اور ایک منا سا بچہ اسی بھیڑ میں اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔

تو بوڑھی نانی جس دالان میں آنگن میں یا نیم کے پیڑ کے نیچے بیٹھی ہیں، تسبیح پھیر رہی ہیں یا رامائن کا پاٹھ کر رہی ہیں۔ پل کی پل میں وہ گھر ہندو مسلم یا کاسٹ وار میں پھونک دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ہم خود مکتفی ہیں اور ہمیں غیر ملکی دشمن کی بمباری کی ضرورت نہیں:

'پربت پہ پھول کھل رہے ہیں بیٹھا ہے غار میں درندہ'

یہاں بھی پھول کھلے ہیں اور باہر کی دنیا میں بھی اور سوشلسٹ ممالک میں پھول کھلے ہم نے بہ چشم خود ملاحظہ کیے تھے اور حسین خوش منظر بوزنیہ میں جیتے جاگتے انسان شکاری کتوں کے سامنے ڈالے گئے، اور یوکرین سے لے کر وسط ایشیا تک کمیونزم کا ڈھکن اٹھتے ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

یہ حسن بن صباح اور راسپوٹین اور گوئے بلز کا وقت ہے:

اپنی اپنی تاریکی کو لوگ اجالا کہتے ہیں
تاریکی کے نام لکھوں تو قومیں فرقے ذات لکھوں
غم نہیں لکھوں کیا میں غم کو، جشن لکھوں کیا ماتم کو
جو دیکھے ہیں میں نے جنازے کیا ان کو بارات لکھوں

(غزل)

میں قتل تو ہو گیا تمھاری گلی میں لیکن
مرے لہو سے تمھاری دیوار گل رہی ہے
نہ جلنے پاتے تھے جس کے چولہے بھی ہر سویرے
سُنا ہے کل رات سے وہ بستی بھی جل رہی ہے

(غزل)

'فساد کے بعد'، 'میں اور مری آوارگی'، 'ایک مہرے کا سفر'، 'بھوک'، 'وہ کمرہ یاد آتا ہے'، 'شکست' اور 'وقت' لکھ کر جاوید اختر نے اُردو کی عظیم سمفنی میں اپنا مقام محفوظ کرلیا ہے۔

اُردو شاعری کے نیاگرا آبشار پر اُن گنت پھواروں سے جو قوسِ قزح بنتی ہے اس کے رنگوں کے بہت سے پرتو ہیں اور ان میں جاوید کا پرتو بھی شامل ہو چکا ہے۔

یہ جو زلف تیری الجھ گئی وہ جو تھی کبھی تیری دھج گئی
میں تجھے سنواروں گا زندگی مرے ہاتھ میں یہ اُمور دے

چند ماہ قبل میں دِلّی کے مشہور آرٹسٹ فیروز کے نگارخانے میں گئی جو ذاکر نگر کے دولت مند Ghetto میں ایک حیرت انگیز خوشگوار اور پُرفضا جمالستان کی صورت میں ایستادہ ہے۔ اُستاد فیروز جہانگیر کے مصور استاد منصور کی اولاد میں سے ہیں۔ گویا ان کا اسٹوڈیو بھی آنِ واحد میں شامل ہے۔ وقت کی چند منجمد تصاویر بھی وہاں دیکھیں... جمنا کی ریتی پر میلے کا وہ میلہ جہاں مرزا غالب نے پہلی بار اس ڈومنی کو ناچتے دیکھا جس کا نام آج تک کوئی محقق دریافت نہیں کر پایا۔ آج سے ساٹھ ستر برس قبل دِلّی کی ایک محفل جس میں اس وقت کی ناسور ڈانسر نوشابہ مصروفِ رقص ہیں۔

استاد فیروز بھی گلہری کی دُم سے خود موقلم بناتے ہیں جس طرح ان کے اجداد بناتے تھے اور مختصر ترین مینا تور تیار کرتے ہیں۔

ان کا پتہ مجھے دِلّی مرحوم کی ایک اور باقی ماندہ یادگار یعنی سور گباشی لالہ بھیشور دیال نے اپنی اچانک وفات سے چند روز قبل ہی بتلایا تھا۔

میں نے جناب فیروز سے پوچھا...آپ اتنے اطمینان سے یہ تصویریں بنا رہے ہیں جبکہ باہر کلچر کا مطلب ہی بدل گیا ہے۔ انھوں نے نہایت دلجمعی سے جواب دیا...وہ اپنا کام کریں۔ ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔

اس امید پرست مثبت رویے میں تہذیب اور انسانیت کی بقا مضمر ہے۔

اس وقت جبکہ مصنوعی سیارے ذہن شوئی اور دروغ گوئی کے مقصد سے خریدے جا رہے ہیں، انسانیت کش نظریات کے خلاف سنگھرش میں جاوید جن کے 'ترکش' میں رنگ و چنگ حروف و صوت سب موجود ہیں۔ اپنی ماں کی یہ توقع پوری کر سکتے ہیں کہ وہ فرار کے قائل نہیں ہوں گے اور ڈٹ کر لڑیں گے:

جب سے کسی نے
کر لی ہے سورج کی چوری
آؤ
چل کے سورج ڈھونڈیں
اور نہ ملے تو
کرن کرن پھر جمع کریں ہم
اور اِک سورج نیا بنائیں

(صبح کی گوری)

'ترکش' جدید اردو شاعری کی ایک اہم دستاویز ہے۔ جب تک جاوید کی دوسری کتاب چھپے...میں سمجھتی ہوں اتنا دیباچہ کافی ہے۔

('ترکش'، شعری مجموعہ، جاوید اختر، مقدمہ: قرۃ العین حیدر، پاکستان میں مکتبہ دانیال نے شائع کیا۔ ہندستان میں اسٹار پبلی کیشن، دریا گنج نے شائع کیا۔)

جاڑے کی چاندنی

ای ایم فارسٹر نے سنکلیر لوئس کے متعلق لکھتے ہوئے اسی مصنف کا ایک حوالہ دیا ہے
''میں گوفر پریری دیکھنا چاہتی ہوں۔ مین اسٹریٹ کی ہیروئن نے کہا اور اس کے شوہر نے جواب دیا: ''مجھ پر اعتماد رکھو، یہ رہی تمھاری گوفر پریری۔ اس کے چند اسنیپ شاٹ تم کو دکھلانے کے لیے آیا ہوں۔'' اور یہی کام مسٹر لوئس نے خود کیا ہے۔ انھوں نے ہمیں آنے والی نسلوں کو چند اسنیپ شاٹ دکھلائے ہیں۔ اور یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کوئی کیمرہ استعمال کر سکتا ہے۔''

یہ بات جو فارسٹر نے سنکلیر لوئیس کے لیے لکھی، ہر افسانہ نگار کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ کہانی ایک تصویر ہے جو مختلف زاویوں سے کھینچی جاتی ہے۔ اس کے میڈیم مختلف النوع ہیں۔ الگ الگ روشنیوں میں یہ تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ بعضوں کے یہاں چلچلاتی دھوپ ہے۔ بعضوں کے یہاں شفق کی خواب ناکی۔ کرشن چندر نے قوس قزح کے رنگوں اور موسیقی کے موقلم سے تصویریں کھینچا ہے۔ (اس کے باوجود وہ ہماری اپنی دنیا کی بے حد حقیقی کہانیاں ہیں)۔ بعض نے بڑے مبہم تاثراتی کینوس رنگے ہیں۔ عصمت برش کی جگہ چھریاں چلا کر اس طرح کینوس ہی کے پرخچے اڑا دیتی ہیں کہ اس کے ساتھ دیکھنے والا بھی زخمی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ استعارہ آگے لے

جایا جائے تو یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ عباس نے جاڑے کی چاندنی کی کیفیت کو پوری طرح اپنی تصاویر میں ڈھال لیا ہے۔ کیونکہ مصوری اور افسانہ نگاری میں گہرا تعلق ہے۔ آرٹ فارم کے لحاظ سے موسیقی، مصوری اور لکھا ہوا لفظ تینوں ایک سمفنی کے مختلف لیکن متوازن اسٹینمنٹ ہیں۔ اچھے ادیب کا کمال یہ ہے کہ وہ ان تینوں میں Discord نہ پیدا ہونے دے۔ اردو کے بہت کم ادیبوں کو یہ کمال نصیب ہوا ہے۔ بہت سے لکھنے والے زود نویسی کا شکار ہو گئے۔ عباس نے سمجھداری کی بات یہی کی ہے کہ وہ کم لکھتے ہیں اور محنت سے لکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ بہت عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کا ''الحمرا کے افسانے'' غالباً 1931 عیسوی میں شائع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ان کا ہمارے ''بزرگوں'' میں شمار ہونا چاہیے تھا مگر ان کے فن کی تر و تازگی اور جواں سالی نے ان کو 1960 عیسوی کے ادب کی صف اوّل میں جگہ دلوا رکھی ہے۔

عباس جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے محنت سے لکھتے ہیں اور ایک کہانی کی نوک پلک درست کر کے اسے بار بار سنوارتے ہیں۔ ان کی ایک ٹریجڈی یہ ہے کہ انھیں ''آنندی والے غلام عباس'' کہا جاتا ہے حالانکہ انھوں نے ''آنندی'' کے علاوہ اور بھی کئی بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کا انداز بیان اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بہت رسان سے دھیمے لہجے میں قصے سناتے ہیں اور بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ سناتے ہیں اور قاری کو متوجہ کرنے کے لیے حیران کن یا انوکھے تجربوں کا سہارا نہیں لیتے۔

ہر افسانہ نگار کا ایک لینڈ اسکیپ ہوتا ہے۔ وہ اس میں خوش رہتا ہے اس سے باہر نکل کر اگر اسے کوئی نئی بات کہنی ہو تو اس کے لیے اسے بڑی شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے۔ شاید اسی لیے ہم نے بھی غیر ارادی طور پر ہر قصہ گو کے لیے ایک خانہ تلاش کر لیا ہے۔ ہم پہلے ہی سے سوچنے لگتے ہیں۔ انتظار حسین؟ بلند شہر کے کسی امام باڑے کا رونا پیٹنا ہوگا۔ اے حمید۔؟ امرتسر کی گلیاں اور ساوار کی بھاپ اور زرد گلاب!! شوکت صدیقی۔؟ غنڈے، دہشت، اسرار۔ جمیلہ ہاشمی۔؟ سکھوں کی میلوڈرامائی داستان۔ قرۃ العین حیدر۔؟ وہی لکھنؤ اور مسوری کی ریں ریں۔ اب تو جیلانی بانو اور واجدہ تبسم کے لیے بھی ہم پہلے سے متوقع رہتے ہیں کہ حیدر آباد کے کسی زوال پذیر

فیوڈل خاندان کے متعلق کس قسم کا قصہ سناتی ہوں گی۔

عباس کے لیے سوچیے کہ ان کے افسانے کس خانے میں رکھے جائیں تو پھر وہی ''آنندی'' ذہن میں آ جاتا ہے۔ گویا ان کے سارے افسانوں کی کلید ہے۔ لیکن اس کے باوجود عباس کو کسی ایک پس منظر سے چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے کردار مقامی ہونے کے باوجود مقامی نہیں ہیں۔ ان کا دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ کر لیجیے یہ لوگ ہر لوگ ہر پس منظر میں ٹھیک بیٹھیں گے۔

عباس کی خاص تیکنیک بہت بتدریج ڈیولپمنٹ کی ہے۔ وہ نہایت آہستگی سے کسی ایک Note سے بات شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ اسے نکتہ عروج تک لے جاتے ہیں۔ وہ بڑی نفاست سے کہانی کو پروان چڑھانا جانتے ہیں۔ ان کے بیش تر افسانوں میں کشمکش یا گھبراہٹ یا جھنجلاہٹ یا بے توجہی یا جھول کسی اسٹیج پر نہیں ملتا۔ گوان کی نرم روی کی یہی خصوصیت کئی مرتبہ ان کی فنی کم زوری بھی بن جاتی ہے جس کا ذکر میں آگے کروں گی۔

عباس قصہ سناتے ہیں کہیں Involve نہیں ہوتے۔ مزے سے واقعات بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ جوزف کونرڈ نے ایک جگہ لکھا تھا کہ جو لوگ مجھے پڑھتے ہیں ان کو دنیا کے متعلق میرے عقیدے کا علم ہوگا میں سمجھتا ہوں کہ یہ temporal دنیا چند بہت سیدھے سادے تصورات پر قائم ہے اور یہ تصورات اتنے سیدھے سادے ہیں کہ یہ پہاڑیوں کے اتنے پرانے ہوں گے۔ عباس کے یہاں بھی اس Temporal دنیا کے واقعات ہیں۔ فلسفہ طرازی، مابعد الطبیعات، رمزیت کا یہاں گزر نہیں۔ عام لوگوں کی داستانیں ہیں جو عام ہوتے ہوئے بھی انوکھی اور خیال انگیز ہیں۔ بردہ فروشوں، کلرکوں، خالی اوورکوٹ پہننے والے مفلس نوجوانوں کی داستان سناتے ہوئے عباس کی نگاہ سیدھی زندگی کی لایعنیت اور Irony اور معصومیت پر پہنچ جاتی ہے۔

ایک امریکن نقاد نے ممتاز ناول نار جمیز ٹی فیرل کے سلسلے میں کہیں پر لکھا ہے کہ:
''حقیقت پسند افسانے کے ضمن میں ایمان داری ایک مشتبہ وصف ہے جس کا یہ دعویٰ بہت سے لوگ سب سے پہلے کرنا چاہتے ہیں لیکن کوئی ذہین قاری افسانے میں خالص ایمان داری کا تقاضا

نہیں کرتا۔ وہ محض یہ چاہتا ہے کہ افسانہ یا داستان مصنوعی نہ ہو۔ اس میں انسانی زندگی کے نمائندے ایسی ابتدائی اور قدرتی شکلیں اختیار کریں جو مثالی طرز عمل کے تسلیم شدہ تانے بانے کو توڑتی ہوئی آگے نکل جائیں۔''

عباس کے کرداروں سے ملاقات کر کے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اتنے معمولی ہونے کے باوجود کتنے پراسرار ہیں۔ اسی سلسلہ میں مصنف کی جزئیات نگاری کی مہارت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ''اس کی بیوی'' ایک نوجوان کی کہانی ہے جس کی محبوب بیوی مر چکی ہے اور وہ ایک طوائف سے اس کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ (اس کے آخر کا اچانک انکشاف بھی عباس کی خصوصیت ہے) اس میں جزئیات نگاری کی چند مثالوں نے خصوصیت کے ساتھ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔

''وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور ہیر وینوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی فرش سے اٹھا اٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔''

اسی طرح ایک اور جگہ پر۔

''اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آرہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا مگر جہاں اسے ذرا کامیابی ہوتی نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے اُسے پھر اوندھا کر دیتا۔''

سادگی بیان ملاحظہ کیجیے۔

''اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک ندی بہتی ہے۔ وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا۔

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دل چسپی سے سنتی رہی۔"

اور افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ ہم بھی بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔

اور سنیے۔

"نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روز مرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں مثلاً ایک تو چٹلا خریدا۔

"تنکے کا سہارا" عباس کے مخصوص طرز کا اجتماعی افسانہ ہے۔اس میں طرز بیان کی سادگی کا ایک اور نمونہ دیکھیے۔

"دو پہر کو حاجی صاحب کے یہاں سے پرانے کپڑوں کا گٹھر سید کی بیوی کے ہاں بھیجا گیا۔ساتھ ہی جمن بی نے کہلوایا کہ کبریٰ اور صغریٰ کو بھیج دو۔کلام پاک کا سبق پڑھ جائیں اور چٹیا بھی کرالیں۔

تعجب ہے اس افسانے کا انجام مصنف نے مختلف کیوں کر دیا۔

میں سمجھتی ہوں کہ "اس کی بیوی" اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے۔ایک اور بہت اچھا افسانہ "غازی مرد" ہے۔عباس کے یہاں بدی اور معصومیت کی باہم کشمکش اور زندگی کے الم اور بے بسی کی منظر کشی بہت مدھم سروں میں کی جاتی ہے۔منظر کشی میں نے اس لیے کہا کیونکہ عباس کے یہاں ذاتی اسٹیٹمنٹ کہیں نہیں ہے۔یہ نیچے سر Bass کے ہیں جو Treble کے سروں کے ساتھ ساتھ بجتے رہتے ہیں اور کبھی اوپر اوپر آجاتے ہیں۔موسیقی ہی کی اصطلاح میں عباس کے یہاں معصومت کے اس تقسیم کو کاؤنٹر پوائنٹ بھی کہا جاسکتا ہے۔اس مجموعے کا عنوان "جاڑے کی چاندنی" سوچتے ہوئے ممکن ہے کہ مصنف کو بیتھوون کے "مون لائٹ سوناٹا" کا دھیان رہا ہو۔

"فینسی ہیر کٹنگ سیلون" مصنف کے بہت چھوٹی چھوٹی اینٹیں رکھ کر عمارت کھڑی کرنے کے فن کی اچھی مثال ہے۔اسے آپ موزیک Mosic کے فن سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔عباس چند کردار اکٹھے کرتے ہیں ان کے مختلف پس منظر،عادات،خصوصیات،پھر ان سب کو جمع کر کے

وہ ایک گھر یا ایک دکان یا ایک محلہ یا ایک پورا شہر آباد کر دیتے ہیں اور اس طرح ہمارے دیکھتے دیکھتے نہایت خاموشی سے تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر کشی کی تکنیک ہے جس میں پہلے پنسل سے خاکہ بنایا جاتا ہے پھر رنگوں کی پہلی سطح چڑھائی جاتی ہے۔ کہیں یہ رنگ Flat رکھے جاتے ہیں۔ کہیں ان کے مختلف ٹون بنتے ہیں۔ پھر برش سے چھوٹے اور بڑے اسٹروک لگائے جاتے ہیں اور یوں رفتہ رفتہ تصویر مکمل ہوتی ہے۔ عباس کی تکنیک گہرے اور بھاری روغنی رنگوں کے بجائے آبی رنگوں کے واش کی ہے۔ تصویر میں رنگ بھرنے کے بعد وہ اسے پانی سے ''واش'' کرتے ہیں تاکہ رنگ لطیف، متوازن اور ہم آہنگ ہو جائیں۔

''سایہ'' اور ''جھنور'' بھی مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس مجموعے کے سبھی افسانے اچھے ہیں۔ ''پیسے والا''، ''مکرجی بابو کی ڈائری''، ''دو تماشے'' کمزور ہیں۔ ''سرخ جلوس'' میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔

عباس کا نرم لہجہ بعض دفعہ اتنا نرم ہو جاتا ہے کہ آخر میں افسانے کی اینٹی کلائمکس ہو جاتی ہے اور اچانک ایک پھسپھسے سے خاتمے پر پہنچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار محض ایک واقعہ سنانا چاہتا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ بات ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے میں نہیں تھی۔ اس مرتبہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے اکثر افسانوں پر پہلے بہت غور و خوض کیا اور پھر بور ہو کر ان کو ادھورا چھوڑ دیا۔ عباس بہت اچھے Fragments لکھ سکتے ہیں اور ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار کی حیثیت سے یہی ان کی کامیابی کی ایک وجہ ہے۔

''جاڑے کی چاندنی'' کا مقدمہ ن۔ م راشد نے لکھا ہے اور چغتائی صاحب کا بنایا ہوا گرد پوش خاصے کی چیز ہے۔

('داستانِ عہد گل' مرتبہ آصف فرخی)

قندیل چین

عہد وکٹوریہ میں ہندستان بھی نئے زمانے سے آشنا ہوا۔ ہمارے بچپن کے نصاب تعلیم میں ایک سبق بہ عنوان "انگریزی راج کی برکتیں" بھی شامل تھا۔ اسکول، کالج، اسپتال، ریل، تار، ڈاک خانے، بجلی کی روشنی، اسی کے ساتھ ساتھ اکبرالٰہ آبادی بطور یونانی کورس اپنا رواں تبصرہ بھی کرتے جا رہے تھے۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

ہمارے بزرگوں نے بھی نئے دور سے مصالحت کی، خود تو مغلیہ لباس پہنتے رہے لیکن اپنے بیٹوں کو سید کے مدرسے روانہ کیا۔ ان بچوں نے کالج کا نیا یونیفارم پہنا اور نہایت خود اعتمادی اور بشاشت کے ساتھ دور حاضر میں شامل ہوئے۔ حس ظرافت، لطیف طنز و مزاح جو ایک رچی ہوئی تہذیب کی خصوصیت ہے ان کے یہاں بھی موجود تھی علی گڑھ کی اقامتی زندگی سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔

اس لباس کا "ٹرکش کوٹ" ہندی مسلمانوں کی سلطنت عثمانیہ سے جذباتی وابستگی کی

علامت تھا۔ زوال غرناطہ (اواخر پندرھویں صدی) کے بعد سلطنت مغلیہ (1857) اور اس کے محض 57 سال کے بعد خلافت عثمانیہ (1918) کی تباہی نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچایا۔ پندرھویں صدی میں زیادہ تر اہل ہند کو یہی معلوم نہیں تھا کہ یورپ کہاں ہے۔ اور ہندی مسلمان ہسپانیہ سے بھی ناواقف تھے۔ پرتگالی، گوا پہنچ چکے تھے مگر دلی والے دیار مغرب سے لاعلم اور بے نیاز رہے۔ میں نے پہلے بھی شاید کسی کتاب میں تذکرہ کیا ہے کہ جب دار السلطنت کے بڑے بڑے حکیم اور وید، فرخ سیر کی ایک بیگم کے علاج معالجے میں ناکام رہے تو ایک پرتگالی لیڈی ڈاکٹر جولیانا کو گوا سے بلایا گیا۔ نشاۃ ثانیہ کے یورپ کی اس وقت تک کایا پلٹ چکی تھی۔ میڈیکل سائنس میں روز افزوں ترقی جاری تھی۔ اس پرتگالی لیڈی ڈاکٹر نے مرض کی فی الفور تشخیص کر کے ولایتی دواؤں کے ذریعے ملکہ کو بھلی چنگی کر دیا۔ محل کی چند کنیزوں نے شاید یہ بھی کانا پھوسی کی ہو کہ یہ گوری عورت جادوگرنی ہے۔ بہرکیف فرخ سیر نے بطور فیس ڈاکٹر جولیانا کو ہیرے جواہرات سے بھرا تھال پیش کیا جسے اس بوڑھی عورت نے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اس کے بجائے اسے دلی کے پاس تھوڑی سی زمین عنایت کر دی جائے جہاں وہ ایک شفاخانہ قائم کرے اور غریب عیسائیوں کو وہاں بسا دیا جائے۔ چنانچہ دہلی کے باہر سرائے روہیلہ کی مانند ایک سرائے جولیانا بھی قائم ہو گئی۔ روہیلہ پٹھانوں کا سیاسی تسلط تو کب کا ختم ہو چکا لیکن سرائے جولیانا والوں کا سیاسی تسلط تین سو سال تک قائم رہا اور ہم سب اُسی نیم یورپین ماحول اور تہذیب کے پروردہ ہیں وہی طرز معاشرت اختیار کر چکے ہیں۔ ان ہی کی زبان ہماری ترقی کی ضامن ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ لیڈی جولیانا[1] کی سرائے میں ان اہل مغرب کا قیام عارضی نہیں رہا۔ بہت دیرپا ثابت ہوا۔ آج بھی ہم کتنا ہی سودیشی اور قوم پرستی کا راگ الاپیں ہماری طرز معاشرت، طریقہ تعلیم، ہماری سوچ، زاویۂ نظر ہر چیز پر مغرب سایہ فگن ہے۔

پرنٹنگ پریس سے لے کر، بجلی کی روشنی، ریل گاڑی موٹر کار، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی گرام، ٹیلی وژن اور فاؤنٹین پن تک ہر چیز پچھم کی دین ہے۔ لیکن ہم نے اب تک رفاہ عام کے مغربی رویے کو قبول نہیں کیا۔ یہاں اب بھی جو خاطر خواہ خدمت خلق کی جاتی ہے وہ عموماً

مغرب سے آئے ہوئے مبلغین اور سماجی کارکنوں ہی کی مرہون منت ہے۔ مضافات دہلی میں جولینا اب ایک بہت ہی ترقی یافتہ علاقہ ہے اور یہ بھی اپنے مشنری ہسپتال کی وجہ سے مشہور ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ اہل مغرب میں یہ پبلک اسپرٹ کہاں سے آئی اور ہمارے یہاں کیوں مفقود ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب جب کوئی بحث شروع کرتے تھے تو بڑے جوش سے کہتے۔

Now you do some mental thinking

چنانچہ ناظرین آپ بھی اس مسئلے پر تھوڑی سی مینٹل تھنکنگ کیجیے۔

اس مجموعے میں ناچیز کے وہ سارے افسانے موجودہ ہیں جو آج تک کتابی صورت میں شایع نہیں ہوئے اور مجھے خود بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کب اور کہاں چھپے تھے۔ البتہ شروع کے افسانوں کے متعلق مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ قصہ یہ ہے کہ مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ والدہ مرحومہ نے بحیثیت مس نذر الباقر اس صدی کی اولین دہائی میں لکھنا شروع کیا اور 1910 میں بچوں کے ہفتہ وار اخبار 'پھول' کی ایڈیٹر مقرر ہوئیں۔ یہ اخبار اور ہفتہ وار ''تہذیب نسواں'' سہارن پور یوپی سے آئے ہوئے ایک بزرگ شمس العلما مولوی ممتاز علی اپنے قائم کردہ دار الاشاعت پنجاب لاہور سے شایع کرتے تھے۔ ان کی بیوی محمدی بیگم اس کی ایڈیٹر تھیں۔ اس زمانے میں لڑکیوں کا لکھنا پڑھنا تو درکنار ان کے نام تک کا پردہ تھا۔ لہٰذا ''تہذیب نسواں'' کے سرورق پر چھپتا تھا کہ یہ اخبار ایک شریف بی بی کی زیر ادارت شایع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد متعدد زنانہ رسالے چھپے جن میں سے ایک کا نام ہی شریف بی بی تھا۔ ''تہذیب نسواں'' اور ''پھول'' بہر حال تاریخ ساز رسالے ثابت ہوئے۔ میں نے شاید پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ اخبار ''پھول'' میں ہندو اور سکھ نونہالوں کے مضامین اور کہانیاں بھی برابر شایع ہوتی تھیں۔ ان میں ایک نام موہن لال آہوجا مجھے اب تک یاد رہ گیا ہے۔ لیکن۔

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی

یہی مقبول و محبوب اردو زبان آریہ سماج کا آلۂ کار بھی بنی اور مختلف سیاسی تحریکیں اسی کے واسطے سے مقبول ہوئیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے ذریعے اعلا تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ میں بھی اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے بڑے بڑے دینی ادارے دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، سہارنپور، شمس الہدیٰ پٹنہ، کلکتہ اور بمبئی کے مشہور دینی مدارس آج بھی اسی طرح علم و فضل کے سرچشمے بنے ہوئے ہیں۔ مجھے یاد ہے بمبئی میں ٹائمز آف انڈیا بلڈنگ کے زیر دیوار اس شہر کا عظیم الشان اسلامی مدرسہ انجمن الاسلام ہائی اسکول واقع ہے۔ روزانہ شام کے پانچ بجے اس مدرسے کے طالب علم اپنے بینڈ پر چھٹی کی دھن بجاتے تھے اور ہم لوگ فوراً اپنے اپنے کام سے دست بردار ہو کر خوشی خوشی اپنے ڈسک چھوڑ دیتے تھے۔ شام کے وقت اس بینڈ کی دھن بہت ہی سہانی معلوم ہوتی تھی اور اس سے ماحول پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اس مجموعے میں میرے وہ اولین افسانے بھی شامل ہیں جب میں نے بچوں کے رسالہ ''پھول'' سے گویا ترقی کر کے ''تہذیب نسواں'' میں چند انگریزی مضامین کے ترجمے شائع کروائے تھے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت کانگریس گورنمنٹ کی وزیرِ صحت مقرر ہوئی تھیں اور انھوں نے ایک مضمون لکھا تھا کہ جب وہ اپنے نئے دفتر میں داخل ہوئیں تو انھوں نے وہاں سے ایک بدنما فرش اٹھوا کر گلابی قالین بچھوایا۔ اس مضمون کے ترجمے کا عنوان میں نے '' گلابی قالین کی کہانی'' رکھا تھا۔ ہم لوگ دہرہ دون کے ایک نہایت حسین اور پرفضا کوٹھی ''دون ہیون'' میں مقیم تھے۔ شام کو میرے ساتھ کھیلنے کے لیے احمدی عرف منّی اپنے بنگلے سے آجاتی تھی۔ وہ سرسید احمد خان کے چھوٹے بھائی نواب [2] محمد علی کی پوتی تھی۔ لیکن کونونٹ میں پڑھنے والی دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی اردو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب میں کھیل کود سے فارغ ہوتی تو والدہ اپنے کمرے سے آواز دیتیں لڑکی ادھر آؤ۔ کاغذ قلم لے کے بیٹھو پھر وہ نہایت روانی اور برجستگی سے اپنا نیا ناول نجمہ لکھوانا شروع کر دیتیں۔ وہ ناول لکھوانے کے بعد انھوں نے اسے چھپنے کے لیے جس کی بھی شدید فرمائش آئی تھی اُسے بھیج دیا معاوضے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح

انھوں نے اپنی ساری کثیرالاشاعت کتابیں قطعی بلا معاوضہ شایع کروائیں اور ان کے اڈیشن آج تک بار بار اسی طرح نکل رہے ہیں۔ چونکہ ٹیلی وژن کے گھریلو پروگرام کے باوجود پرانی نسل کی خواتین اب بھی اس نوع کے معاشرتی ناول بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔

جس زمانے میں ترقی پسندوں نے اپنے نئے نئے جوش میں ماضی کی ہر چیز کو مسترد کر دیا تھا وہ ان سے پہلے کے افسانوں کا مذاق اڑانا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے تب ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ یہ افسانے ہندستان کے ایک اہم عبوری دور کی ترجمانی کر رہے تھے۔ عمرانی نقطۂ نظر سے ان کا مطالعہ بھی نہیں کیا گیا۔ مثلاً والدہ مرحومہ کے ناول 'مذہب اور عشق' میں آج سے ستر اسی سال قبل دور جدید کے ہندستان کے ایک اہم مسئلے یعنی ہندو مسلم شادی کا موضوع پیش کیا گیا تھا۔ اور یہ اردو فکشن میں ایک انقلابی اقدام تھا۔ لیکن میں نے آج تک کسی تذکرے میں اردو کے بڑے سے بڑے ادبی مورخ کے قلم سے لکھے ہوئے کسی مضمون میں ناول ''مذہب اور عشق'' کا نام بھی نہیں پڑھا۔ ایسا کیوں ہے۔ ہمارے ناقدین زیادہ تلاش و تحقیق کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ کیا انھوں نے یہ کام محض ان سر پھرے امریکنوں کے لیے چھوڑ رکھا ہے جو ہندستان آکر اس قسم کی چیزیں ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور ان کے متعلق لکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے اردو کے ایک بہت ہی بلند پایہ مشہور و معروف ترقی پسند نقاد نے نذر سجاد حیدر کی تصانیف یقیناً بغیر پڑھے نہایت استہزا کے ساتھ مصنفہ کا نام لیے بغیر رقم کیا تھا کہ انھوں نے بھی ناول لکھنے کی کوشش ___ اور جملہ پورا نہیں کیا تھا۔ اس قسم کی بے وقوفانہ برخود ہمہ چوں ما دیگرے نیست رویہ ہماری تنقید میں اکثر مل جاتا ہے۔ ایک زمانے میں والدہ مرحومہ اردو کی صف اول کی اہل قلم ادیبوں میں شمار کی جاتی تھیں۔ ترقی پسند تحریک نے ادبی فضا بدل دی وہ بڑے بڑے رسالے نیرنگ خیال وغیرہ جن میں والدہ کے افسانے آب و تاب سے شایع ہوتے تھے اچانک بند ہو گئے۔

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا ساز ہے راگ بدلے گئے

ترقی پسند ادیبوں نے ایک نیا بہت ہی جاندار اور جگمگاتے ہوئے دور کا آغاز کیا۔ اس

نئے دور کی تشکیل میں مختلف عوامل کارفرما تھے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی ہندستان کے سیاسی وسماجی حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے تعلیم یافتہ طبقے کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جنگ کی بدولت ایک نیا خوش حال طبقہ وجود میں آ گیا تھا۔ اس کے مطالبات اور ترجیحات گذشتہ دور سے مختلف تھے۔ نئی خوشحالی، تیزی سے ابھرتا ہوا فیشنیبل طبقہ، بڑے کاروباریوں کی نئی دلچسپیاں، فلم انڈسٹری کی تیز رفتار ترقی جس کی وجہ سے اردو کو مزید مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن یہیں سے فرقہ وارانہ تعصبات کے تحت یہ زبان ہندی کہلائی۔ نئے سیاسی اور لسانی جھگڑے شروع ہوئے۔ لاہور فلمی صنعت کا نیا مرکز بنا یہاں بھی اردو جو پہلے سے ہندوؤں اور سکھوں کی علمی وادبی زبان تھی فلموں کے ذریعے مزید مقبول ہوئی۔ اسی زمانے میں لاہور کے اشاعتی اداروں نے اعلیٰ درجے کی ادبی کتابیں شائع کیں۔ ادب لطیف، سویرا اور نقوش ان تین رسالوں نے اپنی دھاک بٹھادی۔ تقسیم نے ہندستان میں اردو کے ساتھ جو کیا سو کیا لیکن کراچی اور لاہور بڑے ادبی مرکز بن گئے۔ دہلی سے دینی رسالے نکلتے رہے اور فلمی رسالہ ''شمع'' مقبولیت کی ایک ضرب المثل بن گیا۔ ڈھاکہ بھی اردو والوں کا نیا مرکز بنا۔ لیکن یہ بہار چند روزہ تھی اور اس کا انجام بہت ہولناک اور دل خراش ہونے والا تھا۔ مجھے یاد ہے جب ڈھاکے میں میری کزن حسنا آپا بیگم حسنا لقمان حیدر کے یہاں اردو والے جمع ہوتے تھے وہ مرحومہ انجمن ترقی اردو ڈھاکہ کی سرپرست تھیں اور بڑی تندہی سے اردو کے لیے کام کرتی تھیں۔ جب بھی میں ڈھاکے جاتی، یونی ورسٹی کے سبزے پر اور مختلف انجمنوں میں راقم الحروف کی پذیرائی کے لیے ادبی جلسے اور محفلیں منعقد کی جاتیں۔ اُس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ محض چند سال بعد یہاں اردو بولنے والوں کا قتل عام ہوگا جو کچھ ہوا نا قابل یقین ہے۔ میں نے ایک رپورتاژ اسی زمانے میں بہ عنوان ''پدما ندی کنارے'' لکھا تھا۔ جو ماہنامہ افکار کراچی 60 میں شائع ہوا تھا۔ اس کو پڑھ کر اس زمانے کی اردو کی بارونق ادبی محفلوں کا کچھ اندازہ قارئین کو ہو سکتا ہے ان حاضرین محفل میں سے کچھ مارے گئے، کچھ ملک بدر ہوئے، ہم یورپ کی جنگوں کے متعلق پڑھتے ہیں کہ زوال فرانس اور سکوت پیرس کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم محض تصور کر سکتے ہیں کہ وہاں کے لوگوں پہ کیا گزری۔ لیکن بہرحال وہ ہمارے لیے اجنبی

ہیں۔قومیت، مذہب، زبان، کلچر کسی چیز میں ہمارا ان کا ساجھا نہیں ہے۔لیکن یہ بنگالی تو ہمارے ہی لوگ تھے اور وہ سب کے سب مسلمان بھی تھے لیکن ان کو کس وحشیانہ طریقے سے اور کیسی کیسی اذیتیں دے کر مارا گیا۔کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ آپ کو ایک کرسی پہ بٹھا کر کرسی سے باندھ دیا جائے اور پھر آپ کے جسم سے ایک آلے کے ذریعے سارا خون نکال لیا جائے اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے جاں بحق ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے آپ ایسا تصور نہیں کر سکتے لیکن ان گنت افراد کو مشرقی پاکستان میں اسی طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔بدترین بربریت کی یہ داستانیں بھلا دی گئیں۔اور سب گویا فرشتے بن گئے۔

اس مجموعے کا اولین افسانہ ''ایک شام'' میری پہلی تحریر ہے جو گویا میں نے بڑوں کے لیے لکھی ہے۔ اس سے قبل میں بچوں کا اخبار ''پھول'' اور اس کے بعد ماہنامہ ''بنات'' میں کہانیاں لکھتی رہی تھی۔اُسی زمانے میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور لکھنؤ کی دو بہنوں کے افسانے بھی شایع ہونے لگے۔لیکن ان کا اسٹائل بالکل مختلف تھا۔اب گویا اس وقت کے اردو فکشن میں دو متوازی لہریں شامل ہوئیں ایک ترقی پسند ادب جو نئے سیاسی اور سماجی رجحانات کا نقیب تھا۔ دوسرا رومانی ادب تو بہت پہلے سے موجود تھا۔اس کے ردعمل کے طور پر نئے ترقی پسندوں نے کافی جوش وخروش کا اظہار کیا اور اردو کے چند بہترین افسانے اُسی دور میں لکھے گئے۔علی گڑھ اس تحریک کا بھی ایک اہم مرکز بنا۔عصمت آپا بھی مسلم گرلس کالج میں پڑھتی تھیں ان کا افسانہ ''پردے کے پیچھے'' اُسی دور کی یادگار ہے۔عصمت آپا کے خاندان کی خواتین اپنی برجستہ بے حد جاندار اور شگفتہ گفتگو کے لیے مشہور تھیں۔مثلاً مجھے عصمت آپا یا شاید ان کی کزن انور آپا کا ایک جملہ اب تک یاد ہے وہ ایک نئی کوٹھی کے دریچے کو دیکھ کر اس کوٹھی کی مالکن سے بولیں اے ہے اس میں سے تو چور اپنے بیوی بچوں سمیت اندر آ جائے گا۔

نئے افسانے کی تحریک میں علی گڑھ والے بھی پیش پیش رہے وہ میر کارواں پنجاب لاہور کے کرشن چندر تھے۔انھوں نے چند دل آویز افسانے لکھے اور بہت جلد ایک لی جنڈ کی حیثیت اختیار کر لی۔لاہور کے مشہور رسالوں کے علاوہ دہلی کا ''ساقی'' بھی باقاعدہ ایک روایت بنا۔لیکن

ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لکھنؤ ادبی رسالوں کے اس نئے جشن میں شامل نہیں تھا۔ نیاز فتح پوری کا ''نگار'' ایک مکمل رسالہ تھا۔ لکھنؤ کا ''نیا ادب'' وغیرہ چند روز کی بہار جاں فزاں دکھلا کر غائب ہو گئے اسی دور میں کافی ہاؤس کلچر نمایاں ہوئی۔ قہوے اور چائے کے اسکوٹش پلانٹرز نے اپنی تجوریاں تو بے شک بھریں لیکن اردو ادب کی خدمت بھی کافی کر گئے۔ ان گورے غیر ملکی سرمایہ کاروں کے خلاف ان ہی کی کاشت کیا ہوا قہوہ اور چائے پیتے ہوئے ہمارے نوجوانوں نے اردو ادب کی اہم خدمت انجام دی۔ وہ یقیناً نئے ادب کا سنہرا دور تھا۔

لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُسی زمانے میں اور اس سے ذرا قبل انگلستان میں لفٹ ونگ لٹریچر کی دھوم مچی تھی اور ہمارے چند نوجوان ملک راج آنند، سجاد ظہیر وغیرہ جو انگلستان کی یونی ورسٹیوں میں پڑھتے تھے اس ادب سے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر کافی ہاؤس کلچر کے دور تک برطانیہ نے قدم بہ قدم ہر اسٹیج پر ہندستانی ذہن کو گہرے طور متاثر کیا اور آج تک یہی حالت ہے۔ ہندستانی ادب میں دور حاضر کی نئی تحریکیں بھی مغرب ہی سے آئی ہیں۔ روسی اشتراکی ادب نے بھی بے شک لفٹ ونگ پر اپنے اثرات مرتب کیے۔

دور افتادہ بنگلور میں ممتاز شیریں اور ان کے شوہر صمد شاہین نے ایک رسالہ ''نیا دور'' نکالا جو عین مین پنگوئین نیو رائٹنگ کی کاربن کاپی تھا۔ آزادی کے فوراً بعد یہ میاں بیوی کراچی آ گئے یہاں صمد شاہین نے انگریزی کتابوں کی ایک دوکان ٹامس اینڈ ٹامس اپنے نام الاٹ کروائی اور یہ اردو ادیبوں کا ایک مرکز بن گئی جہاں محمد حسن عسکری چپ چاپ کسی الماری کے سامنے کھڑے کسی کتاب کے مطالعے میں مستغرق نظر آتے تھے۔ ممتاز شیریں ایک بہت ہی کم گو اور متین خاتون تھیں۔ ان سے کوئی بات کی جائے تو اس کا جواب بھی ان کی طرف سے ان کے نہایت طباع شوہر دیتے تھے۔ وہ اپنے بارے میں بالکل خاموش رہتی تھیں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ بنگلور میں آپ لوگ کیا کرتے تھے۔ کہا جی ہمارے کوفی پلانٹیشن تھے میں نے جواب دیا تب تو آپ کو ان پلانٹیشن والوں کی زندگی اور ماحول کے متعلق ضرور لکھنا چاہیے۔ ہم تو اس سے بالکل ناواقف ہیں جی کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ انھوں نے چند طویل افسانے بھی لکھے لیکن فکشن کی

تنقید ان کا اصل میدان تھا اور وہ بہت ذہین نقاد تھیں۔

خواتین کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ حسِ مزاح یعنی سنس آف ہیومر سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ چونکہ ایک تو یہ ہمارے روایت پسند معاشرے میں لڑکیوں سے کہا جاتا تھا کہ چنلا پن مت کرو، قرینے سے بیٹھو، کودکڑے مت لگاؤ، لفظ حرافہ بھی تیز طرّار عورتوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی پڑھی لکھی گویا ایک لڑکی کا پڑھا لکھا ہونا بڑی افسوس ناک قابلِ اعتراض بات تھی۔ دوسرا بُرا لفظ علامہ تھا۔ اے ہے وہ تو بڑی علامہ ہے ایک لفظ قطامہ بھی تھا یعنی کٹنی۔

چنانچہ ممتاز شیریں جو بے حد ذہین خاتون تھیں اس لحاظ سے قدامت پسند معاشرے کی ایک مثالی نمائندہ بھی تھیں اور اپنی سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے ان کو سنس آف ہیومر سے قطعی عاری سمجھا جاسکتا تھا۔ کم از کم میں نے انھیں کبھی مسکراتے نہیں دیکھا وہ ایک بہت ہی بھلی اور مہذب گھریلو بی بی تھیں افسوس کہ وہ دنیا سے بہت جلد چلی گئیں۔ میری ان سے بہت اچھی دوستی تھی۔ لیکن یک طرفہ یعنی میں جو ایک باتونی خاتون ہوں بولتی رہتی تھی اور وہ خاموش۔ جب میں جدید انگریزی ادب کا ایک مختصر کورس کرنے کے لیے کیمبرج سڈنی سسکس کالج گئی اس کورس کی محض یہ اہمیت تھی کہ اس میں ای ایم فاسٹر وغیرہ آ کر لکچر دیتے تھے۔ اور میں نے اس کا ضمناً تذکرہ اپنے رپورتاژ ''لندن لیٹر'' میں کیا جو نقوش میں شائع ہوا۔ لیکن اس کورس کے فوراً بعد ممتاز شیریں بھی اسی نوع کے ایک سمر اسکول کے لیے آکسفورڈ گئیں وہ کورس بھی چند ہفتوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کے تعارفی نوٹ میں یہ لکھا جانے لگا کہ انھوں نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ نہ ان مرحومہ نے نہ ان کے شوہر نے اس غلط بیانی کی تصحیح کی۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ہمارے ادب میں اسی طرح مختلف النوع غیر مصدقہ بیانات بہ طور حقیقت شامل ہو جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے صحیح اور مستند مانے جاتے ہیں۔ اُسی طرح فراق گورکھپوری کے لیے مشہور ہو گیا کہ وہ آئی سی ایس میں منتخب کر لیے گئے تھے۔ جو سراسر غلط تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں آئی سی ایس کا امتحان انگلستان میں ہوتا تھا اور وہ مرحوم انگلستان نہیں گئے تھے۔ زیادہ تر اس قسم کے بیانات یا افواہیں ہماری اجتماعی احساس کمتری کی علامت ہیں اور یہ احساس کم تری

سارے کولونیل مشرق کا ایک امتیازی وصف ہے۔ میں نے بڑے بڑے طرّم جنگ لوگوں کو دیکھا ہے کسی گورے سے بات کرتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک عجیب سی لجاجت طاری ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک باریکی اور مضمر ہے۔ سابق سوویت یونین اور مشرقی یورپ سے آئے ہوئے افراد اہل قلم وغیرہ ان کے میز بانوں کو اتنا مرعوب نہیں کرتے تھے۔ لیکن انگریز اور امریکن وغیرہ کا رعب اور دبدبہ بہت حد تک ہمارے یہاں اب بھی طاری تھا۔ آپ میری اس بات کو مانیں یا نہ مانیں اصلیت یہی ہے۔ وجہ وہی تھی پانچ سو سال مشرق پر ان کی حکومت اور گذشتہ دو سو برس سے مشرقی ذہن پر ان کی علمیت کا رعب داب۔ اور ایسا ہونا بھی لازمی تھا۔ وہ زمانہ تو گزرے بھی دو صدیاں بیت گئیں جب انگریز نفر ہمارے یہاں آکر مشرقی طور طریق اختیار کرتا تھا، حقہ پیتا تھا، ہندستانی عورتوں سے شادی کرتا تھا، اس برابری کے میل جول نے ایک نئی کلچر کی تخلیق کی جسے آج ہم موڈرن انڈین اور پاکستانی کلچر کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک صریحاً دوغلی تہذیب ہے۔ ہم بیٹھک کی بجائے ڈرائنگ روم کہتے ہیں۔ مدرسے اور پاٹھ شالہ کے بجائے اسکول اور کالج جاتے ہیں۔ لباس نیم مغربی ہو چکے ہیں ابھی تین سال قبل کا واقعہ ہے ہماری دوست محترمہ سیدہ سیدین بنت خواجہ غلام السیدین مرحوم کسی نیم سرکاری کام کے سلسلے میں ہمارے یہاں نہٹور تشریف لے گئیں۔ ان کے ہم راہ مسٹر مرلی منوہر جھنڈارے بھی تھے۔ بعد میں موصوف نے کسی سے نہٹور کے مکان کے متعلق کہا۔

An Italian Count's House with Indian Cuisin.

یہ ایک مہاراشٹرین — کا بے ساختہ ریمارک تھا۔ کیونکہ یہ مہاراشٹرین بندہ غیر شعوری طور پر اس مغلیہ تہذیب سے بھی واقف تھا جسے مراٹھا پیشواؤں نے جو مغلوں کے جانشین تھے اپنے ان بدقسمت مفتوحین سے بہ طور ورثہ حاصل کی تھیں۔ مرہٹے تاریخی لحاظ سے مسلمانوں کے دشمن لیکن اُسی حد تک ان کی تہذیب کے وارث بھی ہیں اور یہ لو — ہیٹ رشتہ ساری دنیا کی تاریخ میں مختلف قومیتوں کے درمیان موجود رہا ہے۔ بلقان کی ریاستوں کے کٹر عیسائی باشندے اپنی حاکم مسلمان ترک قوم کی تہذیب اختیار کر چکے تھے جو آج تک ان کے یہاں باقی ہے۔ تہذیبوں کا یہ سلسلہ کہاں سے کہاں تک جاتا ہے اس کا اندازہ مجھے امریکہ کی ایک جنوبی ریاست میں ہوا جو

تاریخی اعتبار سے ہسپانیہ کے تمدنی حلقہ اثر میں شامل رہ چکی تھی۔ وہاں جس مکان میں میں ٹھہری تھی وہ ایک عرب اسٹائل کا مکان تھا۔ باضابطہ چہار دیواری والا صحن لیکن صحن کے وسط میں ورجن میری کا مجسمہ یاد دلاتا تھا کہ ہسپانیہ میں صلیب نے کس طرح ہلال کو زیر کیا۔ ایک مرتبہ لندن کے ایک جلسے میں پروفیسر فتح محمد ملک نے راقم الحروف کے متعلق فرمایا تھا مجھے صحیح الفاظ یاد نہیں ہیں۔ لیکن ان کا مطلب یہ تھا جہاں کہیں اسپین کا ذکر آتا ہے تو یہ بی بی اشکبار ہو جاتی ہے۔
اور یہ واقعہ ہے کہ اسپین میرے لیے ایک بہت ہی اندوہ ناک موضوع ہے۔

تو ممتاز شیریں بھی تہذیبوں کے ذہنی اشتراک کی نمائندگی کرتی تھیں۔ میں وندھیا چل کے جنوب میں محض حیدرآباد، دکن اور کیرالا گئی ہوں۔ مجھے میسور اور دوسرے علاقوں کی واقفیت نہیں ہے لیکن اندازہ ہے کہ یہ بھی حیدرآباد کی دکنی تہذیب کے زیر اثر رہے ہیں۔ تمدنی اثرات بڑے ہی دوررس ہوتے ہیں۔ بمبئی میں ہماری کھانا پکانے والی خاتون حشمت بائی انعام دار کا نام ہی ملاحظہ کیجیے۔ وہ پونا کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد کا نام جمال کاغذی تھا چونکہ ان کے یہاں کاغذ بنایا جاتا تھا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ حشمت بائی نے کاغذ بنانے کا کیا طریقہ مجھے بتایا تھا۔ لیکن یہ یاد رہ ہے کہ وہ عورتیں اپنے چھوٹے بچوں کو تھوڑی سی افیم کھلا کر سلا دیتی تھیں اور پھر دن بھر کاغذ بنانے کا میٹریل اپنے پیروں سے کوٹتی تھی۔ اللہ — اللہ وہ کیسی کڑی محنت کی زندگی رہی ہوگی۔ اب آپ اس ملک کے تمدنی الواغوچن کا خیال فرمائیے۔ بائی مراٹھی لقب، انعام دار عہد مغلیہ کا ایک عہدہ جو اس وقت سے آج تک مہاراشٹر کے کئی ہندو کنبوں کا بھی خاندانی نام ہے۔ مغل تہذیب بھی کیا عظیم الشان، ہم گیر تہذیب تھی۔ بنگال سے لے کر راج کماری تک آپ کو ہندو کنبوں کے نام مغلوں کے دیئے ہوئے خطابات پر مشتمل ملیں گے۔ بنگال میں تعلقہ دار، مجمدار (یعنی مجموعہ دار)، سرکار، یعنی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ وغیرہ۔ گجرات میں منشی مہاراشٹر میں جاگیردار اور صوبے دار۔ یہ سب ہندوؤں کے خاندانی نام بھی بن گئے۔ ایک مشہور فلمی اداکار کے

مر ہٹی ڈرائیور کا خاندانی نام صوبے دار تھا۔ بتایئے کہاں مغل ایمپائر کے ایک صوبے کا وائے سرائے اور کہاں آج کے بمبئی کا خانگی ملازم۔ بمبئی ٹاکیز کے ایک کیرکٹر ایکٹر کا نام بھی جاگیردار تھا۔ لیکن نام کے سلسلے پھر ثابت کرتے ہیں کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔

اب ہم پھر ممتاز شیریں کی طرف لوٹتے ہیں۔ جنھوں نے پینگوئین نیو رائٹنگ کی ہو بہو تقلید کی اور اُسی زمانے سے لٹل میگزین شائع کرنے کا رواج بھی ہوا۔ لیکن ایسے رسالے بہت کم چلے۔ در اصل ہم اردو والوں نے ایک خیالی جنت آباد کر رکھی ہے۔ پانچ سو ایک یا ایک ہزار کتابوں کا اڈیشن شائع ہوتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں ساری دنیا نے ہماری تصنیف کا مطالعہ کر لیا ہے۔ ترقی پسند ادیب بڑے جوش و خروش سے عوامی ادب کی بات کرتے تھے۔ لیکن وہ عوام محض ان ہی کے طرح کے چند سو آرمڈ چیئر انٹلکچوئیل تھے۔ اصل عوامی ادب وہ تھا جو شمع اور بیسویں صدی میں شائع ہوتا تھا۔ اور اب تو وہ رسالے بھی کب کے بند ہو چکے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے اسکول کا وہ زمانہ یاد ہے۔ جب غیر منقسم ہندستان میں لاہور ایک انتہائی بارونق شہر تھا۔ جس میں مسلمان ہندو اور سکھ تینوں فرقوں کے جیالے نہایت جوش و خروش اور انبساط کے ساتھ اردو کی آب یاری کرنے میں مصروف تھے۔ ادبی رسالے نیرنگ خیال عالمگیر ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف اور ان کے ساتھ جہازی سائز پر چھپنے والے رنگ برنگے ہفتہ وار۔ جن میں سے ''چتر اویکلی'' مجھے اب تک یاد ہے۔ یہ عوامی رسالے بھی تھے اور ان میں سنجیدہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ لاہور مشہور کالجوں کا شہر بھی تھا جس میں گورنمنٹ کالج اور ایف۔ سی کالج یعنی فورمین کرسچین کالج آکسفورڈ یا کیمبرج کے کسی کالج کا درجہ رکھتا تھا۔ تینوں فرقوں کے اہم ترین دانش ور اسی کالج سے نکلے۔ ان کے علاوہ دیال سنگھ کالج اور اسلامیہ کالج بھی بہت مشہور تھے۔ لڑکیوں کا کنیرڈ کالج بھی لکھنؤ کے ازابلا تھوبرن کالج کی ٹکر کا ادارہ سمجھا جاتا تھا۔ دراصل امریکن مشنریوں نے سات سمندر پار انڈیا آکر علم کی روشنی بڑے انہماک سے پھیلائی۔ میرا خیال ہے کہ جتنی محنت اور جانفشانی سے انھوں

نے یہاں کالج اسکول اور ہسپتال قائم کیے اس کے لحاظ سے ان کو اتنے بپتسمہ حاصل کرنے والے نہیں ملے اگر ہندو یا مسلمان مشنری کسی دور دراز ملک میں جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے لیکن یہ یسوع مسیح کے مبلغین ڈٹے رہے اور آج بھی جنگلی قبائل ان کو مار ڈالتے ہیں لیکن ان کے جوش ایمان میں کمی نہیں آتی۔ میں نے ایک امریکن مشنری کالج میں پڑھا ہے۔ اور میں اس کی گواہی دیتی ہوں کہ کبھی ان امریکن خواتین نے بھولے سے بھی اپنے مذہب کی بات نہیں کی بلکہ اس کے برعکس ہندو اور مسلمان لڑکیاں بڑی دھوم دھام سے کالج میں عید اور دیوالی کے تہوار مناتی تھیں۔

دراصل یہ مغربی لوگ پڑھے لکھے ہیں انھیں معلوم ہے کہ وہ انیسویں صدی کب کی گذر چکی جب اہل مشرق گوروں سے مرعوب تھے اب وہ خود اپنی اپنی تہذیبوں پر بے حد نازاں و فرحاں ہیں، لیکن ان مشنریوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ گو اب انھیں اتنے کنورٹ نہیں ملتے لیکن وہ لوگ اپنے حسن سلوک، اخلاق، ضبط و نظم اور تعلیم کے اعلا معیار کی بدولت آج بھی اس برصغیر میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مثلاً مشنریوں نے ان غریبوں کو بپتسمہ دینے کے بعد انھیں صاف ستھرا رہنا سکھایا۔ انھیں تعلیم دی، اچھی تربیت کی اور وہ ایک عام ہندو یا مسلمان نفر سے بہتر شہری ثابت ہوئے۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ دہرہ دون میں ہمارا ایک ملازم جس کا نام دولت مسیح تھا کمروں کی صفائی کرنے کے بعد اپنے کوارٹر میں جا کر کپڑے تبدیل کرتا اس کے بعد ایک چوکی پر کھانا رکھ کر دو زانو بیٹھتا اور بہ آواز بلند کہتا اے ہمارے آسمانی باپ میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے آج کے دن اپنی وعدہ کی ہوئی روٹی مہیا کی۔ باپ بیٹا اور روح القدس کے نام پر آمین۔ کرسچن آیائیں ہماری ماماؤں اور اصیلوں کے مقابلے میں بے حد صاف ستھری ہوئی تھیں۔ جس ملک میں پانی کی اتنی فراوانی ہے وہاں صاف نہ رہنے کی عادت کی وجہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔ ہمارے باورچی خانے کیسے ہوتے ہیں — اللہ اکبر — اگر میں ان کے بارے میں کچھ لکھوں گی تو قارئین کرام خفا ہو جائیں گے۔ بہر حال یہ کہاوت بے بنیاد نہیں تھی کہ پکانے کی جگہ ہندوؤں کی اچھی۔ کھانے کی جگہ انگریزوں کی اچھی اور کھانا مسلمانوں کا اچھا۔

لیکن بہر حال روس، انگلستان، امریکا وغیرہ کے زیر سایہ ہی ہماری مختلف زبانوں کے ادب ترقی کرتے رہے۔ مشرق کی ساری کولونیل، تہذیب، اینگلو سیکسن ذہن کی بہت حد تک مرہون منت ہے۔ مجھ سے ایک بار ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا تھا کہ اگر کیٹس اور شیلے نہ ہوتے تو رابندر ناتھ ٹیگور بھی نہ ہوتے۔ اردو میں حکایات کا بہت بڑا خزانہ مغربی افسانے سے بالکل علاحدہ اور خود مختار سلطنت تھی۔ لیکن یہ روایت حکایات سے آگے نہیں بڑھی۔

ہر زمانے کا ادب اُس دور کی طرز معاشرت اور طریقۂ تعلیم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پردے کی روایت ہمارے مشرق کی ایک بڑی اٹل سماجی حقیقت رہی ہے۔ اب ہم نئی قوم پرستی کے جوش میں کتنا ہی کہہ لیں کہ ہماری عورتیں شہسواری کرتی تھیں۔ اعلا تعلیم یافتہ تھیں وغیرہ وغیرہ اس میں غلو کافی حد تک شامل ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کی عورتیں سماجی پابندیوں میں مقید تھیں۔ محض ارباب نشاط ان قیود سے آزاد تھے۔ اور ان ہی کے یہاں پیرس کے سیلون (Salon) کی طرح ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔ ارباب نشاط نے غزلیں بھی خوب خوب کہیں نوحے اور مرثیے بھی لکھے جنھیں وہ خود اپنے تعزیوں کے ساتھ پڑھتی ہوئی جلوس میں نکلتی تھیں یہ ایک پوری نہایت جان دار اور جگمگاتی ہوئی کلچر تھی۔ سوز خانی کلاسیکل راگوں میں کی جاتی تھی اور ساز کے بجائے مرثیہ خواں کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے دو افراد مسلسل تان لگاتے تھے جو بغیر سانس ٹوٹے تان لگانا ایک بے حد مشکل فن ہے۔ لیکن اہل لکھنؤ نے سوز خوانی کے فن کو بھی اعلاترین مرتبے تک پہنچا دیا۔ لکھنؤ کے علاوہ جون پور اور مراد آباد کے سوز خوان بھی آج تک بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

دراصل تعزیہ داری کے پورے رواج نے گائیکی کے علاوہ گھریلو صنعتوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ بھانت بھانت کے تعزیوں کی تیاری اور ان کی تزئین میں عجیب و غریب جدتیں شامل کی جاتی تھیں مثلاً گھاس کے تعزیے میں، بہت پہلے سے گھاس اور پودے بوئے جاتے تھے۔ ان رسوم کی ادائیگی ہزاروں افراد کی روزی روٹی کا وسیلہ بنتی ہے۔ چند سال قبل میں امروہے گئی وہاں ایک تعزیہ بنتا دیکھا جو دنیا کا سب سے اونچا تعزیہ ہے اسے سال بھر تک تیار کیا جاتا ہے اور شہر کے مفلوک الحال عقیدت مند اہل سنت روزانہ اس کی تیاری میں اپنا یوگ دان دیتے ہیں۔ محرم میں

جس روز یہ تعزیہ نکالا جاتا ہے۔ میونسپل بورڈ سے خاص اجازت لے کر ایک راستے کے تار اپنی جگہ سے منتقل کر دیے جاتے ہیں اس بلند ترین تعزیے کو عجائب عالم میں شمار کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے یہاں امر وہے سے باہر ہی بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں اور پریس اس سے بے نیاز ہے۔ البتہ شیعہ، سنی جھگڑے کی خبریں جلی حروف میں شایع کی جاتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارے یہاں زندگی کے ہر شعبے میں منفی سوچ کارفرما ہے۔ جبکہ اہل مغرب چار سو سال سے مثبت خیالات کے فوائد پہچان گئے ہیں۔

ہندستان کے محرم اور رام لیلا کے انتہائی جاذب نظر جلوسوں کی مثال ہمیں ایک حد تک مغرب کے رومن کیتھولک ممالک میں دکھلائی دیتی ہے۔ جہاں بی بی مریم کے مجسمے کا جلوس بڑی شان و شوکت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ بمبئی میں تعزیہ داری کی دھوم دھام دیکھ کر لوک مانیہ تلک نے گنپتی کے جلوس کا آغاز کیا۔ جو اب ایک بہت بڑے تہوار میں تبدیل ہو چکا ہے گنپتی کی مورتیاں بنانے والے کمہاروں کو اس کی وجہ سے بہت فائدہ پہنچا۔ دراصل ہندستان کے سارے تہوار عوام کے لیے فائدہ مند رہے۔ عید کے لیے سویاں بنانے والے، دیوالی کے مٹھائی فروش، ہولی کے لیے رنگ اور پٹاخے اور مٹی کے کھلونے بنانے والوں کی پوری انڈسٹری قائم ہے۔ شب برات کے لیے آتش بازی بھی اسی میں شامل ہے۔ رکشابندھن کے لیے رنگ برنگی راکھیاں بنائی جاتی ہیں۔ مغرب میں محض ایک کرسمس کیک۔

لیکن وہ لوگ اپنی اجتماعی زندگی کو نہایت سلیقے سے سجانا اور سنوارنا جان گئے ہیں۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی کو جی بھر کر بگاڑنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہولی اور محرم اگر ساتھ ساتھ پڑ جائیں تو پبلک سہم جاتی ہے کہ اب جانے کتنا سر پھٹول ہوگا۔

کیا محض جہالت اور غربت ہی اس بگڑی ہوئی اجتماعی نفسیات کی ذمہ دار ہے یا اس کی کوئی بنیادی وجوہ بھی ہیں؟ میں نے پہلے کہیں تذکرہ کیا ہے کہ ہماری والدہ کے ایک کزن جو ایک چھوٹی سی ریاست کے نواب تھے ان کے یہاں میں نے بچپن میں دیکھا ہولی کے روز ہلیارے رنگوں کی پچکاریاں لے کر زنانہ محل سرا کی ڈیوڑھی پر آئے اور ہماری بُو بُو کا دوپٹہ باہر بھیجا گیا جس پر

انھوں نے رنگ چھڑکا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہماری اس مرحوم تہذیب کی رواداری اور رونق کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیاست خواص و عوام کے ذہنوں پر مسلط نہیں ہوئی تھی۔ ریڈیو ناپید تھا۔ مواصلات کی اس ترقی نے راتوں رات دنیا بدل دی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر حکومت ہند نے اپنے پروپیگنڈے کے لیے ریڈیو کی نشریات میں زبردست اضافہ کیا۔ مجھے یاد ہے مرادآباد کے چوراہوں پر لاؤڈ اسپیکر لگ گئے جہاں سے آل انڈیا ریڈیو کی خبریں نشر کی جاتی تھیں۔ اور اس وقت تک عوام کی بھیڑ وہاں جمع ہو جاتی تھی۔ برادر معظم دہلی سے خبریں پڑھتے محلے میں غل مچ جاتا جلدی آؤ بھیئے چھنو میاں خبریں پڑھ رہے ہیں۔ گویا اب جدید ٹکنالوجی اور مواصلاتی نظام ہندستان تک پہنچ چکا تھا۔ ورنہ مجھے یاد ہے میرے بچپن میں پڑوس کے ایک انگریز کے بنگلے سے ریڈیو پر بی بی سی کی میوزک سنائی دیتی تو بہت افسانوی سی بات معلوم ہوتی۔ جنگ عظیم شروع ہوتے ہی حکومت نے اپنی نشریات گھر گھر پہنچا دی۔ ان ہی کے ذریعے پبلک میں بے داری کی ایک نئی لہر دوڑی۔ اس وقت کانگریس کی تحریک بھی اپنے عروج پہ تھی۔ اُسی زمانے کا یا اس سے ذرا پہلے کا مجھے ایک منظر اچھی طرح یاد ہے۔ بمبئی کے ایک ریلوے اسٹیشن پر میں والدہ کے ساتھ ٹرین کے کمپارٹمنٹ کی ایک کھڑکی میں بیٹھی ہوں گرے سوٹ میں ملبوس جناح صاحب اور شاید اسی رنگ کا سوٹ پہنے والد مرحوم کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے ہیں۔ اس وقت تک پاکستان کے مطالبے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ اور جناح صاحب قائد اعظم نہیں کہلاتے تھے۔

پشاور اور چٹاگانگ تب ہندستان ہی کے شہر تھے۔ اس کے چند سال بعد کالج میں ہماری ایک کلاس فیلو ریکھا چکرورتی کہا کرتی تھی وہ چھٹیوں میں اپنے وطن ڈھاکہ جارہی ہے۔ اس کے والد شاید چیف انجینئر تھے اور فیض آباد روڈ پر ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ ریکھا اب بحیثیت مسز مکھرجی شاید بمبئی میں رہتی ہے۔ جہاں اس کے شوہر ہندستانی بحریہ کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ڈھاکہ اب ریکھا کے لیے اس کا وطن نہیں رہا۔ زمانے کا دھن کیسی کیسی قلابازیاں کھاتا رہتا ہے۔ اور اگر دیکھا جائے تو فرق کسی چیز سے کچھ نہیں پڑتا۔

سلسلۂ روز و شب، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب، ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفی کائنات

ہماری ایک نہٹوری رشتے دار خورشید آپا ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک ایسی کوٹھی میں رہتی تھیں جس میں ولایتی گھروں کی مانند برآمدے نہیں تھے۔ اور وہ ایک چوکور سفید رنگ کا ایسا ڈبہ معلوم ہوتی تھی جسے کسی جن نے لاکر گھاس کے سمندر میں رکھ دیا ہو۔ خورشید آپا روز پیدل ہمارے پھاٹک کے سامنے سے گذرتی ہوئی یونی ورسٹی جاتی تھیں جہاں وہ قانون پڑھ رہی تھیں۔ ایک روز جب وہ ہمارے پھاٹک نمبر 21 کے سامنے سے گذریں تو انھوں نے دیکھا کہ والد مرحوم کے نام کا بورڈ ترچھا ہو گیا ہے انھوں نے سڑک سے نیچے اتر کر اس بورڈ کو پھر کیلوں سے جڑنا چاہا لیکن کیل بھی گر چکی تھی انھوں نے سوچا واپسی میں اُسے ٹھیک کر دیں گے لیکن وہ بورڈ پھاٹک کے سمنٹ میں دوبارہ جڑ نہ سکیں اور اپنی راہ پہ چلی گئیں۔ اس واقعہ کے دو تین روز بعد ہی ابا جان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ابھی چند ماہ قبل ایک امریکن نما لڑکی اپنی ایک دوست کے ساتھ نہٹور پہنچی اور وہاں اس نے کہا کہ وہ اپنی روٹس کی تلاش میں آئی ہے۔ نہٹور کے بعد وہ لکھنؤ بھی گئی اور اپنی اس کوٹھی کو دیکھا جس میں تقسیم سے قبل اس کی والدہ اور ان کا خاندان رہتا تھا۔ امریکا میں وہ لڑکی ہارٹ سرجری کی ماہر کی حیثیت سے بوسٹن میں کام کرتی ہے خورشید آپا اور ان کا خاندان تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا تھا۔ خورشید آپا پشاور کے کسی کالج میں پڑھانے لگیں وہیں ان کی شادی ایک سرحدی

پٹھان سے ہوئی۔ یہ لڑکی اب کافی عرصے سے امریکا میں رہتی تھی۔ جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئی تو مجھے اس کی والدہ یعنی خورشید آپا کا وہ سارا واقعہ یاد آیا جو انھوں نے والد مرحوم کے نام کی تختی کے متعلق بتایا تھا۔ اس قسم کے واقعات کی کوئی منطق نہیں۔ جس رات بمبئی میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا۔ اس سے کچھ دیر پہلے انھوں نے مجھے آواز دے کر بلایا تھا اور کہا تھا خالہ آئی ہیں کتنی دیر سے کھڑی ہیں ان کے لیے کرسی لاؤ۔ یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ ہماری نانی کا بہت جلد انتقال ہو گیا تھا اور ان کی اولاد کو ان کی خالہ نے پالا تھا۔ جو ان کی نانی بھی تھیں۔

دو سفید گھوڑوں کا میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں۔ میری فرسٹ کزن اچھو یعنی خالدہ حیدر کا نیو ریارک میں انتقال ہوا وہاں کے مشہور قبرستان Whispering Hollow میں اس کو سپرد خاک کیا گیا۔ وہاں دوسری قبر لاہور سے آئی ہوئی ایک بیگم صاحبہ کی تھی جن کا نام مجھے اب بھی یاد نہیں۔ اس سارے شہر خموشاں میں صرف یہ دو مزار مسلمانوں کے تھے۔ جس روز میں اچھو کے بھائی پارے یعنی پروفیسر صلاح الدین حیدر اور اچھو کی بیٹی زیبا کے ہمراہ اچھو کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئی تو وہاں کچھ فاصلے پر دو نہایت شاندار سفید گھوڑے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ عرصے بعد ہندستان واپسی پر میں عیش باغ لکھنؤ میں والد مرحوم کی مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے گئی تو وہاں بھی نہایت شاندار دو سفید گھوڑے دوڑتے ہوئے سامنے سے نکل گئے۔ میری سمجھ میں یہ آج تک نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا تھا۔ شیکسپیئر صاحب تو بہر حال کہہ گئے ہیں کہ دنیا میں بہت سی چیزیں تو ایسی ہیں جن کی توضیح نہیں کی جا سکتی۔

ابا جان کے انتقال کے بعد ہم لوگ دہلی آئے۔ جہاں بھائی کو آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی ملازمت مل گئی تھی۔ اس سلسلے میں چند واقعات کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔ بھائی انڈین ریلویز کی اعلا ترین ملازمت کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو گئے تھے اور جمال پور میں تعینات تھے وہاں انگریز افسر اعلا کی کسی اہانت آمیز جملے پر اُسے ایک زوردار طمانچہ رسید کیا اور فوراً اس کے کمرے سے نکلے اور نزدیک سے گذرنے والی ایک مال گاڑی کا ہینڈل پکڑ کر اس کے پائدان پر کھڑے ہو گئے اور اُسی طرح جمال پور سے نکلے۔ رات آئی تو وہیں کھڑے کھڑے کچھ

دیر کے لیے سو بھی گئے اور بہر حال لکھنؤ واپس پہنچے۔ یہ سارا واقعہ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں دہرانے کی ضرورت نہیں — نہ جانے کیوں اس انگریز نے اس واقعے کی رپورٹ نہیں کی اور تین سال بعد پھر آل انڈیا ریڈیو کے سنٹرل نیوز آرگنائزیشن میں بہ طور نیوز ریڈر اُن کا تقرر ہو گیا۔ لیکن ایک قصہ جو حال ہی میں بھائی نے مجھے کراچی میں سنایا وہ بھی یہ تھا کہ ایک اعلا ملازمت کے لیے ان کا تقرر ہونے والا تھا لیکن فائنل انٹرویو میں جانے کا وقت نکل گیا انھیں یاد نہیں رہا اور وہ بیٹھے دوستوں کے ساتھ شاید امپیریل ہوٹل میں تاش کھیلتے رہے۔ والدہ کے ساتھ میں بھی لکھنؤ سے دہلی آ گئی اور ہم لوگوں نے کچھ عرصہ ابا جان کے قریبی دوست مشتاق احمد زاہدی کے یہاں قرول باغ میں قیام کیا۔ وہاں ایک روز حکیم یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال اماں کے پاس تعزیت کے لیے آئے۔ مجھے وہ دھندلے سے یاد ہیں۔ شیروانی میں ملبوس اور شاید چگی داڑھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا اب قلم آپ کے ہاتھ میں آیا ہے آپ کچھ لکھیے۔ میں نے اطمینان سے جواب دیا ضرور لکھیں گے۔ چنانچہ میں نے ایک افسانہ بہ عنوان ''یہ لوگ'' رقم کیا۔ اگر وہ موجود ہوتا تو اسے طرز جدید کے اولین افسانوں میں شمار کیا جاتا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ ایک خیالات کے بہاؤ پر مشتمل افسانہ تھا۔ جسے آج کل شعور کی رو کہا جاتا ہے۔ (اور یہ اصطلاح جو اسٹریم آف کون سس نس کا اردو ترجمہ تھی سب سے پہلے غالباً ممتاز شیریں نے استعمال کی تھی جو مزاجاً ایک سیدھی سادی ہاؤس وائف لیکن اصلاً ایک بقراط خاتون تھیں) یہ افسانہ میں نے لاہور بھیجا لیکن اس کا مسودہ اور نیرنگ خیال کا سارا دفتر اچانک نہ جانے کس طرح غتر بود ہو گیا ایسے شاندار اور تاریخ ساز رسالے کا یہ انجام بہت افسوسناک تھا۔ مجھے یاد ہے جہازی سائز کے نیرنگ خیال میں مغربی پینٹنگز ٹشو پیپر سے محفوظ اس رسالے کی شان دوبالا کرتی تھیں۔ والد مرحوم کا ایرانی ناول کا ترجمہ ہما خانم بھی اس میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور والدہ کے افسانے بھی اس میں چھپا کرتے تھے۔ ''مس حجاب اسماعیل از مدراس'' کی کہانیاں بھی نیرنگ خیال کی خصوصیت تھیں۔ جس طرح ہماری والدہ اپنی شادی سے قبل بہ طور ادیبہ اپنے وقت کی Infant Terrible رہی تھیں اُسی طرح حجاب اسماعیل اُس زمانے کی اسی نوع کی ایک خاتون تھیں۔

1935 میں سر محمد یعقوب اور والد مرحوم کے ذریعے حجاب اسماعیل کی شادی کا رشتہ امتیاز علی تاج سے طے ہوا۔ وہ زمانہ اتنا دقیانوسی نہیں تھا جتنا آج کی نسل اُسے تصور کرتی ہے۔ ملک کے اوپری متوسط اور بالائی طبقے میں نیم انگریزی طرز معاشرت کافی عرصے سے موجود تھی، کافی تعداد میں مسلمان خواتین پردہ ترک کر چکی تھیں۔ ہماری والدہ نے 1920 میں پردہ چھوڑا اور اپنے ساتھ کی خواتین کو پردے سے نکالنے کی مہم شروع کی جس میں وہ کامیاب رہیں۔ 1920 میں پردہ ترک کرنے کی وجہ یہ تھی کہ مصطفٰی کمال پاشا نے ترکی میں پردہ حکماً غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ والد مرحوم جو ترکی کے بے حد دلدادہ تھے انھوں نے بھی اماں سے کہا کہ اب تم بھی پردہ سے نکلو۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

آج عرصۂ دراز سے ترکی ایک بیک نمبر ہے۔ اب عربوں کا بول بالا ہے۔ اور خاص طور پر سعودی عرب جو بہت ہی قدامت پرست لوگ ہیں اس وقت خالدہ ادیب خانم بھی ہندی مسلمان قوم کی ہیروئن تھیں۔ وہ ہندستان بھی تشریف لائی تھیں مسلم یونی ورسٹی میں ان کی تقریر کی ترجمانی کرنے کے لیے والد مرحوم کو بلایا گیا تھا۔ اور وہ بے حد خوش خوش اتا دے سے علی گڑھ گئے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ رات کو خالدہ خانم کے کمرے میں انگیٹھی کا انتظام نہیں تھا۔ انھوں نے کہا فائر کوئی نہیں سمجھا۔ پھر انھوں نے کہا آتش کوئی بھلا کیا سمجھتا۔ کوئی کسی کو فوراً بلا کر لایا۔ خالدہ خانم بمبئی میں عطیہ فیضی کے یہاں مقیم تھیں وہاں انھوں نے ایک بنگلوری رقاصہ اینٹ گزل کا رقص انھیں دکھایا۔ اینٹ جو بہت عرصے بعد کراچی میں میری بہت اچھی دوست بنی ہمیشہ فخر یہ کہتی تھی کہ خالدہ خانم نے ان کا نام آزوری رکھا۔

''یہ لوگ'' تو غائب ہو گیا۔ لیکن اگلا افسانہ ''ایک شام'' میں نے وہیں چچا زاہدی کے یہاں لکھا اور ان کو سنایا تو انھوں نے کہا کہ اپنا نام بدل دو۔ کسی کو یقین نہ آئے گا کہ اتنی کمسن لڑکی نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ لہٰذا میں نے لالہ رخ کے فرضی نام سے وہ افسانہ ادیب میں بھیجا اور وہ شایع ہوا یہ رسالہ فصیح الدین احمد نکالتے تھے۔

دوسرا افسانہ ارادے بھی میں نے شاید چچا زاہدی کے یہاں ہی لکھا تھا۔ یہ بھی رسالہ

ادیب میں چھپا۔ چنانچہ ایڈیٹروں کی طرف سے افسانوں کی فرمائش کے خط آنے لگے۔ اور میں نے انھیں افسانے بھیجنے شروع کیے اور ایک بھی افسانہ واپس نہیں آیا نہ اس میں کسی نے ترمیم و تنسیخ کی۔ کافی افسانے چھپ گئے تو ایک دن صادق الخیری صاحب میرے پاس تشریف لائے اور مصر رہے کہ میں ان افسانوں کا مجموعہ ان کے ادارے "خاتون کتاب گھر" سے شائع کراؤں۔ میں راضی نہیں ہوئی۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ یہ بہت قبل از وقت بات ہے۔ یہ افسانے اتنی بے وقوفی کے ہیں کہ لوگ کتاب پڑھ کے ہنسیں گے۔ ترقی پسندوں کا مجھ پر بہت رعب طاری تھا۔ کرشن چندر، بیدی، عصمت آپا، گو میں نے کبھی ان کے انداز میں لکھنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں اپنی بے وقوفیوں ہی میں مگن تھی۔ ترقی پسندی کے جوش میں ان ادیبوں نے ملک کے اوپری طبقات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ ان کے بارے میں کچھ لکھا جائے گویا وہ انسان ہی نہیں تھے۔ کوئی نہایت ہی نا قابل معافی مجرم تھے۔ لیکن بہت جلد یہ جوش و خروش ذرا کم ہوا۔ مغرب میں بھی صنعتی انقلاب کے بعد دانش ور طبقہ اور لکھنے والے زیادہ تر نئی مڈل کلاس میں پیدا ہوئے۔ چونکہ وہ نئے حالات اور زندگی کی مختلف النوع جدو جہد سے واقف تھے۔ کاؤنٹ اور لارڈ اور ڈیوک قسم کے افراد آپ کو مشہور اہلِ قلم ذرا کم ہی ملیں گے۔ انگلستان اور امریکا کا زیادہ تر ادب مڈل کلاس نے تخلیق کیا۔ وہاں کی زندگی میں کہیں زیادہ گہما گہمی تھی۔ بے شمار مواقع لکھنے والوں کے لیے موجود تھے۔ ایشیا افریقہ اور آسٹریلیا کے باسیوں کی زندگی ان کے لیے رنگا رنگ موضوع فراہم کر رہی تھیں۔ ہمارے یہاں ہر ہندستانی زبان میں بنیادی صنف ادب شاعری تھی۔ کمپنی کے تسلط کے بعد بنگال اور صوبہ جات مدراس و بمبئی میں انگریزی رائج ہوئی۔ اچانک ہماری نئی مڈل کلاس کے سامنے کھل جا سم سم بے شمار دروازے کھل گئے۔ کولونیل مشرق عہد جدید میں داخل ہوا۔ انگریز اٹھارھویں صدی کی روشن خیالی اور لبرل ازم اپنے ساتھ لے کر ہندستان آئے تھے میں کلکتہ اور بمبئی کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کتب خانوں سے واقف ہوں۔ ان کے بانی وکٹوریل انگریزوں نے گویا جہاں تک ممکن تھا پوری برٹش میوزیم لائبریری اٹھا کر کلکتہ اور بمبئی منتقل کر دی تھی۔ انھیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یہ کتابیں پڑھ کر یہ Native لوگ ہم سے باغی ہو جائیں گے۔ انھیں اپنی تہذیب اور اپنی

روشن خیالی پر اتنا اعتماد تھا۔ چنانچہ انھوں نے جو کالج اور یونی ورسٹیاں قائم کیں وہ بے شک امپیریل ازم کے قلعے تھے۔ لیکن انھوں نے اس علمی ذخیرے کی فیض رسانی میں بخالت اور کنجوسی نہیں دکھائی۔ انگریزی تعلیم حاصل کر کے بنگالی بابو، مدراسی اور مہاراشٹرین سب کالے انگریز بن گئے۔ لیکن یہ عمل ناگزیر تھا۔ عہد مغلیہ میں فارسی داں، کائستھ تمدنی لحاظ سے آدھے مسلمان کہلانے لگے تھے۔ بلکہ دہلی کے ایک قدیم کائستھ گھرانے کی خواتین جو میری پرانی دوست ہیں آج تک کہتی ہیں کہ ہمیں آدھا مسلمان پکارا جاتا تھا۔

کلچر ٹرانسفر کا یہ عمل دو تہذیبوں کے ٹکراؤ اور بعد میں اُس کے میل جول کے اثر کا لازمی نتیجہ ہے۔ خود آج کے اہلِ ہندو پاک و بنگلہ دیش کے لوگوں کو دیکھیے ہمارے پڑھے لکھے خوش حال طبقے کی کلچر کیا ہے۔ ہم کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ جو کولونیل دور کی ایک یادگار ہے۔ ہمارے لباس خالص ہندستانی نہیں رہے۔ ہماری زبان میں انگریزی شامل ہوگئی۔ ہماری سوچ بدل گئی۔ ہم تھینک یو کہنے لگے۔ یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کا اب ہم نوٹس نہیں لیتے۔ لیکن یہ سب انگریزی کولونیل کلچر کی دین ہے۔ کھانا نہ اب ہم چوکے پہ کھاتے ہیں نہ فرخ آبادی چھاپے کے دسترخوان پر۔ کھانے کے لیے میز کرسی ضروری ہے۔ اب دیکھیے جب مسلمان ہندستان میں آئے تو ان کی طرزِ معاشرت نے بھی مقامی تہذیب کو اسی طرح متاثر کیا۔ البتہ ایک چیز جس کی وجہ سے دونوں فرقوں میں اجنبیت قائم رہی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے سے ناواقف رہیں۔ ہندو اور مسلمان مرد بازار میں ایک دوسرے سے ملتے تھے اور ان میں ایک نوع کی مشترکہ تہذیب بھی نمایاں ہوگئی تھی۔ لیکن عورتیں ہندو اور مسلمان زنان خانوں میں محصور تھیں۔ فقط مہریاں، کہارنیں وغیرہ دونوں ہندو اور مسلمان باہر آتی جاتی تھیں۔ چنانچہ زنان خانوں کی اس دوری نے مغائرت قائم رکھی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان عورتوں نے بہت سے ہندو رسم و رواج اختیار کر لیے۔ البتہ مشن اسکولوں اور کانونٹ اسکولوں میں پڑھنے والی معدودے چند ہندو اور مسلمان لڑکیاں ایک دوسرے سے واقف تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب ماسٹر پریم سنگھ سریواستو نے قیصر باغ میں اپنا بنارس ایڈمشن گرلز اسکول قائم کیا تو وہ شمالی ہند کی اس رنگا

رنگ مخلوط کلچر کا ایک مثالی ادارہ تھا۔ جس کوٹھی میں وہ اسکول کھولا گیا تھا وہ کمپنی کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس کے موجودہ کرایے دار پریتی سنگھ ایک مرنجا مرنج بے حد شائستہ اردو دان کائستھ تھے یہ بہت ہی ذیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی کبیر پنتھیوں کی طرح نانک پنتھی تھے۔ اور اس زمانے کی کلچر کے مطابق اپنے اپنے مذہبی عقائد کا تذکرہ بالکل نہیں کیا جاتا تھا اور یہ غالباً انگریزی تہذیب کا اثر بھی تھا۔

''خوابوں کے محل'' کے متعلق مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے پاس ''پرکاش پنڈت'' کا خط آیا جو اس طرح شروع ہوتا تھا۔ محترمہ رفیقہ آپ کا افسانہ ''خوابوں کے محل'' گو اس کا عنوان بورژوائیت لیے ہوئے ہے لیکن بہت اچھا ہے۔ یہ افسانہ رسالہ ادب لطیف میں ستمبر 1944 میں شائع ہوا تھا۔ ''دھندلکوں کے پیچھے'' ساقی جنوری 1945 میں شائع ہوا تھا اور ساقی میں شائع ہونے والا غالباً یہ میرا پہلا افسانہ تھا۔

عالم گیر بھی ایک جہازی سائز کا رسالہ تھا اور اس میں بھی شاید یورپین تصویریں چھپا کرتی تھیں۔ اس رسالے میں میرا افسانہ ''میری گلی میں ایک پردیسی'' شائع ہوا تھا۔ یہ سارے افسانے اس نئے اوپری متوسط طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جو اس صدی کے آغاز سے ملک کے وسیع وعریض ریوالونگ اسٹیج پر نمودار ہو چکی تھی۔ گول گھومنے والی یہ اسٹیج رنگ برنگے مناظر پیش کر رہی تھی چونکہ اس میں مختلف صدیاں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ زیادہ تر سماج ابھی تک بہت پسماندہ اور افلاس زدہ تھا۔ نیا متوسط طبقہ ملک کی معاشرتی اور سیاسی قیادت سنبھال چکا تھا اور اس لحاظ سے یہ اپنے آقا انگلستان کا پیرو تھا۔ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ تہذیبی اشتراک نے نئی زبانوں اور نئے طرز حیات کو جنم دیا تھا۔ زبانوں کے متعلق تو ہم ماہر لسانیات سے کافی کچھ تحقیق کر چکے ہیں۔ لیکن طرز زندگی میں جس طرح اشتراک رہا اور اس کے ساتھ ساتھ دوری بھی قائم رہی ان کے بنیادی وجوہات پر ابھی تک زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہندو کاسٹ سسٹم اور چھوت چھات اور مسلم پردہ سسٹم ان دو حد بندیوں کی وجہ سے سارے مسائل پیدا ہوئے۔ ہندو تو اکثر ایک دوسرے کے ساتھ بھی مل بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مسلمان کے یہاں اس کے

برعکس شادی بیاہ کی دعوتوں میں ایک بڑی سینی میں پلاؤ کا ٹیلہ بنا دیا جاتا تھا اور اس کے چاروں طرف بیٹھ کر اُسی سینی میں تھوڑا تھوڑا چاول نکال کر نوش کیا جاتا تھا۔ اب ان تہذیبوں میں بعد المشرقین ہے لیکن گذشتہ صدیوں میں جیو اور جینے دو کی روایت بھی حاوی رہی۔ چنانچہ ہندوؤں کی چھوت چھات کا مسلمان بُرا نہیں مانتے تھے۔ کیونکہ ان کے یہاں خود میں نے دورِ حاضر میں اپنے اسکول میں دیکھا ایک لڑکی ہاتھ سے چلّو بناتی تھی اور دوسری ہندو لڑکی اوپر سے گلاس کا پانی اسی چلّو میں انڈیل دیتی تھی۔ چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی کہاوت بھی شاید اسی طرح چلّو بھر پانی پینے کے رواج سے شروع ہوئی ہوگی۔ جیسا کہ میں نے ابھی لکھا کہ چھوت چھات کا بُرا نہیں مانا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے والد مرحوم کے ایک بہت ہی کٹر برہمن لنچ کے لیے تشریف لائے تو ان کی ساری خاطرداری ہمارے ایک برہمن چپراسی جمنا پانڈے نے کی۔ باہر باغ میں چولہا بنایا اور مجھے یاد نہیں برتن کہیں سے منگوائے گئے تھے یا گھر ہی کے تھے۔ بہر حال ہماری والدہ نے ''سیدھا'' یعنی دال چاول، آٹا وغیرہ نکلوا کر دیا۔ مہمان گرامی نے ہاتھ کے علاوہ پاؤں بھی دھوئے۔ حالانکہ ان بے چارے کو میز کرسی پر بیٹھنا تھا۔ ہمارے والدین بھی اُسی میز پر بیٹھے لیکن کھانا عبدل بیرے کے بجائے جمنا پانڈے مہاراج نے Surve کیا۔ چند سال قبل دہلی دوردرشن پر پرانی دلی کے ایک بزرگ نے جو چوگوشیہ ٹوپی اور فرغل میں بالکل مرزا غالب کے ہم عصر معلوم ہو رہے تھے انھوں نے فرمایا کہ پہلے ہندو اور مسلمانوں کے کھانے الگ الگ تھے دل ایک تھے۔ اب کھانے ایک ہیں اور دل الگ ہوگئے ہیں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اور ہمارے چچا مشتاق احمد زاہدی جو برابر یہی کہتے تھے کہ پھوٹ ڈلوانے کی یہ ساری کارروائی انگریز کی ہے۔ چچا زاہدی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دہلی کے ایک قدیم خاندان کے فرد تھے۔ وہ بہاول پور کالج کے پرنسپل رہے اور وہیں سے ریٹائر ہوکر دہلی واپس آئے جہاں انھوں نے قرول باغ میں ایک کوٹھی خریدی جس کا نام ترکی نام پر انھوں نے ''کوشک'' رکھا۔ چچا زاہدی دم دم دہلوی کے نام سے رسالہ عصمت میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ 1947 کے فسادات میں وہ بھی کراچی گئے اور ان کے فرزند آصف زاہدی نے وہاں وکالت شروع کی آصف بھائی کی ایک لڑکی پروین حکیم کینیڈا میں ہے۔

پچھلے دنوں وہ یہاں آئی تھی۔ نہ جانے چچا مرحوم کے پوتے نواسوں کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ چچا زاہدی کے سارے مضامین کا مجموعہ شایع کرادیں۔ کیسے کیسے موضوعات پر انھوں نے لکھا۔ وہ دہلی کی عظیم الشان تہذیب کے آخری نمایندوں میں سے تھے۔ چچا کی نسل کے لوگ کب کے رخصت ہوئے۔ مجھے سنہ یاد نہیں لیکن میں رات کی فلائٹ سے کہیں باہر سے کراچی آئی تھی۔ اور والدہ مرحومہ کو ایئرپورٹ سے فون کیا تھا تو انھوں نے کہا تھا کل بھائی زاہدی کا انتقال ہوگیا۔ تو مجھے بڑا دھکا سا لگا۔ چونکہ والد مرحوم کے ساتھ کے لوگ اب ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے اور یہ شاید اس نسل کے آخری بزرگوں میں شامل تھے۔

اگست 1947 میں چچا کا نادر کتب خانہ لٹ گیا پارک سائیڈ نارتھ میں ان کا کشادہ گراؤنڈ فلور فلیٹ بھی تباہ ہوا اور وہ مع خاندان پرانے قلعے گئے اور وہاں سے کراچی۔ گویا انگریز کی کارستانی کا آخری منظر بھی انھوں نے دیکھ لیا۔ اسی پارک کے دوسری طرف چودھری خلیق الزماں کے بھائی ڈاکٹر سلیم الزماں رہتے تھے جو ایک سائنس داں تھے۔ ان کی بیوی جرمن تھیں۔ وہ لوگ بھی پاکستان گئے۔ لیکن کراچی میں زاہدی کی اندرونی تنہائی اور شکستہ دلی دیکھی نہ جاتی تھی۔ بس وہ یہی دہراتے تھے یہ سب انگریز نے کروایا ہے۔ یہ سب انگریز نے کروایا ہے۔ کاش کوئی اس جنتی بزرگ کے مضامین یکجا کر کے چھپوا دے۔

چنانچہ قصہ مختصر یہ کہ میں نے چچا زاہدی مرحوم کے کہنے پر بچوں کے بجائے بڑوں کے رسالوں میں لکھنا شروع کیا۔ کیونکہ بہر حال اب میں بھی کالج میں پہنچ چکی تھی۔ ''ستاروں سے آگے'' کے زیر عنوان جناب صادق الخیری نے ان افسانوں کا مجموعہ 1947 میں ''خاتون کتاب گھر'' دہلی سے شایع کیا۔ لیکن اُسی زمانے میں دہلی میں قیامت صغرا برپا ہوئی۔ چچا زاہدی کا کتب خانہ بھی لٹ گیا خاتون کتاب گھر بھی تباہ ہوا اور وہ سب لوگ کراچی چلے گئے ہم لوگ دہرہ دون سے لکھنؤ واپس آئے جہاں مکمل امن وامان قائم تھا اور سروجنی نائیڈو بحیثیت گورنر یوپی گورنمنٹ ہاؤس میں مشاعرے منعقد کروا رہی تھیں یہ ساری داستان میں ''کار جہاں دراز'' ہے میں لکھ چکی ہوں۔ اماں دہرہ دون سے روانگی سے قبل آشیانہ کے کچھ حصے کی مرمت بھی کروا چکی تھیں۔

کیونکہان کا ارادہ اس وقت تک ہجرت کا نہیں تھا۔ لیکن اُسی زمانے میں مشہور انگریز صحافی بریگیڈیئر ڈیز من ینگ کا کراچی سے بھائی کے پاس تار آیا کہ فوراً آجاؤ۔ چنانچہ بھائی وہاں چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد ہم بھی لکھنؤ سے دلّی پہنچے۔ رفیع احمد قدوائی کے یہاں قیام کیا جن کے یہاں اس وقت فسادات سے پناہ لینے کے لیے سعیدہ آپا یعنی بیگم سعیدہ رضا اور چند اور افراد بھی موجود تھے۔ گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را۔ مردلا سارا بھائی ایک ڈکوڈا لے کر مغویہ ہندو اور سکھ عورتوں کو لاہور سے انڈیا لانے والی تھیں۔ اس ڈکوڈا میں قدوائی صاحب نے ہم لوگوں کو یعنی والدہ، بھائی، بھابھی اور مجھ کو لاہور روانہ کر دیا۔ بھائی کراچی سے لکھنؤ آگئے تھے۔ اس سفر میں دلی سے لاہور اور اس کے بعد لاہور میں چند روزہ قیام کا تذکرہ میں کار جہاں میں مختصراً کر چکی ہوں۔ البتہ ایک بات جو میں نے نہیں لکھی تھی وہ یہ تھی کہ ہمارے ایک جاننے والے جو ہم لوگوں سے ملنے کے لیے ہماری جائے قیام پر آئے انھوں نے بڑی ہی شگفتگی کے ساتھ کہا سکھوں کے جانے سے فنون لطیفہ کا بہت نقصان ہو گیا یہ ایک بہت ہی بے رحم ریمارک تھا۔

اس مجموعے کے سارے افسانے پہلی مرتبہ کتابی شکل میں شایع ہو رہے ہیں۔ میں نے انھیں پہلے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ اس میں پہلا افسانہ جو 1943 میں شایع ہوا تھا بہ عنوان ''ایک شام'' اس وقت سے لے کر آج تک کا افسانوی سفر بہت طویل ہے۔ اس دوران میں ترقی پسند، جدیدیت، تجریدیت وغیرہ وغیرہ کی دھومیں مچیں۔ لیکن یہ بندی ان ساری دھوم دھام سے بے نیاز اپنی ڈگر پر چلا کی۔ مجھے افسانوں کے تکنیکی رموز و نکات نہ اس وقت سمجھ میں آتے تھے اور نہ آج میرے پلّے پڑتے ہیں۔ دراصل لیکھک اور نقاد دونوں کے منصب مختلف ہیں۔ بہت کم نقاد اچھے افسانہ نگار بھی ثابت ہوئے ہیں۔

میرے ان افسانوں میں ہندستان کے بہت وسیع اور رنگا رنگ مناظر کی جھلکیاں آپ کی مل جائے گی۔ چونکہ میری اپنی زندگی بچپن سے لے کر آج تک ایک ہی وسیع گویا ریوالونگ اسٹیج پر گذری ہے۔ پرانی طرز معاشرت اور جدید' کولونیل انگریزی تہذیب دونوں میرے خاندانی اور سماجی پس منظر میں شامل رہی ہیں۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے ہندستان میں جو دو رنگی

معاشرت کی تخلیق ہوئی میں نے بھی اسی دور کے آخری زمانے میں جنم لیا۔ برطانوی کولونیل دور صنعتی انقلاب کے بعد دنیا کا سب سے روشن خیال اور وسیع النظر تمدن کا دور تھا۔ جنوبی افریقہ میں گوری اقوام نے ایک بدترین کلر بار قائم کی۔ ڈچ سلطنت جو جزائر شرق الہند میں قائم ہوئی وہاں کی محکوم آبادی دور حاضر تک بے حد پسماندہ رہی۔ انگریزوں نے جو اپنی اٹھارھویں صدی کی لبرل ازم یعنی آزاد خیالی کے نقیب تھے انھوں نے ہندستان پہنچ کر اس ملک کو ازمنہ وسطیٰ کی تاریکی سے نکالا ہم اس حقیقت کو نئی قوم پرستی کے جوش میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انگریزوں کی لائی ہوئی نئی روشنی نے ہندستان میں جدید زبانوں کو فروغ دیا۔ صحافت اور ادب اور تعلیم نسواں کے ذریعے اُس دور جدید کی داغ بیل پڑی جس میں آج ہم موجود ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر تک عورتوں کی کیا حالت تھی بالخصوص مسلمان عورتیں کیسی قید و بند کی زندگی گذار رہی تھیں۔ لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چند مصلحین ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے 'تعلیم نسواں' کی تحریک بھی شروع کی اور ایک حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ پردہ نشین عورتوں کی کتنی بڑی تعداد نے ان مصلحین کی آواز پر لبیک کہا۔ وہ یقیناً بڑی باہمت خواتین تھیں لیکن دراصل یہ ان کے سرپرست مردوں کی روشن خیالی تھی جس نے ان کو نہ محض لکھنے پڑھنے بلکہ رسالوں میں مضمون لکھنے کی اجازت بھی دی۔ لیکن چند بہت ہی ستم رسیدہ عورتوں نے مسیحی مبلغین کو اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ اور وہ عیسائی ہوگئیں۔ اس وجہ سے تعلیم نسواں کی تحریک کو بہت نقصان پہنچا۔ ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ ہم نہ کہتے تھے لڑکیاں کرسچن ہو جائیں گی اور تو اور علامہ اقبال جیسے مفکر اور دانش ور نے اپنے مزاحیہ کلام میں فرمایا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈراما دیکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اکبر تو پہلے ہی بہت خلاف تھے۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کے پردے کو کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

لیکن اسی زمانے میں یعنی بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مس نذر الباقر اور ان کی چند ہم خیال لڑکیوں نے آزادی نسواں کے متعلق لکھنا شروع کیا جو بڑی ہی ہمت کی بات تھی۔ مگر یہاں بھی کلاس کا معاملہ سامنے آتا ہے مس صاحبہ کے والد آبائی وطن لکھنؤ اور مراد آباد سے بہت دور بہ سلسلۂ ملازمت صوبہ سرحد میں مقیم تھے۔ ہندستان میں انگریز کی تخلیق کردہ نئی بورژوازی اب خوب ترقی کر رہی تھی۔ ہندستانی شہر اب تین حصوں میں منقسم تھے۔ پرانے دقیانوسی گنجان آبادی والے محلے، پھر پولس لائنز پھر سول لائنز، اور چند شہروں میں انگلش چھاؤنی۔ اب یہاں ہار یکی یہ تھی کہ ہندو مہاجن اب نیا پروپٹی ڈیلر بھی بن گیا تھا۔ سول لائنز میں کوٹھیاں بنوا کر وہ انگریزوں اور ہندستانی عہدے داروں کو کرایے پر دیتا تھا۔ لیکن خود اپنے سنگلاخ دیواروں والے محلوں میں رہتا تھا اور اس کی آنگنوں کی چھتوں پر بھی مزید حفاظت کے خیال سے لوہے کے جال تنے رہتے تھے تاکہ چور اندر نہ کود آئیں۔ اُسی زمانے میں سرکاری اسکولوں میں تو ہندو اور مسلمان بچوں نے ساتھ پڑھا لیکن دھرم سماج، آریہ سماج اور اسلامیہ اسکول وغیرہ مدارس میں دونوں فرقوں کے بچے الگ الگ ذہنی راہوں پر نکل چلے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہندستان کی ترقی یا اس کے پرابلم کا موازنہ دوسرے ملکوں سے اس لیے نہیں کر سکتے کہ وہاں کی آبادیاں حد سے حد چار پانچ کروڑ یا اس سے بھی کم تھیں۔ جبکہ ہماری آبادی اُس وقت بیس کروڑ تھی۔ بے شمار فرقے، طبقے، شہر، قصبے، گاؤں، انسانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ اللہ اکبر۔ اتنی بڑی آبادی کے مسائل بھی اتنے ہی گوناگوں اور بوقلموں تھے۔ شمال مغرب کے کلچر کا کوئی واسطہ جنوبی ہند سے نہیں تھا۔ شمالی ہند کا ایک عام باشندہ جنوب کے سارے ہندستانیوں کو مدراسی پکارتا تھا۔ زیادہ تر لوگوں کو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ بنگال کی کتنی بڑی اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ہر بنگالی کو ہندو سمجھا جاتا تھا۔ خود یوپی میں ہندو اور

مسلمان لڑکیاں اسکولوں میں ایک دوسرے سے متعارف ہوئیں۔

اس مجموعے کے افسانوں میں ہندوستان کے اُسی عبوری دور کی چند جھلکیاں آپ کو ملیں گی جب انگریزوں کے تخلیق کردہ نئے معاشرے نے ایک مخلوط انڈو اینگلین ماحول کی تشکیل کی تھی اور کھدر پوش سوسائٹی نے بھی اسی ماحول میں جنم لیا۔ اس کا تجربہ خود میرے خاندان میں ہوا میری والدہ مرحومہ نے آٹھ نو سال کھادی پہنی لیکن کھادی کی یہ ساڑیاں نہایت نفیس اور قیمتی بنوائی گئیں۔ اور میری پھوپھی زاد بہن نے اپنے جہیز کے سارے ولایتی کپڑے نذرِ آتش کر دیے۔ وہ بھی جوش و خروش کا کیا زمانہ رہا ہوگا۔

۳ اس کتاب میں 1943 سے حال تک کے افسانے شامل ہیں۔ 1945 کے لگ بھگ جو کچھ میں نے لکھا وہ میرا نہایت بے وقوفی کا زمانہ تھا جب میں نے جو کچھ لکھا وہ تاثراتی اور قلم برداشتہ تحریریں تھیں۔ جب میں نے افسانوں کی تکنک اور دوسرے بقراطی معاملات پر کبھی دھیان نہیں دیا اور اس کے لیے میں ممتاز شیریں سے بہت مرعوب رہی کہ وہ فکشن پر کس قدر عالمانہ مضامین لکھتی تھیں۔ لیکن ایک دل چسپ بات یہ تھی کہ ان ازابلا تھوبرن کالج جو ایک خالص امریکن اسٹاف کے امریکا کی کسی یونیورسٹی ٹاؤن سے اٹھا کر یہاں چاند باغ میں رکھ دیا گیا ہو۔ یاد رہے کہ لکھنو نوابی اور شاہی کے دور سے باغات کا شہر کہلاتا تھا۔ یہاں چار باغ، قیصر باغ وغیرہ سے لے کر بادشاہ باغ اور چاند باغ تک۔ گلشن ہی گلشن لہلہا رہے تھے۔ بادشاہ باغ میں کنگ نصیر الدین حیدر کا گارڈن ہاؤس تھا۔ اور ان ہی کی سنگ سرخ کی بارہ دری اور نہر۔ چنانچہ یہ کیمپس بر صغیر کے حسین ترین یونی ورسٹی ایریا میں شامل تھا۔ ادھر چند قدم پر ازابلا تھوبرن کالج کی بلند و بالا عمارت ایستادہ تھی۔ اور یہ میں نے برسوں بعد امریکا میں جا کر دیکھا کہ وہاں کی یونی ورسٹیاں اسی رومن یونانی اسٹائل میں تعمیر کی گئی تھیں۔ جو انگلش اسٹائل سے بالکل مختلف تھا۔ چنانچہ دولت مند امریکنوں نے اپنا تہذیبی اور علمی ناطہ یونان قدیم اور رومن ایمپائر سے جوڑا تھا۔ ان کے یہاں زمین کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے کیمپس بھی بے انتہا وسیع تھے۔ بے چارے چھوٹے سے انگلستان میں اتنی وسیع دانش گاہیں تعمیر کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ازابلا تھوبرن ایک امریکن

مشنری خاتون تھیں جنھوں نے غدر 1857ء کے کچھ عرصے بعد ہی لکھنؤ پہنچ کر لڑکیوں کے لیے ایک مشن اسکول کھولا تھا جو چند سال بعد ہی ہندستان کا ایک مشہور گرلس کالج بنا۔ طریقۂ تعلیم امریکن تھا لیکن نصاب الٰہ آباد یونی ورسٹی کا پڑھایا جاتا تھا۔ انٹر کے امتحان الٰہ آباد اور بی اے لکھنؤ یونی ورسٹی سے منسلک تھا۔ امریکن طریقۂ تعلیم میں کورس کے علاوہ باہر کی کتابوں کو بھی بہت اہمیت دی جاتی تھی چنانچہ ہر ہفتے لائبریری سے فکشن کی دو کتابیں لے کر ان کے متعلق باقاعدہ ریڈنگ رپورٹ تیار کرنی پڑتی تھی۔ جو انگریزی ادب کی استانیوں کو پیش کی جاتی تھی۔ اس طرح لڑکیوں کا مطالعہ ابتدا ہی سے خاصا وسیع ہوجاتا تھا۔ ڈرامے کی کتاب یعنی شیکسپیئر برناڈ شا وغیرہ کو پڑھنے کے لیے ہر لڑکی کو ایک ایک کردار کا پارٹ دے دیا جاتا تھا۔ اور وہ کلاس میں اسی طرح پورا ڈرامہ پڑھ ڈالتی تھیں اس کے بعد اس ڈرامے کے متعلق لکچر دیے جاتے تھے۔ اس طریقۂ تعلیم کی وجہ سے لڑکیوں میں ادب شناسی کا ذوق بھی پیدا ہوجاتا تھا۔ میرے اپنے گھرانے میں تو ماں باپ تو خیر مشہور ادیب تھے ہی میری چچازاد بہنیں بھی یونی ورسٹیوں میں اردو اور انگریزی ادب کی طالب علم تھیں دراصل وہ امن چین اور آسائش کا دور تھا۔ اسی دور کو انگلستان نے اپنے یہاں پہلی اور دوسری جنگ عظیم یعنی 1919 سے لے کر 1939 تک کے زمانے کو The long week End کہا ہے جب اس دور میں نیا ادب، نیا تھیٹر، نئی موسیقی وغیرہ ساری نئی تحریکیں مع نیو لفٹ موومنٹ خوب پھلی پھولی۔ ستمبر 1939 میں اچانک یہ دور زمانہ جنگ میں تبدیل ہوگیا لیکن پنگوئین نیو رائٹنگ وغیرہ بہ دستور شایع ہوتی رہیں۔

چونکہ ہندستان میں مغرب کی ہر نئی تحریک کم از کم بیس سال بعد پہنچتی ہے۔ اور اس کو تازہ ترین سمجھ کر ہمارے اہل دانش بہت خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ٹی ایس ایلیٹ کا ویسٹ لینڈ کافی عرصے بعد حیدرآباد کے عزیز احمد کے ذریعے اردو والوں سے متعارف ہوا اور اسے ادب کی نئی آواز سمجھا گیا۔ اردو ڈراما اب تک خاصا نحیف و لاغر رہا ہے۔ دراصل چونکہ ہمارے یہاں اسٹیج ہی ناپید ہے محض رسالوں میں چھپی ہوئی چند تمثیلوں کے ذریعے اس فن میں نہ چہل پہل آسکتی ہے نہ ترقی ممکن ہے۔ ریڈیو ڈرامے البتہ بہت مقبول ہوئے اور بالخصوص پاکستان کے ٹی وی ڈراموں

نے ایک نئی صنف کو بڑے پیانے پر متعارف کیا۔

مختصر افسانہ بہرحال جدید اردو ادب کا ایک مضبوط قلعہ ہے اور اردو ادب کی شناخت بن چکا ہے۔ ناول کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی عوامی یا مقبول ناول یا جاسوسی قصے جو مغربی جاسوسی فکشن کا چربہ ہوتے ہیں ایک علاحدہ صنف بن چکے ہیں۔ پہلے خواتین کے ناولوں کی بہت مانگ تھی۔ رضیہ بٹ وغیرہ نہایت ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں لیکن شاید ٹی وی ڈرامے نے ایسے گھریلو ناولوں کی مانگ بھی کم کردی ہے۔ چونکہ بہرحال ایک گھریلو خاتون گھر کا کام کاج کرتے ہوئے بھی ٹی وی ڈارما دیکھ سکتی ہے۔ یکسوئی سے بیٹھ کر ناول پڑھنے کی اسے اب فرصت نہیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب متوسط الحال گھرانوں میں اتنے ملازم نہیں رکھے جاتے۔ نئی تکنالوجی کی بدولت گھر کا کام کاج بھی آسان ہوگیا ہے۔ جسے ایک خاتون خود انجام دے لیتی ہے۔ اس طرح ہمارا طرز زندگی رفتہ رفتہ بدلتا جارہا ہے۔ لیکن خواص وعوام کے ذہنوں پر جو ہمہ گیر اثر سنیما اور اب ٹی وی نے مرتب کیا ہے اس کا غالباً ماہرین عمرانیات زیادہ گہرائی سے مطالعہ نہیں کررہے ہیں۔ میں نے کہیں پہلے ذکر کیا ہے کہ میں نے شاید دبئی میں اپنے ہی گھرانے کے ایک چار سالہ بچے کو دیکھا کہ جب اس کی ماں نے اُسے ڈانٹا تو اس نے بالکل فلمی طریقے سے ہاتھ جوڑ کر کہا ماں مجھے معاف کردو۔

اس مجموعے کے زیادہ تر افسانے پچھلی نصف صدی کے تغیر پذیر معاشرے کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ یہ ماہرین عمرانیات کا کام ہے کہ ہمارے یہاں جو تبدیلیاں آئیں ہیں۔ ان کا مطالعہ اور تجزیہ کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ اردو ادب نے اس انقلاب آفریں دور کی ترجمانی کس طرح کی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مختلف لسانی اور تہذیبی اختلافات کے باوجود اس منظر میں ایک تہذیبی وحدت موجود ہے۔ جن کی عکاسی کی کوشش میں نے ان افسانوں میں کی ہے۔" ستاروں سے آگے" اپنی والدہ اور ممانیوں کے ساتھ والدہ کے کزن نواب سید ابراہیم حسین خاں کے قلعہ محمود پور سے بیل گاڑی پر ایک قریبی ریلوے اسٹیشن کی طرف آرہے تھے تاروں کی چھاؤں میں بیل گاڑی کا وہ سفر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہندو گاڑی بان ممانیوں کی بُوبُو کہہ کر مخاطب کررہا

تھا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ اس علاقے میں تمام بیگمات کو شاید بو بو ہی کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ والدہ کی کزن اور بھاوج یعنی بیگم محمود پور کو میں بھی بو بو کہتی تھی۔ جو ایک ہندی لفظ ہے اور پرانی طرز معاشرت میں مستعمل تھا۔ یہ لفظ بو بو یو پی اور بہار میں پرانی طرز کے مسلم خاندانوں میں گھر کی مالکن کو آج بھی بو بو پکارا جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ لالا نے جو ابراہیم ماموں کے منیجر تھے گارڈ سے کہا نواب صاحب کی سواریاں آئی ہیں ذرا ٹھہرے رہنا بھیئے۔ ''تار پر چلنے والی'' بمبئی میں ساؤتھ انڈیا کا مشہور سرکس آیا تھا۔ اُس زمانے میں میں امپرنٹ کی منیجنگ ایڈیٹر تھی اور Besides Book کے زیرِ عنوان بمبئی کی اہم تہذیبی سرگرمیوں کے بارے میں بھی دو صفحات لکھتی تھی۔ اس میں فلم ریویو بھی شامل تھے۔ اور شاید پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ میرے فلمی تبصروں کے اسٹائل نے انگلش میں فلم ریویوز کا ایک نیا طرز شروع کیا تھا۔ لیکن صحافت عموماً نقش برآب ثابت ہوئی ہے اور بہت کم صحافی ایسے ہیں جنھوں نے اپنے مضامین جمع کر کے کتابی صورت میں شایع کیے۔ کیونکہ شاید وہ لکھتے لکھتے اتنے اکتا جاتے ہیں کہ دوبارہ ان مضامین کو جمع کر کے چھپوانے کی پرواہ نہیں کرتے۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میں نے وہ کالم یا صفحات جمع کر کے ان کا مجموعہ چھپوا لیا ہوتا تو خاصا دلچسپ ثابت ہوتا۔ میں اس سرکس میں کام کرنے والی لڑکیوں کے متعلق لکھنے کے لیے ان کی خیمہ گاہ میں بھی گئی تھی اور مجھے ان کی زندگی خاصی الم ناک لگی۔ یہ زیادہ تر اینگلو انڈین یا ملیالی لڑکیاں تھیں اور میں نے جب ایک لڑکی کی تنخواہ پوچھی تو اس کی یوریشین ماں نے چپکے سے دو انگلیوں سے اشارہ کیا یعنی دو سو روپے۔ بہت ہی تعجب ہوا۔ اتنی قلیل تنخواہ میں ایسا جان جوکھوں کا کام یہ کیسے کر رہی تھیں لیکن ہندستان ایک عجیب و غریب ملک ہے یہاں کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔ پھر ان ہی میں سے ایک لڑکی نے مجھ سے کہا ایک روز میں اپنے لباس پر زرد رنگ کی ایک مصنوعی تتلی ٹانک رہی تھی تو میں نے سوچا کہ یہ منجمد اداسی ہے۔ Frozen Sadness مجھے اس کا یہ جملہ بہت غیر معمولی لگا اور میں نے اس کا تذکرہ بھی اس افسانے میں کیا۔

''شربت والی گلی'' بھی کلکتے کا سچا واقعہ ہے جب ہم لوگ ملازمہ کی تلاش میں ایک گلی کی طرف نکل گئے تو معلوم ہوا کہ وہاں طوائفیں رہتی ہیں اور ایک خوش شکل اور گوری چٹی لڑکی جو اپنے

دروازے کی دہلیز میں بیٹھی تھی بار بار جھک کر ہمیں نمسکار کیا۔ اس افسانے کا عنوان دیکھ کر کرشن چندر نے مجھ سے کہا بھئی یہ تو بہت ہی اچھا عنوان ہے۔ کاش میں نے سوچا ہوتا۔ لندن میں ایک بار کسی دعوت میں ایک خاتون سے ملاقات ہوئی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے زمانے میں شمالی ہند کی ایک خاص مشہور گائیکہ تھیں۔ اور توارد کی یہ ایک عجیب وغریب مثال ہے کہ اس افسانے کی ہیروئن عرصۂ دراز کے بعد اپنے مکان میں واپس لوٹتی ہے جہاں اُسے اپنا سنگھاردان دکھلائی دیتا ہے۔ بعد میں میں نے امراؤ جان ادا میں اسی طرح کا ایک منظر پڑھا۔ دراصل انسانی زندگی کا جو طربیہ یا المیہ ہے اس میں چند واقعات ایک ہی طرح کے رونما ہوتے ہیں۔ محض زماں ومکاں مختلف، کیونکہ ساری دنیا کے انسانوں کے جذبات اور معاملات اور حرکات وسکنات تقریباً یکساں ہیں اور یہ بات میں اپنے مشاہدے سے کہہ سکتی ہوں۔ محض طرز معاشرت مذہب، کلچر، اور زبان مختلف لیکن بنیادی طور پر سارے انسان ایک سے ہیں میں نے قطب شمالی کے اسکیموں نہیں دیکھے نہ وسط افریقہ کے حبشیوں سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ لیکن وہ بھی ہنسی کے موقع پر روتے نہیں ہوں گے نہ فرطِ غم سے کھلکھلا کر ہنستے ہوں گے۔ مختلف تہذیبوں کے انسانوں کی بہت ہی خفیف سی حرکات وسکنات بھی ایک سی ہیں۔ اسی طرح مختلف انسانوں کی زندگیوں کے سانچے بھی ایک سے ہوتے ہیں۔ اور اس معاملے میں ساری دنیا کی عورتوں کے دکھ سکھ تقریباً مشترک ہیں۔ بنیادی طور پر ان کے جذباتی رشتے اور ردعمل بھی یکساں ہیں۔ جرائم میں قاتل اور ڈاکو عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور جو عورتیں قتل کی مرتکب ہوتی ہیں وہ بھی انتہا درجے کی ایسی صورت حال میں یہ اقدام کرتی ہیں جو ان کے لیے نا قابل برداشت ہوتا ہے۔ چنانچہ ساری انسانی برادری میں ایک بنیادی غیر مرئی رابطہ موجود ہے۔ زبان، مذہب، تہذیب اور وطنیت کے اختلافات کے باوجود انسانی برادری کی یکسانیت کوئی کھوکھلا سیاسی نعرہ نہیں ہے۔ گو یہ ناممکن ہے کہ ساری دنیا کے لوگ اکٹھے ہو جائیں اور سب مل کر انٹرنیشنل کا فرانسیسی نغمہ الاپنے لگیں۔ لیکن ہم لوگ جنھوں نے برسہا برس بڑے اطمینان سے مذہب اور زبان کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہایا ہے۔ اب بھی امن کی بات کو ایک سیاسی ڈھونگ سمجھتے ہیں۔ دراصل ہم میں سے کچھ لوگوں نے شہری فرقہ وارانہ

فسادات کا تجربہ تو کیا ہے لیکن ہم نہیں جانتے کہ اگر ہمارے آسمان پر بے شمار طیارے امنڈ آئیں اور ہمارے شہروں پر بمباری کرنے لگیں تو اس وقت ہمارا ردعمل کیا ہوگا۔ محض اپنی اور اپنے پیاروں کی جانیں بچانے کی فکر اُس وقت ان لمحات میں ہم ان سیاسی معاملات کے متعلق کیسے سوچ سکتے ہیں جن کی وجہ سے ہمارے آسمان پر یہ طیارے نمودار ہوئے۔ ایک زمانہ تھا جب امن پرستوں کو کیمونسٹ پکارا جاتا تھا۔ امریکا میں وہ استہزائیہ انداز میں (پیس نک) Pacenik کہلاتے تھے۔

سنگھاردان بھی اب پٹاری کی طرح دورِ حاضر کی کلچر میں شامل نہیں ہے۔ پہلے خاتون خانہ کے گنبد نما پاندان کے اندر ان کی روزمرہ کی ضرورت کی کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں موجود ہوتی تھیں۔ ان کی جگہ دورِ حاضر میں گودریج کے چھوٹے سیف نے لے لی۔

اب یہاں ایک بالکل غیر متعلق بات آپ کو بتاتے چلوں۔ گودریج بمبئی کے ایک پارسی ملک التجار گھرانے کا خاندانی نام ہے۔ لیکن اس نام کے اصل معنی یعنی گاؤکش اگر پبلک میں بیان کیے جائیں تو کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ بہرام جی، ہرمز جی، گاؤکش کا نام یہاں چل سکتا ہے؟ گودریج، گودرز کی بگڑی ہوئی انگریزی شکل ہے اور یہ متعدد پارسیوں کا خاندانی نام ہے یعنی ان کے اجداد غالباً ایران قدیم میں گاؤکشی کرتے تھے یعنی قصاب تھے۔ ہزاروں سال کی مسافتیں طے کر کے الفاظ اور نام کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

ماہرین لسانیات آج تک اس قدیم ترین زبان کو کوئی نام نہیں دے سکے ہیں جو سنسکرت، فارسی اور لاطینی وغیرہ زبانوں کی جدہ ہے۔ (یہاں لفظ جدہ پر ایک اور بات یاد آئی۔ شہر جدہ کی وجہ تسمیہ بتائی جاتی ہے کہ اماں حوا آسمان سے اس مقام پر گری تھیں) تو حضرت آدم سری لنکا کیسے پہنچ گئے جہاں لنکا اور رام کماری کے درمیان سمندر کے چھوٹے ٹاپو آدم کا پل کہلاتے ہیں۔ بہرحال جدہ میں ایک بے حد طویل مزار بھی تھا یا شاید اب تک ہے۔ جو اماں حوا کا مزار کہلاتا ہے۔ (ظاہر ہے اولین انسانوں کی طرح ان کی جدہ بھی بے حد اونچے قد کی رہی ہوں گی۔)

فیض آباد کے نزدیک اجودھیا میں حضرت شیثؑ کا مزار میں نے خود دیکھا ہے۔ ہمارے

ماموں سید آل حسنین اس وقت برٹش انڈین آرمی میں میجر تھے اور فیض آباد چھاؤنی کی ایک بے انتہا پرفضا کوٹھی میں مقیم تھے۔ وہ ہم کو اجودھیا گھمانے لے گئے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے مندر سے ملحق مسجد کے چبوترے پر ایک ملا جی بیٹھے تھے۔ اور برابر والے چبوترے پر مندر کے پروہت براجمان تھے اور دونوں اپنی مادری زبان اودھی میں گپ شپ میں مصروف تھے۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ مستقبل میں ان دونوں کا یہ چبوترہ ایک خوفناک سیاسی اکھاڑے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شیش ایک دم اجودھیا کیسے پہنچ گئے اور یہ روایت کس طرح تیار ہوئی؟ کشمیر میں بھی میں نے ایک بے حد طویل مزار دیکھا ہے جو کسی قدیم ترین بزرگ کا بتلایا جاتا ہے۔

عوج بن عنق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اتنے طویل القامت تھے کہ ایک ہاتھ سمندر میں ڈال کر مچھلی نکالتے اور اُسے سورج کے قریب پہنچا کر بھون لیتے۔ یہ روایات عہد قدیم کے لوگوں کے لیے کس طرح مشہور ہوئی۔ لنکا سے جو نکلا باون گزا ___ راون کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد طویل القامت تھا۔ ہماری دیو مالا اور دوسرے ممالک کی اساطیر کا ماہرین غرب تجزیہ شاید کر چکے ہیں لیکن ہمارے یہاں کی جو روایات ہیں ان کی کچھ سچائی ہمیں بھی معلوم ہے۔ مثلاً رستم پہلوان۔ ایران میں پہلوانی ایک مشہور و مقبول مشغلہ تھا وہیں سے پہلوان لفظ یہاں آیا۔ یہاں بھی پہلوانوں کے اکھاڑے موجود تھے اور بجرنگ بلی یعنی ہنومان جی ان کے پیٹرن سینٹ ہیں۔ ایک دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ مضافات لکھنو میں علی گنج کا ہنومان مندر اس علاقے کا ایک مشہور پوترا استھان ہے جہاں زائرین اپنی کوئی منت پوری ہونے کے بعد پیٹ کے بل چلتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں۔ اور ان کی گھر کی عورتیں راستے بھر انھیں پنکھا جھلتی جاتی ہیں۔ ہندستان عقائد و مذاہب کا ایک عظیم الشان اوپن ایئر میوزیم ہے اور اسی کی وجہ سے یہ ایک خوش رنگ گلدستے کے بجائے اکثر و بیش تر بھیڑوں کا چھتہ بن جاتا ہے اور ملکوں میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ محض ہمارے یہاں ہی قدم قدم پر اتنی ناچاقی کیوں ہے یہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ اگر آپ کہئے یہ سیاست دان اور پریس یعنی اخبار اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں تو خود پبلک اتنی بے وقوف کیوں ہے اور پڑھے لکھے لوگ بھی ان کے بھڑے میں کیوں آ جاتے ہیں۔

ان افسانوں میں ہندستان کے گھومتے ہوئے رنگ منچ کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ گو اس ملک کی خاطر خواہ نمایندگی یا عکاسی کے لیے بہت ہی ناکافی ہیں لیکن بہر حال میں نے اپنی بساط کے مطابق تھوڑی بہت کوشش تو کی ہے۔ ہر لیکھک اپنی ہی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق لکھتا ہے۔ میں نے بھی یہی کیا ہے____

زیر نظر کتاب کے تمام افسانے جو اب تک کسی اور مجموعے میں شامل نہیں تھے یہ ڈاکٹر جمیل اختر صاحب نے جانے کہاں کہاں سے تلاش کیے ہیں۔ جو واقعی بڑی محنت اور جستجو کا کام تھا اس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ جمیل اختر ایک ابھرتے ہوئے نوجوان محقق اور ناقد ہیں۔ اردو ادب سے انھیں بے حد دلچسپی ہے۔ انھوں نے میرے فکشن پر اپنا تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ اور میرے بہت سے گم شدہ اثاثے بازیافت بھی کیے ہیں۔ یہ افسانے بھی ان کی تحقیقی دریافت ہیں۔ وہ اس کام کے لیے میرے مبارک باد اور شکریے دونوں کے مستحق ہیں۔

قرۃ العین حیدر

26/اگست 2005
E-55 سیکٹر 21
نوئیڈا۔ یوپی

(یہ دیباچہ 'قندیل چین' مرتبہ جمیل اختر جو قرۃ العین کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے، میں شامل ہے۔)

حواشی:

1. اب وہ محلہ سرائے جولینا کہلاتا ہے۔ اور یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اوکھلا کے علاقے میں شامل ہے۔
2. جب حکومت برطانیہ نے سید احمد خان کو 'سر' کا خطاب دیا تو ان کے بھائی کو نواب کے لقب سے نوازا۔

آگ کا دریا

اس ناول کے متعلق افسانہ طرازی اور افواہوں کا سلسلہ اس قدر مستحکم ہو چکا ہے کہ اس کی تردید اب میرے بس کی بات ہی نہیں رہی۔ حال ہی میں قدرت اللہ شہاب مرحوم کا "شہاب نامہ" شایع ہوا جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس کتاب میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں: "مارشل لا لگتے ہی ایک روز صبح سویرے قرۃ العین حیدر میرے ہاں آئی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ اداس، آنکھیں پریشان، آتے ہی بولی: "اب کیا ہوگا؟...... تو گویا اب بھونکنے پر بھی پابندی عاید ہے۔" عینی نے بڑے کرب سے پوچھا...... آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ آنسو چھپانے کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کسی قدر لاپروائی سے کہا: "ارے بھئی! روز بھونکنا کون چاہتا ہے لیکن بھونکنے کی آزادی بھی تو عجیب نعمت ہے...... میرا اندازہ ہے کہ ...... سنسرشپ کے تخیل ہی سے اس کے ذہن کو بڑا شدید جھٹکا لگا۔ کچھ عجب نہیں اسی جھٹکے کے ردعمل نے اس کے قلم کی باگ "آگ کا دریا" کی طرف موڑ دی ہو" (شہاب نامہ ص ۷۲۱، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور 1987 نئی دہلی 21 دسمبر 1968) بہ خوف طوالت پورا اقتباس نہیں دیا۔ شہاب صاحب بے حد نیک اور شریف انسان تھے۔ غلط بیانی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا لیکن ان کے حافظے

نے یقیناً ان کو دھوکہ دیا کیونکہ یہ ساری ڈرامائی منظر نگاری افسانہ ہے پہلی بات یہ کہ میں بال بکھرا کر آنکھ میں آنسو بھر کر سرد آہیں نہیں کھینچتی۔ ''بھونکنا'' وغیرہ میرا طرز گفتگو ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ 'آگ کا دریا' میں نے 1956 میں شروع کیا 1957 میں ختم ہوا۔ مارشل لا اکتوبر 1958 میں نافذ ہوا۔ اس وقت ناول کا مسودہ لاہور میں تھا اور دسمبر 1959 میں مکتبہ جدید نے اسے شائع کیا۔ پہلے اڈیشن کے آخری صفحے پر تصنیف کے سن موجود تھے۔ لہٰذا ''سنسر شپ کے ذہنی جھٹکے'' نے میرا قلم ''آگ کا دریا'' کی طرف نہیں موڑا۔

آگے چل کر شہاب صاحب مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ چند ہفتوں بعد رائٹرز گلڈ کے قیام کے سلسلے میں مشورہ کرنے قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابن الحسن ابن سعید اور عباس احمد عباسی ان کے دفتر میں گئے۔ یہاں بھی شہاب صاحب بھول گئے، کیونکہ دراصل مذکورہ بالا حضرات نے میرے دفتر میں آ کر مجھ سے اس مجوزہ انجمن میں شرکت کے لیے کہا تھا (اس واقعہ کا تذکرہ ''کار جہاں دراز ہے'' جلد دوم میں کر چکی ہوں 1979 میں شائع ہوئی)۔

دسمبر 1959 میں اس ناول کی اشاعت کے چند روز بعد ن م راشد نے اس پر ریڈیو پر تبصرہ کیا (مطبوعہ آہنگ، کراچی) چند اقتباسات پیش خدمت ہیں: ''اس صحبت میں صرف ایک نئی کتاب سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔ وہ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ہے، جسے شائع ہوئے ابھی دس پندرہ دن ہی ہوئے ہیں۔ ایک ہی ناول پر بحث کرنے کا جواز صرف یہ ہے کہ یہ ناول یقیناً اردو ناول نگارن میں بے حد اہمیت حاصل کر کے رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے 'وقت' کے ساتھ جو تجربہ کیا ہے وہ تکنیک کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے......

''اس ناول میں طلعت نام کی لڑکی گویا وہ خود ہیں، اگرچہ طلعت اور کرداروں کے برعکس کہیں بھی یوں نہیں ابھرتی کہ آدمی اسے ناول کا ایک ضروری کردار کہنے پر مجبور ہو جائے...... جہاں تک اس ناول کا تعلق ہے یہ اپنی تمام تر پنہائی کے باوجود ہندستان کی آبادی کے ایک طبقے کی داستان ہے۔ یہ یوپی کے مسلمان کا وہ المیہ ہے جس میں ہندستان کی تقسیم نے اسے مبتلا کر دیا تھا...... اگرچہ ہندستانی مسلمان کی اس کشمکش کا تجزیہ قرۃ العین حیدر نے بڑی چابک دستی سے کیا

ہے اور تکنیک کے اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے لیکن اس وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کی اشاعت بڑی حد تک بے وقت کی راگنی ہے۔"

دوسرا طویل مضمون ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا تھا جو ساقی (اپریل 1960) میں چھپا۔

"......اب میرا خواب بھی ٹوٹ گیا اور ان کے موضوع پر ان کی طرح ہی سوچ رہا ہوں۔ صاحبزادی! کیا وسعت نظری ہے۔ کیا بالغ نظری ہے...... ورجینیا وولف سے آگے بڑھ جاتی ہیں......" وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔ پورا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ انھی مرحوم نے اُسی ماہ "جنگ" میں سراج رضوی کا "آگ کا دریا" کے خلاف مضمون چھپنے کے بعد سے اپنے مضامین میں صاحبزادی کی خوب خوب تنقیص کی اور آگ کا دریا کے جواب میں ایک ناول بھی تصنیف کیا، جس کا نام "سنگم" تھا۔

"کارِ جہاں دراز ہے" میں تفصیل لکھ چکی ہوں۔ سراج رضوی کوئی صاحب تھے جن کے متعلق اب سنا ہے (نہ جانے اس میں کتنی صداقت ہے؟) کہ کسی نجی معاملہ کے سلسلے میں ان بریگیڈیئر صاحب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے جو مارشل لا کے تحت ایک نوع کے ادبی محتسب مقرر کیے گئے تھے۔ اپریل 1960 میں سراج رضوی صاحب کا ایک طویل اور نہایت بے ہودہ مضمون اس ناول کے خلاف روزنامہ "جنگ" کراچی میں شایع ہوا (جس میں ایک انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ مصنفہ مشہور بھارتی کیمونسٹ ڈاکٹر رشید جہاں کی سگی بھانجی ہیں!) اسی مضمون کا ترجمہ کراچی کے ایک انگریزی روزنامے میں اسی روز شایع ہوا۔

ہماری ایک "تہذیبی خصوصیت" یہ بھی ہے کہ کسی خاتون کی مخالفت منظور ہو تو سب سے پہلے اس کے متعلق افواہیں پھیلائی جاتی ہیں۔ مولانا رازق الخیری مرحوم اڈیٹر "عصمت" نے تحریر فرمایا:

> "......انھوں نے "آگ کا دریا" ناول لکھا تو جہاں ایک حلقے میں دھوم مچ گئی وہاں حاسد انگاروں پر لوٹنے اور اول فول بکنے لگے۔ یوں بھی اس بچی سے نہایت لغو باتیں منسوب کی جا رہی تھیں۔ تل کا پہاڑ،

پر کاکو ااور میل کا تیل بنانے کے مسلمان بادشاہ ہیں لیکن جہاں تیل ہو نہ
پر نہ میل وہاں بھی وہ نہیں چوکتے.....''

(ماہنامہ 'عصمت'، کراچی، 4 دسمبر 1967)

جمیل الدین عالی نے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سراج رضوی صاحب کو نوٹس بھجوایا۔ 8 مئی 1960 کو ان کا غیر مشروط معافی نامہ فوراً ''جنگ'' میں چھپ گیا۔ اس کے بعد وہ منظر سے غائب ہو گئے۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناول پاکستان میں ایک روز کے لیے بھی BAN نہیں ہوا نہ مصنفہ سے کسی قسم کا سرکاری تعریض کیا گیا۔

ناول سنسر شپ کیے جانے کی افواہ غالباً اس وجہ سے پھیلی کہ کتابت کی تصحیح کرتے وقت میں نے کئی جملے اور پیراگراف حذف کر دیے تھے جو پروف ریڈنگ کا عام قاعدہ ہے۔ عجلت میں وہ صفحات اسی طرح پریس میں بھیج دیے۔ ایک باب میں، میں نے محض ''ہندستان 1947'' لکھا تھا۔ اس کی نہایت احمقانہ تاویل یہ کی گئی کہ باقی عبارت سنسر کی نذر ہو چکی ہے۔

اس تمام ہنگامے سے البتہ اس قدر کوفت ہوئی کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق آدم جی ایوارڈ کا مستحق محض ''آگ کا دریا'' کو سمجھتے ہیں، میں نے خود کو ججوں کی کمیٹی میں شامل کروالیا اور یہ ادبی انعام شوکت صدیقی کی ''خدا کی بستی'' کو دیا گیا۔ لوگوں نے کہا انعامات کے لیے اکثر کیا کیا جوڑ توڑ کیے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ......وغیرہ وغیرہ۔

میں ایڈورٹائزنگ، فلمز اینڈ پبلی کیشنز وزارتِ اطلاعات و نشریات سے منسلک تھی۔ اواخر 1960 میں ایک ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے مشرقی پاکستان گئی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''کارِ جہاں دراز ہے'' جلد دوم-279) واپسی پر اسی محکمے کے DECIMAL COINS کے متعلق پاکستان کی پہلی کارٹون فلم کا اسکرپٹ لکھنے کے بعد میں والدہ کو بہ غرضِ علاج لندن لے گئی۔ اس وقت تک متعدد اہلِ قلم مغرب میں سکونت اختیار کر چکے تھے، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد جو والد مرحوم کے عزیز دوست تھے انھوں نے چند برس قبل مجھ سے کہا تھا تم واپس کیوں نہیں آ جاتیں۔ برطانیہ میں مستقل قیام کے بجائے ہندستان واپسی کا تعلق ''آگ کا

دریا'' سے نہیں ہے۔

اب کچھ گزارش ناول کے متعلق، میں نے ''اورلینڈو''، ''سدھارتھ'' یہ ناول لکھنے کے بعد پڑھے۔ ''پردہ مجاز'' کبھی پڑھا ہی نہیں۔ ایک طویل داستان کو مختلف ادوار میں چند کرداروں کے ذریعے پیش کرنا کوئی ایسا انوکھا خیال نہیں جس کے لیے اس قسم کی اور کتابوں کا مطالعہ ضروری ہو۔ ایک ہی نام کے کرداروں کے بار بار نمودار ہونے کی وجہ سے یہ بھی سمجھا گیا کہ یہ ناول آواگون کے بارے میں ہے۔ ناظرین! یہ ناول آواگون کے بارے میں نہیں ہے۔

گوتم نیلمبر نام میں نے خود اختراع کیا تھا۔ یہاں آن کر پتہ چلا کہ نیلم نام کے ایک فلسفی ہند قدیم میں گزرے ہیں۔ آخری دور کا ماحول تقریباً وہی ہے جو پہلے ناولوں کا ہے گل فشاں، لکھنؤ اور خیاباں، رددون 21 فیض آباد روڈ اور آشیانہ، دہرہ دون ہی ہیں چنانچہ ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں ان دونوں مکانوں کے متعلق لکھتے ہوئے بار بار خیال آیا کہ یہ سب تو میں ''آگ کا دریا'' میں لکھ چکی ہوں لہٰذا جگہ جگہ قلم زد کرنا پڑا۔ قدیر مع بیوی ''آگ کا دریا'' میں اپنے اصلی نام سے آ گئے تھے۔ لہٰذا ان کا نام ''کارِ جہاں دراز ہے'' (حصہ اول) میں بدل کر نذیر کر دیا۔

گھسیاری منڈی اور بیرورڈ، لکھنؤ کا پرائیویٹ اسکول ''آگ کا دریا'' میں اور ''کارِ جہاں دراز ہے'' (جلد اول) دونوں میں موجود ہے (امریکن ناول THE ROOTS کی اشاعت سے قبل ''کارِ جہاں دراز ہے'' آج کل، دہلی میں بالاقساط شایع ہوا تھا) یہ بھی مشہور ہے کہ یہ سوانحی ناول اس امریکن کتاب کی تقلید میں لکھا گیا۔

ن م راشد کا یہ خیال صحیح ثابت نہ ہوا کہ ''آگ کا دریا'' کی اشاعت بے وقت کی راگنی ہے، کیونکہ گزشتہ تیس سال کے دوران اقبال اور فیض کے علاوہ پاکستان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ''آگ کا دریا'' ہے، جس کے اب تک ان گنت غیر قانونی اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے ان کے پہلے صفحے پر ''حقوق بہ حق مصنفہ محفوظ'' بھی درج ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ''اس اشاعت کے لیے مصنفہ سے اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔'' دو سال قبل فرینک فرٹ انٹرنیشنل بک فیئر میں منعقدہ ناشروں کے ایک سیمینار میں جب میں نے کہا کہ اس

کتاب کو گنیس بک آف ریکارڈز میں جگہ ملنی چاہیے کہ روزِ اوّل سے آج تک اس کے ناشرین سو فی صد منافع کما چکے ہیں تو کسی کو ہرگز یقین نہ آیا۔ ہندستان میں 1961 ہی میں جالندھر میں جو کتاب راتوں رات چھاپ لی گئی تھی، اس میں عجلت کے مارے ہیگل کو سہگل لکھا گیا تھا۔ میرے خیال میں اتنی عرضِ مصنف کافی ہے۔

(نئی دہلی، 21 دسمبر 1988)

(یہ دیباچہ 'آگ کا دریا' جو قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول ہے، میں شامل ہے۔)

ہوائے چمن میں خیمۂ گل

نذر سجاد حیدر کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ان کے عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کا ایک مختصر جائزہ لینا نامناسب نہ ہوگا۔

آزادی سے قبل ہمارے سیاست دانوں، ادیبوں اور شاعروں نے قوم پرستی کے جوش میں ماضی کو بہت ہی زریں حروف میں اور بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اصلیت غالباً یہ تھی کہ دولت اور اقتدار محض بالائی طبقے تک محدود تھا۔ بادشاہوں اور راجاؤں کی شخصی حکومت کے ادوار میں ایک عام آدمی اور امرا کی زندگیوں میں اکثر بہت نمایاں فرق رہا ہوگا۔ قلعے یا گڑھی میں سلطان اور راجا اور اس کے لواحقین رہتے تھے عموماً آس پاس کے کچے مکانوں اور جھونپڑیوں میں پرجا اپنی زندگی گزارتی تھی۔ دورِ حاضر کے رامپور میں شاہی خاندان کے علاوہ باقی رعایا کو پکے مکانوں میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ میں نے خود رامپور میں دیکھا ہے۔ 1980 عیسوی میں وہاں گئی تھی تو متوسط طبقے کے لوگ کچے مکانوں میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارے نوابوں اور جاگیرداروں کے اس تکبر اور نخوت کا اندازہ آج لگایئے تو حیرت ہوتی ہے اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلی صدیوں میں امیر غریب کا یہ فرق کس قدر بھیانک رہا ہوگا۔ جبکہ مڈل کلاس وجود میں نہیں آئی تھی۔

مسلمانوں میں نواب اور دو بہ حاشیہ بردار اور اس کے ہم پلہ ہندو راجا اور ان کی پرجا۔ لیکن یہ محکوم آبادی مخلوط یعنی ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں پر مشتمل تھی۔ رولنگ کلاس مسلمانوں کی تھی۔ لہٰذا ان کو بالادستی حاصل تھی۔ میں نے ایک سترھویں صدی کی مغل مینا طوری تصویر ''ویکلی'' میں شایع کی تھی۔ جس میں ایک مولوی صاحب چند مسلمان لڑکیوں کو پڑھا رہے ہیں۔ وہ لڑکیاں قالین پر بیٹھی ہیں۔ ان ہی طالبات میں ایک ہندو لڑکی جس کے ماتھے پر بندی ہے اور لہنگے میں ملبوس۔ جو قالین سے باہر ہٹ کر گویا ٹاٹ باہر فرش پر بیٹھی ہے۔

لیکن زیادہ تر تفریق مذہب کے بجائے سماجی مراتب پر منحصر تھی۔ بیگمات اور رانیاں، شہزادیاں اور راج کماریاں ایک طبقے میں شامل تھیں۔ کنیزوں اور داسیوں کا رتبہ یکساں تھا۔ امیر گھرانوں کی لڑکیاں جب بیاہ کے سسرال جاتی تھیں تو ان کے ساتھ ان کی کنیزوں یا داسیوں کو بھی بھیجا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ایک مضمون ''بارہ آنے اور ڈلیا بھر کودوں'' میں لکھا ہے کہ زمانے حال تک اودھ کے چند قصبات میں بارہ آنے اور ڈلیا بھر کودوں کے بدلے میں ایک کنیز فروخت کی جاتی تھی اور یہ چشم دید حالات مجھے میرے ایک کزن کی بیوی نے بتلائے جو خود ایسے ہی کنیزیں خریدنے والے ایک طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اور اب امریکہ میں مقیم ہیں۔

اب اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پانچ چھ سو سال تک بلکہ اگر آپ سلطان رضیہ کے زمانے سے شروع کریں تو تقریباً ایک ہزار سال تک اس محکومی کے اثرات اکثریتی فرقے پر کس طرح مرتب ہوئے ہوں گے لیکن یہ محکومی بھی مذہب کے بجائے کلاس سسٹم کی دین تھی۔ ہندستانی ریاستوں میں ہم نے دیکھا ہے کہ سابق نواب کی ہندو رعایا بھی عموماً تہہ دل سے اس کو اپنا راجا مانتی تھی اور ہندو راجا کی مسلمان رعیت اپنے راجا کی بے حد وفادار تھی۔ یہ وفاداری فیوڈل سسٹم کی اساس اور بنیاد تھی۔ جبکہ اس وفاداری کا حصار ٹوٹنے لگا تو یہ کلاس سسٹم بھی منتشر ہوگئی۔ انگریزوں نے اپنے دور میں ان راجاؤں اور نوابوں کو اپنا فرزند دل بند پکارا کیونکہ ان کی بالادستی میں اس طبقے کا تعاون بھی شامل تھا۔ ایسے احساسات اکثریت کی اجتماعی سائکی پر تہذیب وتمدن میں شامل ہوگئے اور کہیں کہیں پر خود انھوں نے کاسٹ سسٹم کے زیر اثر اشراف اور ارذال کی تفریق قائم

کر لی اور ان کی حکومت بھی اتنی ہی جابر یا روادار تھی جتنی اس دور کے دوسرے ممالک کی حکومتیں رہی ہوں گی۔ سونے پہ سہاگہ سید، مغل، پٹھان اور شیخ کے نسلی تفاخر یا امتیاز کا بھی زور رہا۔ قرونِ وسطیٰ کے انگلستان اور یورپ میں آبائی پیشوں کے لحاظ سے کنبے جانے جاتے تھے۔ کارٹر، ویلر، بٹلر، کوک، ٹیلر۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یہ ضروری نہ رہا کہ ٹیلر کا بیٹا درزی ہی رہے اور کوک کی آئندہ نسلیں بھی باورچی گری کریں۔ کسی ٹیلر کے کنبے کی اولاد میں برطانوی کابینہ وزیر نمودار ہوئے۔ کسی کوک یعنی باورچی کی اگلی پیڑھیوں نے جہازوں کے ذریعے دنیا کے سمندروں پر حکمرانی کی۔ اس کی ایک وجہ عالی ہمتی، اعلیٰ تعلیم اور ایک عالمگیر سلطنت یعنی برٹش امپائر پران کی حکومت جتنے زیادہ سے زیادہ فراہم کر سکتی تھی۔ اس کا انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہماری اپنی بے توجہی کا یہ عالم تھا کہ سات سو برس تک آلِ عثمان نے آدھے یورپ پر حکمرانی کی لیکن یورپین احیائے علوم کے دور میں ان کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا۔ البتہ عیاشی اور تن آسانی کی علامت کے طور پر دیوان یعنی تخت، گاؤ تکیہ۔ وہ اپنی نشانی چھوڑ گئے۔ ''ایلس اِن ونڈر لینڈ'' (1856) میں ایک کیڑا ترکی ٹوپی اوڑھے حقہ پیتا دیکھا گیا ہے۔ ''ایلس اِن ونڈر لینڈ کو اگر Allegory سمجھا جائے تو یہ کیڑا انیسویں صدی کی عالمگیر اسلامی برادری کا ایک نمائندہ تھا۔ دولتِ عثمانیہ میں جدید علوم کی یونیورسٹیاں کیوں نہ قائم ہوئیں۔ مسیحی یورپ کے طالب علم آکسفرڈ، کیمبرج اور سوربون جانے کے علاوہ قسطنطنیہ، قاہرہ اور تہران بھی آتے۔ مسلمانوں کے یہاں عیش پرستی اور تن آسانی کی عادتیں اموی اور عباسی خلفا کے ادوار سے ہی اجاگر ہو گئی تھیں جب شاہانِ ایران کا نادر ہیرے جواہرات سے مزین قالین مالِ غنیمت میں حاصل ہوا اور اسے حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے بچھایا گیا تو فاروقِ اعظم نے بہ چشمِ پُرنم فرمایا کہ مجھے اس قالین میں امتِ رسول کی تباہی نظر آ رہی ہے۔

تو کیا مسلمان بادہ پیائی ہی کیا کرتے اور چٹائیوں پر بیٹھے رہتے؟ دنیا کی اور قومیں تو سیاسی اقتدار اور دولت حاصل کرنے کے بعد ایسی ناعاقبت اندیش کیوں نہ ثابت ہوئیں۔ انگریزوں نے آدھی دنیا پر اپنا پرچم لہرایا مگر اس طرح غفلت کا شکار نہیں ہوئے اور جتنی سختی سے اسلام میں

شراب نوشی کی ممانعت کی گئی تھی ہمارے مسلمان بھائیوں نے انگور کی بیٹی سے اُتنی ہی الفت ظاہر کی۔ قلاّل بھی عام طور پر مسلمان ہی تھے۔ مئے ناب پارسی اردو شاعری کا محبوب ترین استعارہ ہے۔

لیکن ایک بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ شراب نوشی ہماری سوسائٹی میں اور مسلم سماج میں انتہائی معیوب عادت سمجھی جاتی تھی اور بہت ہی کم افراد اس کے شائق تھے۔ اب ایسا نہیں رہا۔ فیشنبل طبقے کے مسلمانوں کے یہاں بھی کاک ٹیل پارٹی ایک عام چیز ہے۔ اب اکثر خواتین بھی مئے نوشی سے اجتناب نہیں کرتیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں مسلمان خواتین کی شراب نوشی ایک عام نظارہ ہے۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ جب شاہِ ایران نے شہ بانوئے فرح پہلوی کی سماجی خدمات کے متعلق ایک کتاب لکھنے کے لیے تہران مطلوب کیا تھا تو وہاں شہ بانو کی محفلوں میں خوب خوب جام پہ جام لنڈھائے جاتے تھے اور میرے لیے پہلے سے بتلا دیا جاتا تھا کہ ''خانم خارجی راشخ العقیدہ است''۔ انھیں جام پیش نہ کیا جائے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک شام کاخِ نیاوران کی ایسی ہی ایک پارٹی میں جو قصر کے جنت نظیر باغ میں منعقد کی گئی تھی اور یہ ایک لیڈیز پارٹی تھی اس میں ساری شہزادیاں اور ایران کے اعلیٰ ترین طبقے کی خانمیں مارجام پہ جام لنڈھا رہی تھیں اور میں ایک سنسان کمرے میں جا کر بیٹھ گئی تھی اور شہبانو کی ایک لیڈی اِن ویٹنگ نے جو کسی سینئر وزیر کی بیوی تھیں مجھے لا کر قہوے کی پیالی اور خشک میوے کی پلیٹ پیش کردی اور میں وہاں بیٹھی پستہ و بادام سے شغل کرتی یہ سوچ رہی تھی کہ مسلمان کے پاس جب دولت آتی ہے تو وہ محض عیش و عشرت میں کیوں پڑ جاتا ہے اور تبھی مجھے خیال آیا کہ جب میں بہت بچپن میں والدین اور اَلّن ماموں کے ہمراہ عراق و ایران کے سفر سے واپس آئی تھی تو ہمارے منجھلے چچا جان سید نصیر الدین حیدر نے ایک Jingle بنایا تھا جو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں وہ کچھ اس طرح تھا۔

بی بی جان سنئے ذری۔ گھن کی بھری اور جتے کیا۔

اس برس ایران میں رہ آئی ہوں دلشاد
ہیں بڑا امغلانی کی سب باتیں مجھے یاد

دال نہ خورم بھارت نہ خورم حلوہ خورم تر
پستہ و بدام خورم اور چنے کیا

اس وقت تہران میں صاف پانی کا انتظام نہیں تھا۔ محض اتنا یاد ہے کہ ایک ایرانی خانم سر پہ رومال باندھے زینے پر آ کر آواز دیتی تھی آب طاہر۔ آب طاہر۔ لیکن اہل ایران کی قوم پرستی کو قدیم ہم عصر بیرونی مورخین نے محسوس کی تھی۔ خود ہمارے زمانے میں تہران جیسے پس ماندہ شہر کو وہ پیرس سے کم نہ گردانتے تھے۔ میں شہ بانو کے ہمراہ ان کے چھوٹے کمانڈر نامی طیارہ میں تہران سے اصفہان جارہی تھی۔ نیچے بندر زمین پر جگہ جگہ گڑھے سے بنے ہوئے تھے۔ جیسے دوربین سے چاند کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ خاصہ ویران اور بدنما علاقہ تھا لیکن شہبانو دریچے میں سے اسے دیکھتے ہوئے بہت مسرور انداز میں بولیں دیکھو کتنا خوب صورت اور دل فریب لینڈ اسکیپ ہے میں نے سوچا اصل وطن پرستی اسے کہتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے یہاں کے ایک سے ایک حسین اور نظر فریب مناظر کی پرواہ نہیں کرتے۔

ان کے یہاں ایک چھوٹی سی ندی ہے جو ایرانی تلفظ میں زایندہ رود کہلاتی ہے وہ حد سے حد ہماری گومتی کے برابر رہی ہوگی مگر اس کی کیا دھوم مچ رہی تھی۔ شہنشاہ آریہ مہر اس پر بنے ایک نئے ڈیم کا افتتاح کرنے تشریف لے گئے۔ اس پارٹی میں میں بھی شامل تھی۔ ایک ایرانی درباری نے مجھ سے پوچھا آپ کے یہاں ایسے عظیم دریا ہیں؟ مجھے یاد آیا ایک خاتون نے عرصہ ہوا شاید ''تہذیب نسواں'' میں ایک مضمون لکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل کا واقعہ ہے کہ انگلستان میں جب ان کی ٹرین وہاں کے بلند ترین پہاڑ Benevis کے قریب سے گذری جو کسی عام ہندستانی پہاڑی سے اونچا نہیں تھا تو ایک انگریز ہم سفر نے پوچھا تمھارے یہاں اتنے اونچے پہاڑ ہیں؟ تو انھوں نے مجبوراً کوہ ہمالہ کی بلندی کا ذکر کیا تو وہ اسے مبالغہ سمجھیں اور مسکرا کر بولیں تمھیں اپنے وطن سے بڑی محبت معلوم ہوتی ہے۔

1857 عیسوی ہماری تاریخ کا عظیم ترین واٹر شیڈ ہے۔ اس ہنگامے سے بہت قبل ہندستانی سوسائٹی کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ مجھے سترھویں صدی کی ایک پینٹنگ ہمیشہ یاد آتی ہے۔

ٹوپیوں میں پر لگائے بانکے یورپین شہ سوار ایک جنگل میں کسی مسلمان درویش کی کٹیا کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔ مجھے یہ تصویر بڑی علامتی سی معلوم ہوئی۔ یورپین جہاں بانی کرتے یہاں تک آپہنچے اور ہمارا آدمی گویا اس کام سے ریٹائر ہو کر اپنے حجرے میں جا بیٹھا۔ اس وقت تک آدھا یورپ ترکوں کے زیر نگیں تھا لیکن انھوں نے دور جدید کے تقاضوں سے مطابقت نہیں کی۔ روسی توپوں کے مقابلے میں ہمارے ترک جاں باز دس دس گز کی گھیر کی شلواریں پہنے اپنی توپنے گھسیٹتے تھے۔ اسلامی دنیا کی آدھی آبادی یعنی عورتیں حرم سرا میں مقید تھیں اور یورپین ادب میں ان کا اگر کہیں تذکرہ آتا تھا تو ایک نقاب پوش حور یا زر خرید کنیز کی صورت میں مشرقی عیاشی کی ایک سمبل کے طور پر وہ پیش کی جاتی تھیں۔ سر سے پاؤں تک برقع میں ملفوف زنانِ مشرق اہل مغرب کے لیے ایک عجوبۂ روزگار شئے ثابت ہوئی اور انھوں نے ''سحر انگیز'' مشرق کے اسرار میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اپنے بچپن میں میں نے خود ڈولی اور پنیس یا پالکی کی سواری بہت کی ہے۔ لکھنؤ میں والدہ جب کسی عزیز سے ملنے یا مجالسِ محرم کے لیے اندرون شہر جاتی تھیں تو موٹر کار باہر سڑک پر روک دی جاتی۔ ڈولیاں اٹھائے کہار لپکتے اور ہم لوگ ان کی ڈولیوں میں بیٹھ کر محلے کے اندر پیچ دار گلیوں سے گزرتے ہوئے ایک ڈیوڑھی پر پہنچتے اور کہار آواز لگاتے سواری اتروالیجیے۔ ادب اور تہذیب کا یہ عالم تھا کہ شاگرد پیشہ بھی ایک دوسرے کو آپ۔ جناب سے مخاطب کرتے تھے۔ انیسویں صدی کا لکھنؤ اعلیٰ ترین نفاست کے معاملے میں اٹھارھویں صدی کے فرانس کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ ان کی تہذیب ایران کی دین تھی اور ایران قدیم ترین زمانوں سے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں اپنی برتر تہذیب اور نفاست کے لیے مشہور رہا تھا۔ ایک عام ایرانی آج بھی اپنی انتہائی پُر تکلف اور شائستہ طور طریق کے لیے الگ سے پہچان لیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار تہران میں دربار شاہی کے ایک افسر کسی کام سے میرے پاس آئے اس وقت میری بھابی کی چھوٹی بہن اور بہنوئی مصطفیٰ جعفری بھی وہاں موجود تھے۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے ان صاحب سے کہا آپ کھانا ہمارے ساتھ ہی نوش کر لیجیے۔ وہ تیار ہو گئے۔ کھانے کے بعد جب وہ چلے گئے تو مصطفیٰ جعفری نے کہا۔ یہ شخص یقیناً ترک تھا کوئی اصلی نسل ایرانی اگر آپ زمین کھود کر اسے گاڑ بھی

دیتیں تو وہ مار ے تکلف کے کھانا کھانے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اودھ کے ایرانی نژاد بادشاہوں اور ان کے متوسلین کی رائج کی ہوئی پر تکلف تہذیب آج بھی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی خالص لکھنوی فرد کو آپ کی کوئی بات بری لگی تو وہ برملا اس کا ہرگز اظہار نہیں کرے گا۔ خالص اور کلاسیکل لکھنوی تہذیب کی ایک مثالی نمایندہ ہماری عزیز بانو واراب وفا بھی ہیں۔ اور ان کی طرح کی ابھی بہت سی خواتین و حضرات لکھنؤ شہر میں موجود ہیں۔ پرانی دہلی اس لحاظ سے بہت بدقسمت رہی۔ یعنی پرانا لکھنؤ ماشاءاللہ صحیح و سالم باقی ہے۔ 1947 عیسوی کی تباہی میں پرانی دہلی کے زیادہ تر خاندان ہجرت کر گئے۔ ان ہی میں سے ایک کنبہ شمس العلما مولانا ذکا اللہ کا تھا جن کے صاحبزادے مولوی عنایت اللہ (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) تھے۔ انھوں نے اپنے احاطے میں نہایت خوب صورت Zoo بنا رکھا تھا۔ چھوٹے بھائی رضا اللہ۔ دونوں بھائی دہرہ دون میں رہتے تھے۔ چچا رضا اللہ کی بیگم ہماری والدہ کی ہی طرح کی ایک پائنیر خاتون تھیں۔ ان کا آبائی مکان پرانی دہلی میں تھا۔ مجھے محلّے کا نام یاد نہیں۔ یہ ایک وضع قدیم کی وسیع اور کشادہ حویلی تھی۔ غالباً عہد مغلیہ کے ڈومسٹک آرکیٹکچر میں زیادہ تنوع موجود نہیں تھا۔ قدامت پسندی اس کی ایک وجہ تھی۔ ان تمام مکانوں کا ایک ہی پلان تھا۔ کمرے چوکور کے بجائے طویل ہوتے تھے۔ ان میں ایک قطار میں چار یا چھ دروازے جو بیرونی دالان میں کھلتے تھے۔ یہ پچھلا کمرہ در دالان کہلاتا تھا۔ اس عقبی دیوار کے پیچھے عموماً گلی ہوتی تھی صحن میں اگر مکان بڑا ہوتو ایک کونے میں باورچی کھانہ اور دوسرے میں بیت الخلاء۔ اس طرح حفظان صحت کا خیال شاید زیادہ نہیں رکھا جاتا تھا یہ ایک قابلِ ذکر اور دلچسپ بات ہے کہ پنجاب کے مکانوں میں بیت الخلا چھت کے اوپر ہوتا تھا۔

ہمارے امیر سے امیر گھرانوں میں بھی باورچی کھانوں کی عموماً دیواریں دھنویں سے کالی ہوتی تھیں۔ ایک مثل مشہور تھی۔ پکانے کی جگہ ہندوؤں کی اچھی، کھانے کی جگہ انگریزوں کی اچھی، کھانا مسلمانوں کا اچھا۔ کشادہ صحنوں میں انار یا لیموں کا درخت ضرور ہوتا تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے گھروں کے نقشے میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ البتہ ہندو مکانوں میں ایک چوکور گملے کے

اندر تلسی کا پودا لازمی تھا۔ جس کے نیچے گھر کی بہو شام کے وقت چراغ روشن کرتی تھی۔ ہندوؤں کے مکانوں میں کمرے عموماً بہت چھوٹے ہوتے تھے وہاں تنگی کا احساس غالب رہتا تھا جبکہ مسلمانوں کے مکانوں میں وسعت اور کشادگی نظر آتی تھی۔ ہندو مکانوں میں حفاظت کے خیال سے سلاخوں دار کھڑکیاں اور بعض مکانوں میں صحن کے اوپر سلاخوں کی چھت بھی ہوتی تھی کیونکہ عموماً وہ اپنا روپیہ، سونا، چاندی اور گہنے گھر ہی میں رکھتے تھے۔ مسلمان بھائی عموماً اتنا مال دار نہیں تھا بہ قول شخصے چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔ اور اچھے سے اچھا کھانا کھانے کا شوقین تھا۔ لہٰذا کم مایہ گھرانوں کی عورتیں بھی بہترین کھانا پکانا جانتی تھیں۔ اس لحاظ سے مغلیہ تہذیب چینی اور فرانسیسی تمدن کی ہم پلّہ تھی دسترخوان، طرز رہائش، ملبوسات زیورات میں نت نئی نفاستیں اختراع کرنا مسلمانوں کا مرغوب مشغلہ رہا۔ مسلمان بادرچیوں کے لیے مثل مشہور تھی کہ وہ دو پیسے کی دال پر اشرفی کا بگھار لگاتے ہیں یعنی ان کی بگھار لوازمات انتہائی بیش قیمت ہوتے تھے۔ مغلیہ دسترخوان میں ایران و توران، عربستان سے لے کر چین و ماچین تک کے کھانے شامل تھے۔ ہندستانی مصالحوں نے ان کھانوں میں چار چاند لگائے تھے ورنہ ایران وغیرہ کے کھانے خاصے پھیکے سیٹھے ہوتے ہیں۔ مرچیں ندارد۔ انگریز اپنے ابلے اور سیٹھے کھانوں کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن مشرق پر تسلط جمانے کے بعد انھیں یہاں کے انواع واقسام کے پکوان کی عادت پڑ گئی۔ اور رفتہ رفتہ ہندستان اور انگریزی ملے جلے دسترخوان کا رواج ہوا۔ دو سو سال ہندستان میں رہ کر انھوں نے اپنے کھانوں میں بہت سے ہندستانی مصالحے شامل کیے۔ کباب کے علاوہ Pilaf کے نام سے ان کے مینو میں شامل ہوا اور Curry بھی بہت مقبول ہوئی۔ چنانچہ اب نوبت یہ آئی ہے کہ انگلستان میں بے شمار ہندستانی ریستوراں کھل گئے ہیں جہاں انگریز نہایت رغبت سے پلاؤ قورمہ اڑاتا ہے۔ اب انگریز بھی چٹورا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف حفظانِ صحت کے چکر میں بہت سے فرنگی سبزی خور بن چکے ہیں۔ ہندستان میں بے شمار ہندو اب Vegetarian نہیں رہا۔ کایستھ پہلے بھی ماس کھاتے تھے کشمیری پنڈت ہمیشہ سے گوشت خور رہا ہے عام طور پر ہندو گھرانوں میں Non-vegetarian ہوتے ہیں اور عورتیں اپنے قدیم مسلک

کی پابندی کرتی ہیں۔

ہندستان ایک عجیب و غریب ملک ہے جہاں قدم قدم پر کھانا پینا بھی ایک متنازعہ فی مسئلہ بن چکا ہے۔ پہلے ہمارے بزرگ جیو اور جینے دو مسلک پر کاربند رہے۔ چنانچہ جو لوگ چند ہزار کی تعداد میں شمال میں درۂ خیبر کے راستے آئے تھے یا جنوبی ساحلوں پر ان کے جہاز لنگر انداز ہوئے تھے وہ رفتہ رفتہ ایک ہزار سال میں بیس کروڑ ہو گئے لیکن مقامی 80 (اسّی) کروڑ کی آبادی میں اس کا تناسب پھر بھی 14 / سے 20 / فیصد رہا۔ فریقین کی رواداریوں کی بنا پر بیرون جات سے آنے والی اقلیت کی تہذیب مقامی اکثریت کے تمدن میں نہ صرف شامل ہوئی بلکہ ان کے برابر کی شریک بھی بن گئی۔ اب اگر تمام حالات خوشگوار رہتے جسے انگریزی میں کہتے ہیں Other things being equal تو آپسی ٹکراؤ کا کوئی اہتمام نہ رہتا لیکن انسانی سماج میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ یہاں بھی جنگل کے قانون کے مطابق طاقت ور کمزور پر حاوی آتا ہے۔ چنانچہ فوجی طاقت سماجی مساوات کے مسلک اور ذات پات کے بندھنوں سے بے نیازی کی بنا پر بیرونی اقوام مقامی آبادی پر غالب آئیں۔

ہمارے یہاں تاریخ کو جس انداز سے لکھا گیا ہے اس کے بنیادی نسخے ہی میں گڑبڑ ہے۔ یعنی درسی کتابوں میں پہلا عنوان ہوتا ہے Coming of Aryans دوسرے Muslims invasinos یعنی آریہ تو آئے گویا انھوں نے مقامی آبادیوں پر حملہ نہیں کیا بلکہ محض تشریف لائے اور مسلمان حملہ آور ہوئے۔ اس طرح ڈیڑھ دو سو سال سے بچوں کے ذہنوں میں چند مفروضے جاگزیں کر دیے گئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ خود ہمارے مسلمان مورخین نے حملوں اور لڑائیوں کو نہایت توصیفانہ اور رومانٹک انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ فلاں راجہ مارا گیا۔ لیکن فلاں سپہ سالار نے جامِ شہادت نوش کیا۔ ہر بادشاہ کا لقب غازی تھا۔ یہاں تو محض کفر و اسلام ہی کی تفریق تھی۔ انگریزوں نے مفتوح اقوام مشرق کو نیم وحشی گردانا۔ شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کتابوں میں عام طور پر اہل ہند کو Black man لکھا جاتا تھا۔ یعنی ایک گورا چٹا نیلی آنکھوں والا پنجابی پٹھان یا کشمیری بھی ان کے لیے Black man تھا۔ اہل فرنگ کے نوکر چاکر

بھی زیادہ تر دلت ذاتیوں سے تعلق رکھتے تھے وہ تو بے چارے یوں ہی حقیر فقیر لوگ تھے لیکن صاحب بہادر نے اونچی ذات والوں کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کے نزدیک بقیہ امرا محض عیاش اور ستم پیشہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان کی عورتیں زنان خانے میں محصور تھیں۔ اہل فرنگ محض ''ناچ گرل'' اور آیاؤں سے واقف تھے۔ میرا اتفاق سے انگریز سرکار کی تخلیق کردہ اس بیرا خانساماں، آیا والی جماعت سے بچپن سے سابقہ رہا۔ اس وقت اضلاع کی سول لائنز تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہو گئی تھی اور وہاں کی سوسائٹی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے تخلیق کیا تھا ایک مستحکم روایت بن چکی تھی۔ میں نے شاید پہلے کہیں لکھا ہے کہ انگریزوں نے اعلیٰ درجے کے مغلیہ ایڈمنسٹریشن کی بنیادوں پر نظامِ حکومت کو استوار کیا۔ صوبے دار کی جگہ گورنر آیا۔ عہدہ داروں کے نام وہی رہے۔ گو ان کی حیثیت گھٹا دی۔ مثلاً فوج کا صوبے دار میجر ایک معمولی Non-Comissioned افسر تھا اور کہاں صوبہ دار بنگالہ اور صوبہ دار دکن وغیرہ وغیرہ سنسکرت استھان سے تھانہ اور تھانے دار بنا۔ عدالت کے معمولی اہل کار ناظر پیش کار کہلائے۔ منشی یعنی لکھنے والا ایسا مقبول ہوا کہ گجرات میں ایک ہندو خاندانی نام بن گیا۔ اس کے علاوہ بنگال میں سرکار یعنی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ، مجمدار، مجموعہ دار، تعلقہ دار ہالڈر یعنی حوالدار وغیرہ سب ہندوؤں کے Sur name بن گئے۔ لیکن تعصبات میں کوئی منطق نہیں ہوتی۔ اگر آپ کا خاندانی نام سرکار اس دور کی یادگار ہے جب آپ کے اجداد سلاطین بنگالا کے ایڈمنسٹریشن میں سرکار تھے یعنی کسی ڈپارٹمنٹ کے افسر تھے، تو ضروری نہیں کہ آپ کو اس پورے دور کی تاریخ اور اس میں خود اپنے پرکھوں کے رول کا علم بھی ہو۔ تاریخ کے یہ انگنت فوٹ نوٹ ہیں جنھیں کوئی یاد نہیں رکھتا۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ شمالی ہند کے علاوہ آسام، بنگال، دکن، گجرات وغیرہ کتنی عظیم الشان اور ہمہ گیر تہذیبیں تھیں جس میں ایڈمنسٹریشن کی زبان فارسی نے کس حد تک مقامی بھاشاؤں کو متاثر کیا کہ ان میں بیس فیصد سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ شامل ہو گئے جو آج تک مشتمل ہیں بعض فارسی الفاظ تو ایسے ہیں کہ ان کا سنسکرت مترادف عام طور پر روزمرہ کی زبان میں اتنی آسانی سے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً نرسنگھ کی فارسی شعر ہی زیادہ آسان ہے۔ اس طرح بہت سے

الفاظ جن کی اصل فارسی ہے لیکن وہ ہمارے ہندستانی زبانوں میں اپنی حلاوت یا چاشنی کی وجہ سے گھل مل گئے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ بہادر کو ہی لیجیے مکان، کرسی، قلم، مقدمہ، وکیل، دوا، نان، خوان، تکیہ، رضائی، لحاف، توشک، چمچہ، پیالہ، دیگچی، باورچی وغیرہ وغیرہ۔

تاج محل ہوٹل کا کوک، باورچی یا خانساماں کہلائے گا رسویا نہیں۔ ہر لفظ کے اپنے Association ہوتے ہیں۔ کوٹھی اور بنگلے سے سول لائنز کا تصور منسلک ہے۔ ان کے متبادل سنسکرت لفظ لائے گئے لیکن وہ مقبول نہیں ہو سکے۔ فارسی زبان کی روانی اور حلاوت کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ بیک وقت لٹریچر اور روزمرہ کی زبان بھی رہی۔ تعجب ہوتا ہے کہ سعدی اور حافظ کو ہم آج بھی Archaic نہیں سمجھتے اور اسے روانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ جبکہ شیکسپیئر کی زبان اور بعد کی انگریزی میں بہت بڑا فرق رونما ہوا۔

متوسط طبقہ ابھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا۔ ایک مغل بادشاہ شاید فرخ سیر نے بھی اپنی بیگم کے علاج کے لیے پرتگالی ڈاکٹرنی کو بلایا تو اس نے معاوضے کے طور پر بجائے ہیرے جواہرات کے اپنے عیسائیوں کو آباد کرنے کے لیے نواح دہلی میں تھوڑی سی زمین کی فرمائش کر لی تھی جو بادشاہ سلامت نے بغیر سوچے سمجھے اس کو عطا کر دی اس نے وہاں فی الفور ایک گرجا تعمیر کروایا۔ شفاخانہ اور مدرسہ کھولا اور اپنے دیسی عیسائیوں کو وہاں آباد کر دیا۔ وہ علاقہ آج تک مسیح گڑھ کہلاتا ہے جہاں مشہور و معروف کرسچین ادارے مع ہولی فیملی اسپتال موجود ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوروپین جو یہاں قدم جمانے آئے تھے مرد اور عورتیں کتنے دوراندیش اور ہشیار تھے اور اسی خردمندی کی وجہ سے انھوں نے آدھی دنیا پر اپنے پرچم لہرائے۔ مشنریوں کی نیک نامی اور ان کی تعلیم و تربیت کی شہرت اتنی بڑھی کہ قدامت پرست پردے دار گھرانوں میں مشنری ڈاکٹرنی، نرسوں اور ٹیچروں کو بلایا جانے لگا۔ سب سے زیادہ اہم اور فائدہ مند ڈاکٹرنی اور نرس ثابت ہوئیں۔ شروع شروع میں خاصی تعداد میں ہندو لڑکیاں اور اِکّا دُکّا ستم رسیدہ مسلمان لڑکیوں نے بھی نیا مذہب قبول کر لیا۔ چند مسلمانوں نے عیسائی خواتین سے شادی کی اور ان کی اولاد نے بھی اپنے ماں کا دین اختیار کیا۔ اختر قمر اور زہرہ قمر ہماری والدہ کی بچپن کی سہیلیاں تھیں جو اپنے

والد کی بے نیازی کی بدولت عیسائی ہو گئی تھیں۔ اب ان کی طرز رہائش اور کردار و گفتار میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ وہ سوشل ضابطے اور سوشل تعلقات کے اصولوں کی زیادہ سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ مثلاً اگر انھیں کوئی چھوٹا سا تحفہ دیا جائے تو گھر پہنچ کر وہ خط کے ذریعے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کرتی تھیں۔ اگر ان سے کسی معمولی کام کے لیے کہا جائے تو ہمیشہ اسے پورا کرتی تھیں اور کبھی یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں کہ اُے بے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ مشنریوں نے خانگی ملازمین کے طبقے کو کس طرح متاثر کیا تھا ہمارا ایک نوکر دولت مسیح جب کھانا کھانے کے لیے بیٹھتا تھا تو پہلے دوزانو جھک کر کہتا اے ہمارے آسمانی باپ تو نے مجھے آج کی روٹی مہیا کی اس کے لیے میرا شکرانہ قبول کر۔ یہ نوکر کوارٹر میں اپنے کمرے یا کوٹھریاں بھی بے حد صاف ستھری اور سجا کر رکھتے تھے۔ صفائی کا حکم سب سے زیادہ اسلام میں دیا گیا ہے۔ لیکن ہماری ماماؤں اور اصیلوں کے میلے کچیلے کپڑوں کی مثال دی جاتی تھی اُے بے یہ کیا ماماؤں کی سی گت بنا رکھی ہے وغیرہ۔ جبکہ آیائیں سفید لہنگے سفید کرتے دوپٹے میں صاف ستھری گھومتی تھیں ان کا یہ لباس میموں نے شاید خاص طور پر اختراع کیا تھا۔ ان کا لہنگا بہت گھیر دار ہوتا تھا اور یہ سفید پوشاک شاید انگریز Nany کی سفید سائے کی مناسبت سے بنائی گئی تھی۔ لہنگا ٹخنوں سے ذرا اونچا اور میموں کے سائے سے قدرے نیچا ہوتا تھا۔ گویا لہنگے اور انگلش گاؤن کے بین بین یہ لباس رائج کیا گیا تھا۔ شام کے وقت یہ آیائیں اپنی سفید پوشاک میں ملبوس اپنے صاحب لوگ کی گوری اولاد کی Permbulater ڈھکتی سول لائنز کی سڑکوں پر نکلتی تھیں۔ ذرا بڑے بچے ان کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چلتے تھے تو یہ گویا برٹش امپائر کے گونا گوں بوقلموں دل فریب نظاروں میں سے ایک نظارہ تھا۔ آیا ایک غیر معمولی ہستی تھی۔ اینڈو برٹش سوسائٹی میں ایک اہم حیثیت کی مالک تھی۔ ہمارے یہاں بھی انا اور کھلائی کی جگہ آیا آ گئی۔ آیائیں بھی اس نئی دوغلی تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ ''یہ کچن انگلش'' بولتی تھیں۔ اکثر دولت مند طبقے کی عورتیں تھیں جن کے ماں باپ کو مشنریوں نے عیسائی کیا تھا۔ بیرا خانساماں اور آیا کا یہ مثلث کوٹھی یا بنگلے کی نئے تمدن کا محافظ تھا۔ انگریزی کی مثل ہے More Catholic than the Pope یہ شاگرد پیشہ گویا کالے انگریز تھے۔ جب یہ اپنے محلّے یا گاؤں

میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاتے تھے تو وہ بے چارے ان سے بہت مرعوب ہوتے تھے۔
بڑے دن کی ڈالی اس سوسائٹی کی ایک اور روایت تھی۔ بڑے دن کی ڈالی کے علاوہ عید بقرعید اور ہولی دیوالی کے مواقع پر بھی مسلمان اور ہندو افسروں کے یہاں ڈالیاں آتی تھیں۔ یہ نذریہ تحائف کے مانند مغرب میں کرسمس کے تحفے اب ایک بہت بڑی انڈسٹری بن چکی ہے۔ کرسمس کارڈ پر باموقع اشعار زریں حروف میں موجود ہوتے تھے۔ عید کارڈ کی دیکھا دیکھی ہولی اور دیوالی کے تہنیتی کارڈ بھی رائج ہوئے۔ مسلمانوں کی طرح ان کے یہاں تہوار کے موقع پر گلے ملنے کی رسم شروع ہوئی۔ یہ ڈالیاں خشک میوے کے ایک چیسٹری اور پھل اور گلدستہ وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ غازی پور چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے انگریزوں کا ایک اہم مرکز رہا تھا۔ یہاں بہت ہی اعلیٰ درجے کی کیک اور پسٹری بنائی جاتی تھی۔ ایک کیک اب تک یاد ہے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے کی شکل میں بنایا گیا تھا خورد و نوش بھی ایک امپریل تہذیب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ مغلیہ طباخی ہمارے یہاں آج تک ان ہی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔

لفظ نرس ہمارے یہاں ہسپتالوں کے لیے مخصوص ہو گیا لیکن انگلستان میں نرس بچوں کی کھلائی کو کہتے ہیں اور اس کی مناسبت سے بچوں کے کمروں کا نام نرسری کہلایا۔ انگلستان اور یورپ میں ہر چوبیس گھنٹے گذارنے کے لیے مختلف کمرے بنائے گئے تھے جن کا تذکرہ مرزا ابوطالب اصفہانی نے اپنے سفرنامہ 1799 میں کیا۔ ہمارے یہاں عام طور پر یہ رواج نہیں تھا جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے۔ دالان در دالان میں سارے خاندان کے بیش تر افراد کے لیے پلنگ بچھے ہوتے تھے اور وہیں پر وسط میں تخت یا فرش پر مسند اور گاؤ تکیے جہاں دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا جاتا تھا دہیں ماما یا اصیل یا ''اوپر کا کام کرنے والا چھوکرا'' چلمچی یا لوٹا اور صابن دانی لاکر دہلیز میں رکھتا اور سب کے ہاتھ دھولاتا۔ فرنگی چھری کانٹے سے کھاتے تھے لہٰذا انھیں ہاتھ دھونے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دلان کے دروں کے نیچے چنبلی یا موتیا کی کیاریاں بنائی جاتی تھیں تا کہ ان پودوں کو متواتر پانی ملتا رہے۔ صحن کی دیوار سے متصل گھڑونچی پر گھڑے اور صراحیاں رکھی جاتیں اور انھیں مرادآبادی کٹوروں سے ڈھکا جاتا۔ گرمیوں میں موتیا کے ہار ان پر لپیٹ دیے

جاتے۔ صبح کے وقت دالان میں پلنگوں کے بستر لپیٹ کر سرہانے رکھ دیے جاتے اور دن بھر کنبے کے افراد کا جماؤ وہیں رہتا۔ گویا پلنگ ہمارے یہاں کھانے کی میز اور صوفہ کا بھی کام دیتا تھا۔ یہ طرزِ زندگی ابھی تک روایت پسند گھرانوں میں موجود ہے۔ گو عہد ایسٹ انڈیا کمپنی سے بہت سے انگریزی طور طریق اور فرنیچر خالص ہندستانی گھروں میں بھی پہنچ گئے۔ پلنگ ولایت میں محض رات کو سونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں وہ دن میں صوفے اور آرام کرسی کا کام بھی دیتا ہے۔ ولایت میں بیڈ روم ایک نہایت خصوصی اور پرائیویٹ جگہ ہے۔ ہمارے یہاں یہ کمرہ دن میں سٹنگ روم بھی بن جاتا ہے۔ چونکہ ہمارے طرزِ زندگی میں مکان کی بہت اہمیت ہے خصوصاً خواتین کا زیادہ وقت گھر ہی میں گزرتا ہے۔ ان کی جائے رہائش گویا ان کا لیڈیز کلب بھی ہے۔ خاندانی جھگڑے چکانے کا مرکز بھی اور شادی بیاہ کے مواقع پر تو اس کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں ہفتوں پہلے سے مہمان اور ان کے بچے آکر رونق بڑھاتے ہیں۔ اس کے برعکس اہلِ مغرب کے یہاں شادی گرجا گھر میں ہوتی ہے جہاں چند دوست مدعو کر لیے جاتے ہیں۔ مسلمان جب ہندستان میں آئے تو سوائے بنیادی، مذہبی فریضے یعنی نکاح کے علاوہ تقریباً ساری رسمیں ہندوؤں کی اپنالی لیکن ان میں ایک بین فرق یہ رہا کہ ہندوؤں میں بعض جگہ لڑکی کا باپ دولہا کے پاؤں دھوتا ہے ہمارے یہاں لڑکی کے باپ اور بھائی وغیرہ کی بے حد عزت کی جاتی ہے۔ اودھ کے مسلمان گھرانوں میں لڑکی کے ماں باپ پس منظر میں رہتے ہیں اور سارے مراسم دوسرے بزرگ ادا کرتے ہیں۔ لڑکی کی ماں اچھے کپڑے بھی نہیں پہنتی۔ ہندستانی سوسائٹی میں شادی اہم ترین تقریب ہے۔ قدامت پرست گاؤں میں مہمان لڑکی والوں کے یہاں آکر کھانا بھی نہیں کھاتے۔ گویا اس طرح دولہن کے باپ کو مزید زیرباری سے بچاتے ہیں۔ ایک زمانے میں وضع داری کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی شخص ایسے گاؤں میں جاتا تھا جہاں اس کی گاؤں کی کوئی لڑکی بیاہی تھی تو وہ اس گاؤں کا پانی نہیں پیتا تھا یعنی بیٹی کے گھر کا پانی پینا بھی باعث شرم تھا۔ یہ ساری رسوم اور پابندیاں مسلمانوں نے اپنے پڑوسی ہندوؤں سے سیکھیں اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہوئے۔ آج کل جبکہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں اجنبی بن کر رہ رہے تو کوئی اللہ کا بندہ میڈیا

کے ذریعے ان حقائق پر روشنی نہیں ڈالتا۔ طلاق اور عقد بیوگان ہمارے یہاں ہندوؤں کی تقلید میں معیوب سمجھا گیا۔ بیوہ عورتیں ساری عمر سفید کپڑے پہنے کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں وغیرہ۔ یہ سب خالص ہندوانی رسوم تھیں۔ مسلمانوں میں صدیوں سے رائج ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب لکھنؤ میں والد کا انتقال ہوا تو اماں کے چچازاد بھائی میجر آلِ حسنین "رنڈسالہ" لے کر آئے جو ان کی والدہ نے مرآدآباد سے اماں کو بھجوایا تھا۔ جو ایک سفید جارجٹ کی ساڑی اور سونے کی چوڑیوں پر مشتمل تھا۔ یہ چیز لاکر انھوں نے والدہ کے قریب رکھیں اور بیٹھ کر خوب روئے۔ یہ منظر ایک مغربی مبصر کے سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ چوڑیاں بالخصوص کانچ کی چوڑیاں محض اس برصغیر کا گہنا ہے - ہری کانچ کی چوڑیاں سہاگ کی نشانی ہیں اور سارے مشرق کی عورتوں کی چوڑیاں کی نہ کوئی معنویت ہے اور نہ اہمیت۔ ایک پُراسرار واقعہ یاد آتا ہے جب ساحرلدھیانوی کا انتقال ہوا اور صبح صبح میں ان کے یہاں پہنچی۔ چند خواتین تعزیت کے لیے آچکی تھیں اور برآمدے میں فرش پر بیٹھی تھیں۔ اتنے میں سیاہ ساڑی میں ملبوس ایک پُراسرار خاتون برآمدے میں داخل ہوئیں اور دیوار کے سہارے فرش پر بیٹھ کر انھوں نے اپنے قریب کی میز سے کوئی بھاری چیز شاید راگ دانی اٹھائی اور اس سے زور زور سے اپنی کانچ کی چوڑیوں پر مارا اور چھن چھن کر کے ساری چوڑیاں توڑ ڈالی۔ اہلِ بمبئی جیو اور جینے دو کے مقولے پر عمل کرتے ہیں اور کسی غیر معمولی بات پر بھی متعجب نہیں ہوتے۔ چنانچہ ساری بیبیاں بے نیازی سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں۔

لیکن اواخر انیسویں صدی سے ہی مسلم سماج میں نئی روشنی کی کرنیں پہنچ چکی تھیں۔ علی گڑھ تحریک اس نئی جاگیرتی کی محرک تھی۔ لاہور مسلم تجدیدیت کا ایک بڑا مرکز بنا چونکہ یوپی صدیوں سے انڈومغل تہذیب کا گہوارہ رہا تھا۔ یہاں کے مسلمان سماجی لحاظ سے زیادہ قدامت پرست تھے۔ جبکہ اہلِ پنجاب کو اس قسم کی پابندیوں کا زیادہ سامنا نہیں کرنا پڑا۔ چنانچہ پنجابیوں نے نئے رجحانات زیادہ سرعت سے قبول کیے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان تینوں یکساں طور پر ترقی کے خواہاں تھے لیکن اس زمانے میں دونوں فرقوں میں مذہبی تحریکوں نے حالات کو مختلف ڈھنگ سے متاثر کیا۔ احمدی تحریک خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے برطانوی سرپرستی

کے زیرِ سایہ اپنی تبلیغ شروع کردی۔ اب پنجاب ایک نوع کے مذہبی میدانِ جنگ میں تبدیل ہوگیا۔ یہ جنگ اردو اخبارات اور رسائل کے ذریعہ لڑی گئی۔ مذہبی مناظرے ایک قسم کے شو بزنس بن گئے۔ یہ مناظرے عیسائی اور مسلمان، احمدی اور غیر احمدی، آریہ سماجی اور مسلمانوں کے مابین خوب خوب منعقد ہوئے اور بڑی گہما گہمی رہی۔ برٹش سرکار نے ان مناقشوں کو مزید ہوا دی تاکہ قوم پرستی کی تحریک جو رفتہ رفتہ زور پکڑ رہی تھی، اس میں رخنہ پڑے۔ حکومت نے اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کی اور پنجابی مثالی دل جمعی اور گرم جوشی کے ساتھ اردو کی آبیاری میں جٹ گئے۔ لاہور اردو صحافت اور نئی اردو ادب کے اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں سے شایع ہونے والے "نیرنگ خیال"، "عالمگیر"، "ہمایوں" وغیرہ نے سارے ملک پر اپنی دھاک بیٹھا دی۔ مولوی ممتاز علی کے دارالاشاعت پنجاب نے زنانہ ہفتہ وار اخبار "تہذیبِ نسواں" 1898 سے شایع کیا۔ اس کے بعد ہفتہ وار اخبار "پھول" بنتِ نذر الباقر جو اس وقت ایک نامور مضمون نگار بن چکی تھی، مولوی ممتاز علی نے ان کو "پھول" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہ دونوں اخبار اتنے معیاری اور اعلیٰ درجے کے تھے کہ تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی ان کی ٹکر کے زنانہ رسالے یا بچوں کے اخبار اس برصغیر میں آج تک شایع نہ ہو سکے۔ یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات ہے کیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر نئی تحریک اپنے ابتدائی جوش و خروش کے دور میں خوب پھلی پھولی ہے۔ اس کے بعد جوش ذرا کم پڑ جاتا ہے یا حالات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ایم۔اے۔او۔ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تجویز کا سارے برصغیر کے مسلمانوں نے بالخصوص ان کی خواتین نے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ ایک "One-rupees" فنڈ بھی قائم کیا گیا۔ ساری تحریکوں میں مس نذر الباقر پیش پیش رہیں۔ یہاں یہ نقطہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ نئے اینڈو برٹش سماج کے ایک رکن کی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو آنسہ کے بجائے مس کہلوایا۔ انھوں نے غرارہ ترک کیا اور ایڈورڈین گاؤن اور غرارے کو ملا جلا کے نئی پوشاک اختراع کی اور وہ ان کے حلقے میں اور سماجی طبقے میں بہت مقبول ہوئی۔

چونکہ ہمارے یہاں سوشل ہسٹری بہت کم لکھی گئی ہے اور اس زمانے کی تصویریں بھی

تقریباً ناپید ہیں اس لیے وہ سارے دلچسپ اور عمل پسند اب تک گمنام رہے۔ بنگالیوں نے اپنے یہاں کی سوشل ہسٹری پر خوب خوب لکھا۔ اردو کے زنانہ رسائل بھی ان موضوعات پر خود خواتین نے نہایت قابل قدر مضامین شایع کیے لیکن ان سب کو یکجا کر کے ان پر ریسرچ کرنے کی یا انھیں کتابی صورت میں شایع کرنے کا آج تک کسی کو خیال نہیں آیا۔

مسلمان عورتوں کی یہ جاگرتی اس قدر ہمہ گیر تھی اور صوبہ سرحد سے لے کر مدراس اور آسام سے لے کر سندھ اور گجرات تک لکھنے والیوں کی ایک جماعت کیسے پیدا ہوگئی تھی۔ اس پر غور کیجیے تو تعجب ہوتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خواتین پردہ نشین تھیں اور انھوں نے کسی کالج اور اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں ریڈیو بھی نہیں تھا۔ محض اخبارات، رسائل اور کتابیں جو وہ حاصل کر سکتی تھیں ان ہی کے ذریعے وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتی رہیں اور اگر ان کے باپ بھائی اور شوہران کی ہمت افزائی نہ کرتے تو اور کوئی ان کا پُرسانِ حال نہیں تھا چونکہ گنتی کی چند مسلمان لڑکیاں عیسائی ہوگئی تھیں۔ مسلمان عام طور پر مشنریوں سے بہت بدگمان اور خائف تھے۔ میرے خیال میں دنیا کے کسی اور ملک میں دورِ جدید کے ان خطرات و خدشات اور آزمائشوں کا سامنا نہیں کیا ہوگا۔ جتنا بے چارے مسلمانوں کو اٹھارہ سو ستاون (1857) کے بعد اس برصغیر میں کرنا پڑا۔ ایک کے بعد ایک آفت۔ ہمیں عہدِ مغلیہ کے شب و روز کا تو کوئی علم نہیں کہ اس میں ایک عام مسلمان کنبے کا ٹائم ٹیبل کیا تھا۔ اس کی عورتیں کس طرح رہتی سہتی تھیں۔ ہم نے جو کچھ پڑھا ہے وہ زیادہ تر رومانٹک افسانے ہیں۔ انگلستان کے پچھلی صدیوں کی خواتین نے روزنامچے لکھے۔ جن کے ذریعے ہمیں اس زمانے کی بیش تر گھریلو حالات سے واقفیت حاصل ہوگئی ہے۔

ہندستان میں دراصل ایک متوسط طبقہ موجود ہی نہیں تھا۔ یا چند لوگ بہت امیر کبیر تھے اور باقی بہت غریب۔ امرا کے حاشیہ بردار اور نوکر چاکر اس وقت کی مڈل کلاس نہیں کہلائے جا سکتے۔ کیونکہ معاشرے کا ایک طبقہ نفسیاتی طور پر خودمختار اور آزاد ہوتا ہے۔ یہ معاشی اور اس کے ساتھ سیاسی آزادی یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد لوگوں کو حاصل ہوئی اور اس آزادی کے حصول میں

مغرب کے نئے مفکرین نے بہت اہم رول ادا کیا۔ کیونکہ وہاں مشرق کے مقابلے میں تعلیم کا چرچہ بہت زیادہ تھا۔ جابجا یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ آزادیٔ افکار کا تذکرہ شروع ہو چکا تھا۔ یونانِ قدیم کی روایات کو ازسرِ نو دریافت کیا گیا تھا۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی ستم ظریفی یہ رہی کہ خلافتِ ہسپانیہ کے راستے سے یورپ کا کلاسیکل ورثہ فرانس، جرمنی اور انگلستان وغیرہ میں پہنچا۔ لیکن خود مسلمانوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور خوابِ غفلت میں مبتلا ہو گئے۔ ایک پوری قوم اگر سارے مسلمانانِ عالم کو بہ لحاظ مذہب ایک قوم کہا جائے تو دنیا کی اتنی بڑی آبادی بیک وقت اچانک اتنی پسماندہ کیوں رہ گئی؟ جس قوم نے سائنس ریاضی اور فلکیات اور فلسفے میں اتنی عظیم الشان کارنامے انجام دیے تھے۔ سولھویں، سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے جہالت اور پسماندگی کا سمبل کیوں قرار پائی۔ ایک اندلسی مسلمان ماہر فلکیات کے بجائے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز پہلوان کے کش لگاتا۔ عیاش ترک یا عرب سلطان عالم اسلام کا نمائندہ کیوں تصور کیا گیا۔ قلم کے بجائے تلوار مسلمان کا ہتھیار کس وجہ سے کہلائی۔ کیا عیسائی اقوام جنگجو نہیں تھیں۔ کیا ان لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف تباہ کن جنگیں نہیں لڑیں مگر وہ لوگ لڑ بھیڑ کر پھر سنبھل جاتے تھے۔

یورپین تہذیب کو عربوں کی دین کی فہرست بہت طویل ہے اور یہ تہذیب انھوں نے کچھ اسلامی اسپین کے ذریعے حاصل کی کچھ صلیبی جنگوں کے دوران اور کچھ سلطنتِ عثمانیہ کے ذریعے۔ لیکن نئی ایجادات اور خودکار مشینوں سے بے اعتنائی ان کو لے ڈوبی۔ اس بے نیازی کی وجہ آخر کیا تھی کاہلی اور تقدیر پرستی اور قدامت پسندی۔ قدامت پرست انگریز بھی تھا اور آج تک ہے۔ قدیم مذہبی رسوم کی پابندی کا یہ حال ہے کہ عہد نامہ قدیم کے مطابق عہد عتیق میں اسرائیل کے بادشاہوں کے سر میں تیل سے مسح کر کے ان کی تاج پوشی کی جاتی تھی چنانچہ اسی لفظ مسح سے مسیح نکلا ہے یعنی تیل سے سر کا مسح کیا گیا۔ قدامت پرستی کا معاملہ یہ ہے کہ جب ملکہ الزابیتھ دوئم کی تاج پوشی ہوئی میں لندن میں موجود تھی اور تبھی میں نے ٹیلی ویژن پر اس کا منظر دیکھا جو سیدھا ویسٹ منسٹرایبے سے ٹیلی کاسٹ کیا جارہا تھا (لفظ ایبے ابیٹ بھی ابا سے نکلا ہے) اس میں الزابیتھ

ایک کرسی پر بیٹھی تھیں اور لاٹ پادری یعنی آرچ بشپ آف کینٹر بری مختلف رسوم ادا کر رہا تھا۔ جو ہمارے یہاں کے کسی برہمن پروہیت کے پوجا پاٹ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی پھر سب سے پراسرار رسم ادا کی گئی جس کے لیے ایک پردہ تان دیا گیا۔ لہٰذا ٹیلی ویژن اسکرین پر کچھ دکھلائی نہیں دیا لیکن اس پردے کے پیچھے لاٹ پادری نے الزابیتھ کے سر پہ دو چمچہ تیل اُنڈیل کران کو ملکہ بنایا۔ اس کے بعد وہ پردہ ہٹا دیا گیا۔ اب اگر اس قسم کی کوئی رسمیں یا Ritual ہمارے یہاں ہندو پنڈت ادا کرے تو انگریزوں نے اہلِ ہند کو Barbarian پکارا۔ یعنی جو میں کروں وہ ٹھیک جو آپ کریں وہ غلط۔ ہمارے یہاں بھی یہی لفظ مسح موجود ہے جو وضو کے وقت کیا جاتا ہے۔ الفاظ Abbess 'Abbot Abbey' کو لیجیے۔ ان سب کا مصدر ایک ہے یعنی مسیحی روایت کے مطابق صلیب پر جاں کنی کے عالم میں خدا کو پکار کر کہا تھا ابا ابا لما سبقتنی یعنی تو مجھے کیوں چھوڑ کر آگے چلا گیا۔ اب آپ سوچیے کہ الفاظ کا یہ کیا عجیب و غریب پُل ہے کہ جب مسلمان بچے اپنے باپ کو ابا پکارتے ہیں تو گویا وہ حضرت عیسیٰ کے ہم زبان ہیں۔ حضرت عیسیٰ قدیم سریانی یعنی Sriac میں بات چیت کرتے تھے جو Sriya یعنی ملک شام کی زبان ہے۔

الفاظ کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے۔ اس لفظ مسح کو دیکھیے جو دو مختلف تہذیبوں میں یعنی اسلام اور مسیحیت میں ایک ہی معنی میں رائج ہے لیکن دونوں مذاہب کے درمیان بنیادی اعتقادات کی ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے۔ ہم تثلیث کو نہیں مانتے وہ ہمارے نبیؐ کے منکر ہیں چلیے ہو گئی چھٹی۔ چنانچہ ایک ہزار برس تک معرکہ صلیب و ہلال جاری رہا۔ اور آج اس نے ایٹمی جنگ کے خطرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ ابھی چند سال قبل ہی لندن کے ہائیڈ پارک میں ایک گتے کا عظیم الجثہ کٹ آؤٹ مجھے نظر آیا جس میں ایک شمشیر بکف مسلمان شہسوار حملہ آور دکھلایا گیا تھا۔ اس کٹ آؤٹ کے نیچے لکھا تھا "A Muslim Terrorist"

قومی امیج بنتے دیر نہیں لگتی۔ جب سوامی وویکانند اپنا گیروا لباس پہنے گیتا کا پاٹ کرتے شکاگو کی عالمی مذہبی کانفرنس میں پہنچے اس وقت سے ہندومت کا یہ پرامن امیج مغرب میں مستحکم ہو گیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی جارحانہ کارروائیاں اور خونِ آشامی ضرب المثل بنی۔ خود

ہمارے یہاں اس امیج کو فروغ دیا گیا۔

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

یہ طے شدہ بات ہے کہ جنگی ترانے ہلکے پھلکے امن و آشتی کے نغموں سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ سننے والوں کے دلوں میں ایک ناقابل بیان جوش و سرشاری کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ قاضی نذرالاسلام کا "دو گنگونے باجے ڈول" نے سارے بنگال کو گویا ایک فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا۔ اس کے مقابلے میں نرگس باغ میں، بہار کی آگ میں اتنا مقبول نہیں ہوا۔ جارحانہ نغمے محض ہوا میں نہیں گائے جاتے۔ ان کے لیے ایک غائبانہ حریف یا دشمن کا وجود ضروری ہے۔ شانتی کے پرچارک عیسائی مبلغین نے بھی ایک دشمن یعنی Onti Christ کو سامنے رکھا۔ ان کی تنظیم Salvation Army یا مکتی فوج کہلائی جس کے عہدے دار باضابطہ میجر، کرنل اور بریگیڈیئر وغیرہ پکارے جاتے تھے۔ عیسائیوں کا ایک بڑا ولولہ خیز نغمہ تھا Onwar Christian Soldiers, marching on to war with the cross of Jesus marching on before. عیسائی مبلغین نے جب ہندستان میں اپنا پرچار شروع کیا تو سریلے گیت اور بینڈ باجے عوام کے حواس خمسہ پر بڑے ہی دل نشین طریقوں سے حملہ آور ہوئے۔ بے لوث اور انتھک خدمت خلق، علاج، معالجہ، نرسنگ، درس و تدریس، نرسری اسکول سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین مدارج تک تعلیم و تربیت ورزش، کھیل کود اور حفظان صحت ان کا سب سے بڑا وصف تنظیم اور ڈسپلن تھا۔ جو ہمارے یہاں مفقود رہا۔ جب مشنری دلت افراد کو بپتسمہ دیتے تھے اس کے بعد ان کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ صاف ستھرے گھر، تمیز و تہذیب، شاگرد پیشہ میں مبلغین کا اثر نمایاں ترین رہا۔ ہماری میلی کچیلی ماماؤں اور اصیلوں کے مقابلے میں ان کی صاف ستھری آیائیں اسی نمایاں فرق کی وجہ سے اپنے طبقے کے باقی افراد سے خود کو برتر سمجھنے لگی تھیں۔ دہرہ دون میں ایسے افراد کافی تعداد میں موجود تھے۔ جو ایک پاکٹ میں چٹھیاں سنبھالے اپنے صاحب، میم صاحب کی ولایت واپسی کے بعد "کالا لوگ" کے یہاں تلاش ملازمت میں آیا کرتے تھے اور دبیز نیلے

رنگ کے لیٹر پیڈ پر بڑی بڑی انگریزوں والی لکھائی پر مشتمل سرٹیفکیٹ ہماری والدہ کو دکھلاتے تھے۔ جن میں سابق انگریز صاحب یا میم صاحب نے امام بخش کو کوک یا کریم خاں بیرے کی ایمان داری اور فرض شناسی کی تعریف رقم کی تھی۔ ایسے ملازمین چھٹیوں والے بیرے، آیائیں اور خانساماں کہلاتے تھے۔ اہل ہند سے انگریزوں کا رابطہ زیادہ تر محض ان ہی ملازمین تک محدود رہا۔ انگریزوں کی کوٹھیوں میں تربیت یافتہ نوکروں کی بہت مانگ تھی اور یہ پنجاب وصوبہ سرحد تک بکھرے ہوئے تھے۔

ہماری ایک نہٹوری عزیزہ جن کے والد نے غیر منقسم پنجاب میں بود وباش اختیار کر لی تھی اور خود ان عزیزہ نے لدھیانہ میڈیکل کالج میں پڑھا تھا ان کی شادی بھی لاہور کے ایک مقتدر پنجابی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ تعصب کے کتنے رنگ ہیں۔ انھوں نے مجھے بتلایا کہ ان کی خالص پنجابی سسرالی رشتہ دار یوپی والوں کو بیرا خانساماں پکارتے ہیں۔ کیونکہ یوپی سے گئے ہوئے تربیت یافتہ بیرے خانساماں پنجاب کے مقتدر خاندانوں میں ملازم تھے اور اپنی شائستگی وتمیزداری کی وجہ سے وہاں ان کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کے آقاؤں نے یوپی اور پنجاب کے حیرت انگیز تعصب کے بنا پر سارے یوپی والوں کو بیرا خانساماں پکارا۔ ہندو مسلمان کے علاوہ شیعہ، سنی پنجابی اور یوپی والا۔ بنگالی و بہاری غرض یہ کہ جدھر نظر اٹھایئے تنگ نظری وتعصب کارفرما ہے اور زیادہ تر اس کی کوئی منطق یا سبب بھی موجود نہیں۔

یہاں پر انسانی فطرت کی ایک بنیادی کمزوری ان تعصبات کو جنم دیتی ہے۔ وہ بنیادی رویہ یہ ہے کہ محض ہم سچے ہیں دوسرے سب غلط۔ اسی کمزوری کی وجہ سے اولادِ آدم انگنت فرقوں اور قوموں میں بٹی اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ خود کو حق بجانب سمجھنے اور دوسرے کو غلط قرار دینے کے اس رویے کو مذہبی اختلافات نے مزید ہوا دی۔ خوف ناک جنگیں لڑی گئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف منافرت کے رویے ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے گئے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد اسکولوں میں ایک ہی انگریزی نصاب پڑھایا گیا۔ اس وکٹورین مدارس نے گویا ایک اسٹیم رولر

کا کام کیا۔ دور دراز انگلستان میں چھپنے والی ایک سے ایک خوشنما درسی کتابیں سارے ہندستان میں پڑھائی جانے لگیں۔ ہمارے بچپن میں ایک مقبول ترین کتاب King's Reader تھی۔ جس کے شروع میں کنگ جارج پنجم اور ملکہ مری کی تصاویر شامل تھی۔ انگریز حاکم ضرور تھا مگر بڑی حد تک اس نے اپنی رعایا کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا تھا اور اپنی اس حکمتِ عملی کی بدولت وہ ایک روشن خیال اور بہترین گورا آقا ثابت ہوا۔ ورنہ ولندیزی یعنی ڈچ اور فرانسیسی مقبوضات کی ایشیائی اور افریقی رعایا کی ناگفتہ بہ حالت ان نوآبادیوں کی حصولِ آزادی کے بعد دنیا پر ظاہر ہوئی۔ ان کو نہ مغربی تعلیم سے روشناس کیا گیا تھا اور نا اپنے غیرملکی آقا کے سیاسی معاملات میں اسے کوئی دخل حاصل تھا۔ اس کے برعکس آزادی سے پیش تر برطانوی پارلیامنٹ میں مسٹر سکلات والا بطور ممبر براج رہے تھے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلیہ ہندستان جس سے انگریزوں نے حکومت چھینی ایک نہایت ترقی یافتہ اور روشن خیال ملک تھا جس کا اندازہ ہمیں اب ہو رہا ہے۔ چنانچہ مغلوں کے بہت سے مناسب اور ایڈمنسٹریشن کے ضابطے انگریزوں نے جوں کے توں برقرار رکھے۔ جس چیز میں مغل بیرونی دنیا سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کی مغربی علوم سے بے نیازی اس کی بڑی وجہ تھی۔ مجھ سے میری ایک بہت پڑھی لکھی امریکن دوست نے جو بعد میں نیپال میں امریکن سفیر رہی ایک مرتبہ کہا تھا کہ تم ذرا اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کرو۔ حکومت ان کے ہاتھ سے چھن گئی۔ محض کچھ عرصہ قبل تک برطانوی سفیر کو مغل شہنشاہ کے دربار میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسے کرسی نہیں ملتی تھی اور اب 1857 عیسوی کے بعد اس ضلع کے ایک معمولی انگریز حاکم کے سامنے اپنے جوتے اتار کر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ تمھارے ان بزرگوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔

ریلوے اسٹیشنوں پر Europian only کے ریفرشمنٹ روم، ویٹنگ روم اور ٹرینوں میں ان کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ علاحدہ ہوتے تھے۔ اہلِ ہند سے ان کا رابطہ محض قلی بیرا، خانساماں، آیا اور منشی، چپراسی، کوچوان، سائیس، مالی اور گراس کٹ کے ذریعے قائم تھا۔ ہندستان کے تہوار اور مذہبی تقریبات کی شان و شوکت کو Barbaric splendour پکارتے تھے۔ محرم میں

تعزیوں کے جلوس اور دسہرے کی رام لیلا ملاحظہ کرنے کی غرض سے ان کے لیے مخصوص اسٹینڈ تعمیر کیے جاتے تھے۔ ان کے رعب داب کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی تاریخی امام باڑوں، مندروں یا مغلیہ مساجد کی سیر کرنے کے لیے جاتے تھے تو ان سے جوتے اتارنے کے لیے نہیں کہا جاتا تھا بلکہ ان کے لیے ایسے عظیم الجثہ موزے، بنوائے گئے تھے جنھیں وہ اپنے جوتوں کے اوپر پہن لیتے تھے۔ اٹھارھویں انیسویں صدی سے لے کر 1947 عیسوی تک انگریز بہادر جس رعب داعب سے اس جنت ارضی میں بطور حاکم اعلیٰ قیام پذیر تھا اس کا اندازہ آج کی نسل کر ہی نہیں سکتی اور انھوں نے اپنے لیے دہرہ دون، بنگلور، لکھنؤ، دہلی، پونا اور لاہور وغیرہ وغیرہ میں کیسی حسین اور پرفضا سول لائنز اور چھاونیاں آباد کی تھیں۔ جن کی مثال کسی اور ایشیائی نوآبادی میں نہیں ملے گی اور دور افتادہ اضلاع پہاڑی مقامات اور گھنے جنگلوں کے وسط میں انھوں نے یہ بنگلے کس خوبی سے تعمیر کروائے تھے اور ان کے انجینئر اور معمار کہاں کہاں پہنچے تھے۔ محض کوہستان ہمالیہ کے دور دراز اور خطرناک پہاڑی راستوں سے گزر کر اوپر پہنچنے والے پہاڑوں کے سنگلاخ سطح اور چٹانوں پر یہ شاندار بنگلے کیسے تعمیر کیے گئے۔ اب یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان چٹانوں میں ان کی نیو کس طرح کھودی گئی ہوگی اور یہ شدید باد و باراں اور ژالہ باری سے کس طرح محفوظ رہے۔ اور یہ سب کچھ یہیں چھوڑ کر انھوں نے 1947 عیسوی میں کس غم و اندوہ اور صبر کے ساتھ اس دل فریب ملک کو خیر باد کہا ہوگا۔ مجھے تو محض دہرہ دون کی وہ حسین ترین کوٹھیاں اور ان کے Orchard یاد ہیں۔ لیچی، آم، ناشپاتی، آڑو اور خوبانی کے درختوں میں گھرے خوش نما بنگلے ان کے اندر یہ بوڑھے انگریز اور ان کی میمیں خاموشی کے ساتھ اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی ڈون ویلی کے پرندوں کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہے کوئی فرن کی مختلف اقسام کے متعلق مضمون نویسی میں مصروف ہے۔ واٹر کلر پینٹنگ ایک مرغوب مشغلہ تھا۔ بیلی لاج کی مالک مسز بیل اور ان کی بہن بہترین آرٹسٹ تھیں اور ان کے کمروں کی دیواریں ان کی بنائی ہوئی نہایت سبک اور نفیس واٹر کلر تصاویر سے مزین تھیں۔ یہ دونوں بہنیں شاید گمنام مصور تھیں اور انھوں نے کبھی اپنی نمائش بھی منعقد نہیں کی تھی۔ انگریز نیچر پر عاشق ہے۔ انگلستان میں ہر سال موسم بہار کی آمد پر اخباروں میں خط

چھپتے ہیں۔ آج میں نے فلاں جگہ پہلی کوکو کی آواز سنی۔ today I hard the first Cu cook

چنانچہ جب انگریز یہاں آیا تو یہاں Flora and Fauna کی بہتات اور تنوع دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور فوراً ان مظاہر فطرت کے سائنٹفک مطالعے میں جٹ گیا۔ مغل مصوروں نے بھی پرندوں اور پھول پتوں کی تصویریں خوب بنائی تھیں۔ لیکن ہم لوگ اپنے مختلف ادوار کے فنی ذخیروں سے عموماً بے نیاز رہے۔ بنیادی طور پر ہم اپنے مکانوں کی آرائش کے بھی زیادہ دل دادہ نہیں تھے۔ ہماری تمام تر توجہ ملبوسات، زیورات اور اشیائے خورد و نوش پر مرکوز رہی۔ ماما نے بہترین کھانا پکا کے پتّی میں رکھا تو ہمارے ایک متوسط گھرانے کے افراد نے بان کی چار پائیوں پر زرد فرخ آبادی دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ بستر لپیٹ کر سرہانے رکھ دیے گئے یا تخت پر دسترخوان بچھا۔ باورچی کھانے کی دھوئیں سے کالی دیوار اور اونٹ کی کھال سے بنی ہوئی تیل کپی رات کو روشن کی جاتی تھی۔ اس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں۔ اپنے ملبوسات اور گہنوں کا جتنا خیال رکھا گیا، مکان کے آرائش کی طرف اتنی توجہ نہیں رہی۔ وکٹورین انگلستان میں گھر کا ہر کمرہ منہ سے بولتا تھا۔ دیواروں پر ایک سے ایک خوبصورت وال پیپر۔ کمرے کی زیبائش میں اضافہ کرتے تھے۔ وال پیپر اس لیے ضروری تھا کہ محض چونے کی قلعی والی دیواریں بے حد سرد ہوتیں۔ Central heatting کے رواج سے قبل کمرہ گرم رکھنے کے لیے ہر کمرے میں آتش دان اپنے بنگلوں میں متعارف کیے اور ان کا اوپری حصہ کورنس کہلایا جسے ہندستانیوں، نے کارنس کر دیا۔ کلکتے کے بے حد انگریزیت زدہ بھدرا لوگ نے اپنے گھروں میں Wall Paper لگائے لیکن یہ رواج باقی ہندستان میں مقبول نہیں ہوا۔ آتش دان پر اہل خاندان کی تصویریں البتہ سجا دی گئیں۔ ایک ہندستانی روایتی مکان میں الماری کے بجائے دیواروں میں متعدد طاق اور طاقچے ہوتے تھے۔ اسی سے کسی چیز کو فراموش کرنے کے لیے بالائے طاق رکھ دینے کا محاورہ نکلا۔ پہلے بہت نیچے رنگین پایوں کی کرسیاں جو سندلی کہلاتی تھیں مشتمل تھیں۔

بمبئی میں میں نے دیکھا کہ بوہرے اور کھوجے ایک ہی قاب کے وسطی انبار میں سے پلاؤ نکال کر اپنے سامنے اسی قاب کے کنارے پر رکھ لیتے ہیں اور سب مل کر نوش کرتے ہیں۔ ان

جماعتوں میں دین داری بھی مسلمانوں کے دوسرے فرقوں سے ذرا زیادہ نظر آتی ہے۔ ان کے مولوی بھی ہمارے ایک عام ملا جی سے زیادہ پڑھے لکھے اور ہوش مند ہوتے ہیں۔ ساحل سمندر پر رہنے کی وجہ سے وہ بیرونی دنیا سے بہتر طور پر روشناس ہیں۔ بمبئی کے بوہرے، کھوجے اور میمن فرقوں کے افراد شمالی ہند کے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ اور باخبر کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر انڈو مسلم تہذیب کا نمائندہ محض شمالی ہند کا مسلمان ہی سمجھا جاتا ہے اور غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو تہذیبی لحاظ سے برتر سمجھتا ہے۔ مجھے یاد ہے بمبئی کے مشہور لطیفی خاندان کے ایک رکن دانیال لطیفی نے جو بڑے جید دانشور تھے۔ بہت ہی خفگی کے ساتھ مجھ سے کہا تھا آپ ہم لوگوں کو Barbarian سمجھتی ہیں۔ لطیفی صاحب اور ان کے رشتہ دار فیضی خاندان میں ایک سے ایک عالم پیدا ہوئے۔ فیضی صاحب جو عطیہ فیضی کے بھتیجے تھے اور مصر وغیرہ میں ہندستانی سفیر بھی رہ چکے تھے بہت ہی عالم فاضل بزرگ تھے۔ ان کا ذخیرہ کتب بھی بیش بہا تھا۔ انھوں نے بھی مجھ سے ایک بار یہی شکایت کی تھی۔

فیضی اور طیب جی کے خاندان کی خواتین انیسویں صدی میں انگلستان جایا کرتی تھیں۔ عطیہ فیضی کی برناڈ شا سے دوستی تھی۔ انھوں نے بمبئی کے ایک مراٹھی Speeking تو مسلم ہودی مسٹر رحمین سے شادی کی تھی۔ جنھوں نے اپنی بیوی کا خاندانی نام اپنے نام میں شامل کرلیا تھا اور فیضی رحمین کہلاتے تھے وہ ایک بلند پایہ مصور تھے اور نئی دہلی کی وائسریگل لاج کے فریسکو یعنی دیواری تصاویر انھوں نے ہی بنائی تھیں۔ لیکن اب کراچی میں ان کا سورج نصف النہار سے اتر چکا تھا۔ حکومت پاکستان نے ایک سرکاری عمارت جو شاید پہلے ایک میوزیم تھی انھیں رہنے کے لیے دے دی تھی۔ وہاں عطیہ فیضی نے ایک تھری آرٹ سرکل قائم کیا تھا جس میں کچھ ڈپلومیٹ وغیرہ ہفتے میں ایک بار جمع ہوتے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس اجتماع کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ میری ایک دوست نے مجھے بتایا کہ انھوں نے اس سے کہا کہ فلاں شخص ان کو بہت پسند کرتا ہے۔ اگر تم اتوار کے روز چار بجے فلاں پارک میں آجاؤ تو میں اس سے تم کو ملوادوں گی۔ یہ بات بالکل ناقابل یقین تھی لہٰذا جب اس خاتون نے مجھے بتایا تو میں نے اس کی سنی اَن سنی کردی۔ انگریزی

میں ایک محاورہ ہے How the mighty fall یہی خاتون تھیں کہ جنھیں اس صدی کے آغاز میں ہمارے مسلمان نوجوان دانشور اپنا Ideal سمجھتے تھے۔ شاید سرعبدالقادر نے کہیں لکھا ہے کہ ایک دن یلدرم بے حد خوش خوش ان سے ملے اور کہا آج ایک ایسی خاتون سے مل کر آرہا ہوں جو نہ صرف آزادیٔ نسواں کی محرک ہے بلکہ خود اس آزادی پر عامل بھی ہے۔ علامہ اقبال بھی عطیہ فیضی کے معترف تھے۔ دراصل اس زمانے میں ایک اعلیٰ خاندان مسلمان لڑکی جو نہ صرف بے پردہ اور انگلینڈ Return بھی تھی یقیناً ایک عجوبۂ روزگار رہی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمان ساحلی مسلمانوں کے مقابلے میں کس قدر پسماندہ اور فیوڈل رہے ہوں گے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گجرات اور ساحل کوکن کا مسلمان ان سماجی ضابطوں سے آزاد تھا جو شمالی ہند کے شاہی اور جاگیری ادوار کی دین تھے۔ نہایت انگریزیت زدہ پارسی اور دور دراز کے مغربی ممالک سے تجارت کرنے والے گجراتی ہندو اس کے پڑوسی تھے۔ تمدنی اعتبار سے بھی وہ ایک دوسرے کے نزدیک تھے اور فلاں ابن فلاں کے بجائے پیشوں کے اعتبار سے جانے جاتے تھے۔ سوڈا واٹر والا۔ پارسی ہندو اور مسلمان تینوں ہو سکتے تھے۔ محنت کے ذریعے حصول دولت ان کا مقصدِ حیات تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس دولت کا ایک حصہ رفاہ عام پر خرچ کرتے تھے۔ ایک ساحلی مسلمان شمالی ہند کے مسلمان کے مقابلے میں زیادہ باخبر اور عمل پسند تھا۔ جغرافیائی اور تاریخی حالات نے اسے شمالی ہند کے اہل اسلام کے مقابلے میں زیادہ پریکٹیکل بنا دیا تھا۔ اس کی دین داری کا یہ عالم تھا کہ روپیہ شو بنک میں رکھ کر سود خوری نہیں کرتا تھا بلکہ اس روپے سے جائیداد خریدتا تھا۔ چنانچہ شہر بمبئی کی Real Estate کے مالکوں میں مسلمانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ وضع قدیم کی پابندی ایسی ہے کہ میں نے چند سال قبل تک بمبئی میں برقع پوش عورتوں کو کار چلاتے دیکھا۔ انھوں نے نقاب الٹ رکھی تھی اور فراٹے سے ڈرائیو کرتی نکل جاتی تھیں۔ ان تینوں فرقوں میں سے میمن ایک غیر معمولی طور پر خوش شکل قوم ہیں۔ گورے چٹے اور نہایت تیکھے اور عمدہ خدوخال۔ یہ ایرانی نسل بھی نہیں ہیں۔ افغان بھی نہیں پھر یہ کون ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جنوبی ہند کی تیز دھوپ نے ان کی سرخ وسفید رنگ میں کوئی فرق پیدا نہیں کیا۔ کرگ میں ایسی ہی

ایک بے حد خوش شکل قوم آباد ہے جو مذہباً ہندو ہیں۔ نیلی آنکھیں، سرخ و سفید رنگت۔ ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان قدیم یونانیوں کی اولاد ہیں جو دو ڈھائی ہزار سال قبل بہ سلسلۂ تجارت ہندستان آئے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ نسلی تسلسل بھی کم تعجب خیز نہیں۔ شکل و صورت رنگت عادت و خصائل کس طرح ایک پیڑھی کے بعد دوسری پیڑھی میں منجمد رہے یعنی صنعتی انقلاب نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اس کا ایک نظارہ میں نے سندھ میں دیکھا جس کا میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں۔ یعنی موہن جوداڑو کے میوزیم کے باہر ایک سندھی دیہاتی بالکل اسی وضع کی بیل گاڑی ہانکتا ہوا جا رہا تھا اور اس کا عظیم جثہ پگڑ بھی عین مین اسی وضع کا تھا جیسا میوزیم کے ان مورتیوں اور باریلف کی دیواری تصاویر میں دکھلایا گیا تھا جو آج سے پانچ ہزار سال قبل گڑھی گئی تھیں اور اس میوزیم کے اندر موجود تھیں اللہ ہو اکبر۔ اس قسم کے نظارے کے لیے انگریزی میں ایک اصلاح Mind-Boggling لیکن سارے ہندستان کے مختلف خطوں میں عورتیں جو لباس پہنتی ہیں وہی لباس ہمیں مغل اور گجراتی جینا طوری تصاویر میں بہت ہی کم رد و بدل کے ساتھ نظر آتا ہے۔ زیورات تو بالکل وہی ہیں جو آج سے سینکڑوں سال پہلے پہنے جاتے تھے۔ لیکن ہم یوروپ یا انگلستان جائیں تو عہد الزابیتھ اوّل بہت دور کی بات ہے ہمیں انیسویں صدی کی وضع کے پوشاک بھی اب نظر نہیں آئے گی۔ صنعتی انقلاب کے بعد سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن نمایاں فرق پہلی جنگ عظیم نے پیدا کیا۔ جب مغرب کی عورتوں نے لمبے سائے ترک کیے اور گھٹنوں تک کے فراک پہننے لگیں اور اپنے لمبے بال ترشوا لیے کیونکہ ان کی زندگیاں زیادہ مصروف ہو گئی تھیں۔ غریب طبقے کے افراد کو فیکٹریوں میں ملازمت مل گئی۔ گھریلو ملازمین رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے۔ پہلے ایک خوش حال انگریز کے گھر میں پانچ چھ ملازم مرد و عورتیں کام کرتی تھیں اب ایک یا دو ملازم ہی رہ گئے۔ خود کار مشینوں کے استعمال کی وجہ سے کچن کا بھی نقشہ بدل گیا۔

ہندستان کی آزادی اور قیام پاکستان نے مزید تبدیلیاں پیدا کیں۔ انگلستان میں خوش حالی بڑھی۔ گھریلو ملازمین اب دوسرے کام کرنے لگے یا جوق در جوق آسٹریلیا اور کینیڈا وغیرہ چلے گئے۔ ان کی جگہ معمولی کام کرنے کے لیے بڑی تعداد میں پنجابی وہاں پہنچ گئے۔ ہیڈ وائز

پورٹ پر سکھ عورتیں جاروب کشی میں مصروف ہوئیں۔ انگلستان میں اور سارے مغرب میں معمولی کام کرنے کو کسر شان نہیں سمجھا جاتا لیکن ہمارے یہاں عزت اور بے عزتی بہت بڑا ذاتی مسئلہ ہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں لندن سے واپس آرہی تھی اور نورافشاں جو کراچی سے وہاں گئی ہوئی تھی مجھے خدا حافظ کہنے ایئرپورٹ پر آئی تھیں۔ ہم لوگ ایک ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک سردارنی جھاڑو لیے کمرے میں داخل ہوئی اور ہمیں دیکھ کر بے طرح جھینپی اور ایک آدھ ہاتھ اِدھر اُدھر لگا کر فوراً باہر چلی گئی۔

لندن میں بے انتہا دولت مند ہندستانیوں اور پاکستانیوں کا ایک نیا طبقہ بھی نمایاں ہوا۔ Death Tax نے انگریز امرا کو مالی اعتبار سے تباہ کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے شاندار کنٹری ہاؤس ہندستانی اور پاکستانی تجار اور عرب عیش پرستوں کے ہاتھ بیچ کر آسٹریلیا وغیرہ جا رہے تھے۔ ان نئے دولت مند عربوں اور ہندستانی و پاکستانی نو دولتیے تجار کے لیے ان ہی کی بدمذاقی کے مطابق چمکیلا، بھڑکیلا سامانِ آرائش بھی بازاروں میں ملنے لگا تھا۔ انگریز ایک بنیادی طور پر چالاک دکان دار قوم ہے۔ اس نے یہ دیکھا کہ یہ ہندستان اور پاکستان کے نئے دولت مند بیش قیمت تصاویر، نوادر یا اعلیٰ درجے کا خوش مذاقی کا سامانِ آرائش خریدنے کے بجائے بھڑک دار چیزیں خرید رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمان اپنی خوش مذاقی اور نفاست کے لیے مشہور تھے لیکن اب ان کو بمبئی کے بھنڈی بازار یا دہلی کے جامع مسجد ایریا کے لوگوں کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ لندن میں عربوں کے لیے بھی انتہائی بدمذاقی کی تصاویر چمکیلا اور بھونڈہ سامانِ آرائش فروخت کیا جا رہا تھا جسے عرب اونچے داموں پر جوق در جوق خرید رہے تھے۔ الٰہی مسلمانوں کو کیا ہو گیا۔

ایک مرتبہ امپرنٹ کے دفتر میں اسی قسم کا کوئی تذکرہ ہو رہا تھا تو سیرے ایک مرہٹہ رفیق کار اپار اناڈے نے مسلمانوں کے متعلق نہایت خوش دلی سے کہا تھا کوئی بات نہیں We will teach them culture یہ سن کر میں دنگ رہ گئی تھی۔ انقلاب زمانہ اسے کہتے ہیں۔ آج بھی بمبئی میں مسلمان لڑکیاں بالوں میں ربن لگائے گھیر دار فراک نما چمکیلی قمیض اور چمکیلی شلوار میں ملبوس الگ سے پہچان لی جاتی ہیں اور ان کا اسٹائل بھنڈی بازار ٹسٹ کہلاتا ہے۔ یہ ترقی معکوس کا تہذیبی

تناظر کی کیا وجہ ہے۔ نئی مسلم مڈل کلاس نہایت خوشحال ہے۔ لیکن خوش ذوقی سے عاری۔ کیا اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فیوڈل طبقہ جو ان معاملات کی رہنمائی کرتا تھا معدوم ہو چکا اور اس کی جگہ کمرشل کلاس نے لے لی۔ ان کے یہاں دولت کی فراوانی اور نمائش پسندی تو تھی لیکن خوش ذوقی کا فقدان تھا۔ انگلستان میں جب نئی تو لیے امیروں نے مفلوک الحال لارڈس کے محل خرید کر ان کو بھی بقول شخصے بھنڈی بازار بنا دیا ہے۔ اس کی ایک بہت ہی محیرالعقول مثال امریکہ میں دیکھی جہاں اس نوع کے نئے دولت مند ہندستانی و پاکستانی باافراط آباد ہیں۔ کیلیفورنیا کی ایک پارٹی پر ایک سردار جی کا محل، باغ میں ایک آبشار اور ہرن۔ دو تین چھوٹے چھوٹے آبشار اندر کمروں میں بھی گر رہے تھے۔ مکان کیا تھا طلسمات و عجائبات کی نمائش گاہ۔ سردار جی مارے خاطرداری کے بچھے جا رہے تھے۔ ان کی بھی وہی داستان تھی۔ چند ڈالر جیب میں ڈال کر امریکہ آئے تھے۔ ایک اور صاحب جنھوں نے میری دعوت کی اور زیادہ قابل تعریف تھے کہ وہ کافی کم سنی میں اتنے بڑے آئی کون بن گئے تھے وہ پاکستانی تھے اور وہ بھی قسمت آزمانے کے لیے یہاں آ پہنچے تھے۔ لیکن بہ لحاظ پیشہ ڈاکٹر تھے اور ان کی پریکٹس یہاں ماشاءاللہ خوب چمکی۔ ہندستانی اور پاکستانی ڈاکٹروں کی مغرب میں اس کامیابی کی ایک وجہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک عام مغربی ایک سانولے ہندستانی پاکستانی ڈاکٹر کو ایک قسم کا ساحر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ان لوگوں کے پاس کوئی خفیہ جادو منتر ہے۔ جس سے وہ مریضوں کو صحت یاب کر دیتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مقامی انگریز یا امریکن ٹھیک پانچ بجے شام اپنا دفتر بند کر کے کسی پب میں جا بیٹھتا ہے جبکہ ہندستانی یا پاکستانی جو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے یہاں آیا ہے اپنی دکانیں دیر تک کھلے رکھتا ہے اور وہ سیلز مین یا سیلز گرلز کو ملازم نہیں رکھتا بلکہ اس کے اپنے گھر کی عورتیں دکان میں کام کرتی ہیں۔ چنانچہ اتنا پیسہ وہ ادھر بچا لیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت مند ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کا کاروبار مزید پھیلتا ہے تو وہ اپنے آبائی وطن ہندستان یا پاکستان سے اپنے گاؤں والوں کو بھی بلا لیتا ہے۔ جو وہاں جم کے محنت کرتے ہیں۔

اسی طرح گویا انیسویں صدی امریکہ کی داستان دہرائی جا رہی ہے جب یوروپ سے

مفلوک الحال مہاجروں نے یہاں پہنچ کر جی توڑ محنت کی اور امیر کبیر بن گئے۔ اسی وجہ سے امریکہ سنہرے مواقع کا دیس کہلایا۔ لیکن برطانیہ کے ان سانولے مہاجرین نے یہاں کی کلچر اور مذہب اختیار نہیں کیا چنانچہ جابجا گرودوارے، مساجد اور سوامی نرائن کے مندر نظر آتے ہیں۔ میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ لندن کے انتہائی مہنگے اور عالی شان محلے میں جہاں پہلے محض لارڈ اور دوسرے امرا رہتے تھے اب ان بھوری عمارتوں کی قطار میں اچانک ایک نارنجی رنگ کا دروازہ نظر آجاتا ہے اور اس دروازے کے اندر ایک سناتن دھرم مندر۔

سجا سجالے جلدی سے مندر کرشن کے درشن ملیں گے اندر کہاں؟ لارڈ جیمز گورڈن کے ٹاؤن ہاؤس کے متصل کنہیا جی کے مندر میں۔

منگل کے روز گجراتی ناریاں رنگ برنگے لہنگے پہنے سر پہ رنگین گاگرے دھرے ہائیڈ پارک جاکر گربا ناچتی ہیں۔ رے واگے بندرابن باسنریا خوب خوب بجالینا۔ برطانیہ پر ہندستانی اور پاکستانی تہذیبی یلغار حیرت انگیز ہے۔ بعض محلے تو ایسے ہیں جن میں کوئی انگریز نظر آجائے تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ بے چارہ کہاں سے آنکلا۔ میں کہیں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ Harrow کے مشہور و معروف انتہائی اپر کلاس اسکول میں اب گجراتی پٹیل بچوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ برطانیہ کی بیرونی جنگوں میں فتوحات کا آغاز ایٹن اور ہیرو ان کی اسپورٹس فیلڈ سے ہوا۔ لیکن اب دنیا کا نقشہ بدل چکا ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

مجھ سے ایک بار ایک انگریز صحافی نے لندن میں پوچھا تھا کہ برٹانوی دور کا آپ کو کوئی ایسا واقعہ یاد ہے جس میں کسی انگریز نے کسی ہندستانی کی صریحاً توہین کی ہو۔ میں نے کہا میرے والدین کے متعدد دوست نہایت مہذب انگریز خاندان تھے لیکن بدتمیزی کا محض ایک واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے ہم لوگ غازی پور سے آکر ڈالن والا کی ایک کوٹھی حسنین منزل میں ٹکے تھے جس کے مالک خان بہادر سید ظل حسنین جو سروے آف انڈیا سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اپنے کنبے کے ساتھ محلہ کرن پور میں رہتے تھے ان کے برابر کی کوٹھی میں نجف علی خان قیام پذیر تھے جن کے

بھانجے 1947 عیسوی کے ایک نامور پاکستانی ڈپلومیٹ بنے۔

ہم لوگوں نے حسنین منزل میں قیام کیا اور والد مرحوم حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ پچھلے برآمدے کے عین مقابل میں کچھ فاصلے پر ایک انگریز کی کوٹھی تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا اور اماں دن بھر دھوپ میں زیادہ تر وقت اسی برآمدے میں گزارتی تھیں۔ ایک روز اسی برآمدے میں پلنگ پر بیٹھی ایک خانساماں جی سے بات کر رہی تھیں جو پہلے کبھی ان کے یہاں کام کر چکے تھے۔ اتنے میں انھوں نے اچانک کہا ارے زلزلہ۔ میں بھی وہیں موجود تھی مگر میں نے تو شاید زمین کی جنبش محسوس نہیں کی لیکن وہ منظر پوری طرح یاد ہے۔ اگلے روز اخبار سے معلوم ہوا کہ عین اسی وقت بہار میں بھونچال آیا تھا اور وہ کتنا زبردست زلزلہ رہا ہوگا کہ اس کا اثر دہرہ دون کے حسنین منزل تک پہنچا۔ اگر سوچئے کہ ہم سب ایک زیر زمین آتش فشاں پہاڑ کے اوپر بیٹھے ہیں اور کسی لمحے بھی ہمارے پاؤں تلے کی یہ زمین آگ اور لاوا اُگل سکتی ہے۔ شاید قیامت بھی اچانک اس طرح آئے گی۔ یہ جب پومپی آئی پر نا گہانی قیامت ٹوٹی تھی تو وہ لوگ بھی اپنے اپنے مکانوں میں آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں گے۔ یا جب کوئٹے میں زلزلہ آیا۔ ناعاقبت اندیش دنیا کتنی بے خوفی سے آگ سے بنے ہوئے اس گولے کی سطح پر جی رہی ہے اور اسے قطعی خیال نہیں آتا کہ کسی لمحے بھی وہ نیست و نابود ہو سکتی ہے۔ جب مذہبی لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو انھیں Prophets of Doom پکارا جاتا ہے۔

ایک اتوار کے روز عقبی کوٹھی والے انگریز اپنی چھت پر جمع ہوئے اور گراموفون کا ریکارڈ لگا کر وہاں ناچنے لگے۔ اتنے میں ایک گورے نے ایک کنکر اٹھا کر ہمارے آنگن میں پھینکا۔ والدہ آگ بگولہ ہو کر انھیں گاڑی نکلوائی اور کلکٹر ضلع کے یہاں پہنچ گئیں۔ مجھے یاد نہیں کلکٹر انگریز تھا یا ہندستانی بہر حال اماں نے اس واقعہ کی رپورٹ کی۔ متعلقہ افسر نے معافی چاہی اور دوسرے روز سے وہ بدتمیز گورے اور ان کی میمیں چھت سے غائب ہو گئے۔ اماں کی دوستوں کو بھی اس واقعہ کا علم ہوا۔ یہ گورے ٹامی زیادہ تر لندن کے مزدور پیشہ کوکنی (Cckney) ہوتے ہیں۔ ہندستان آتے ہیں تو عام ہندستانی انھیں بڑا صاحب سمجھتا ہے اور وہ اپنی اس نئی حیثیت کا خوب

خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب مجھے یاد آیا اماں نے ضلع کلکٹر سے یہ بھی کہا تھا کہ اس وقت جو اہل ہند ہندستان کی آزادی کا زوروشور سے مطالبہ کرر ہے ہیں ان حالات میں آپ کو اس پر متعجب نہیں ہونا چاہیے تو کیا غلط کرر ہے ہیں۔ اس کانگریس اگیٹیشن پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔ پھر اس کے تقریباً اٹھارہ بیس سال بعد لندن میں چند گوروں سے ملاقات ہوئی تو جن میں سے ایک کسی عمارت کا چوکیدار تھا اور دوسرا بھی کسی دوکان میں کام کرتا تھا اس زمانے میں ابھی برطانیہ پر ہندستانیوں کی یلغار نہیں ہوئی تھی اور ساڑی پوش خواتین خال خال ہی نظر آتی تھیں تو مجھے دیکھ کر بڑی خوشی اور اپنائیت سے کہا تھا کہ میں بھی پریزڈینسی میں رہ چکا ہوں اور اپنے عہدے کا نام بھی بتایا تھا جواب مجھے یاد نہیں۔ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ اور کانگریس پارٹی آف انڈیا دونوں کا ظہور نہیں ہوا تھا اور کانگریس ہی ہندستانیوں کی ایک نمائندہ جماعت تھی اس کے چند سال بعد ہی سیاسی پارٹیوں میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔

چنانچہ والدہ مرحومہ جو اپنے زمانے کی ایک پیش رو خاتون تھیں اور اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئیں تھیں انھوں نے نوعمری ہی میں اپنی مضمون نویسی کی دھاک بیٹھادی کہ شمس العلما ممتاز علی نے 1910 عیسوی میں انھیں ہفتہ وار اخبار ''پھول'' کا باقاعدہ ایڈیٹر مقرر کیا۔ غالباً وہ اس وقت ہندستان کی پہلی خاتون تھیں جنھیں اس کم سنی میں اتنی بڑی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ لیکن وہ زمانہ ذاتی Publicity اور پبلک ریلیشنز کا نہیں تھا۔ چنانچہ اس قسم کے غیر معمولی واقعات کا کوئی چرچہ نہیں ہوتا تھا۔ اب آپ آج سے 90 سال قبل کی صحافتی صورت حال کا جائزہ لیجیے اردو میں رسالے اور اخبارات نہایت آب و تاب سے شایع ہور ہے ہیں۔ بلند معیار، اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں کی ٹیم ایک نئی تہذیبی زندگی کا جوش و خروش۔ مسلمان عورتیں حالانکہ عام طور پر پردہ نشین ہیں لیکن یہ نئی جاگیرتی زنان خانوں میں پہنچ چکی ہے۔ ان کے لیے رسالے شایع ہور ہے ہیں۔ وہ مضامین اور کتابیں بھی تصنیف کر رہی ہیں۔ ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال اس وقت مسلمان خواتین کی لیڈر ہیں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان سے قبل تین اور بیگمات بھوپال بہ طور فرماں روا تخت نشین رہیں۔ سلطان جہاں بیگم مسلم یونیورسٹی کی پہلی چانسر بھی

مقرر ہوئیں۔ اس وقت غالباً کوئی اور خاتون کسی ہندستانی یونیورسٹی کی چانسلر نہیں تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک بہت ہی پسماندہ قوم تھے اور ان کی عورتوں کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی۔ حالانکہ عورتوں کی حالت سوائے بنگال، مہاراشٹر اور مدراس کی نئی ہندو مڈل کلاس کے علاوہ سارے ہندستان میں کچھ بہت زیادہ تابناک نہیں تھی۔ لیکن پسماندگی کا لیبل مسلمانوں پر ایسا چسپاں ہوا جو اتارے نہیں اترتا۔ ہر ہائنس نے جب بنتِ نذرالباقر کے مضامین پڑھے اور ان کی ذہانت کا چرچہ سنا تو انھوں نے نذرالباقر صاحب کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ وہ بنتِ نذرالباقر کو اپنا سکریٹری مقرر کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن میر صاحب نے ادب کے ساتھ ان کی یہ فرمائش قبول نہیں کی۔ بہ فرضِ محال اگر خان بہادر صاحب نے فرماں روائے بھوپال کی یہ پیشکش منظور کرلی ہوتی تو ان کی صاحبزادی کی زندگی کوئی اور رخ اختیار کرلیتی اور شاید ان کی شادی بھی کہیں بھوپال ہی میں ہو جاتی۔ مگر آج سے پون صدی قبل کے سماجی حالات بالکل مختلف تھے۔

دراصل بنتِ نذرالباقر کا ارادہ ڈاکٹری پڑھنے کا تھا اور ان کے والد ان کو لدھیانہ بھیجنے کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے کیونکہ مسلمان لیڈی ڈاکٹر تقریباً ناپید تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان لیڈی ڈاکٹر مستورات کے لیے بہت ضروری ہیں۔ مگر کمزوریِ بصارت کی وجہ نذر زہرا بیگم ڈاکٹری نہ پڑھ پائیں۔ گو تصنیف و تالیف کا شغل برابر جاری رکھا اور ناول ''اختر النسا بیگم'' پہلے قسط وار ''تہذیب نسواں'' میں شایع ہو کر بے حد مقبول ہوا۔ لہٰذا اسے کتابی صورت میں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے 1911 عیسوی میں پیش کیا۔ اس نام کا ایک ناولٹ جو منشی ارشد تھانوی نے تصنیف کیا تھا وہ صدیق بکڈپو لکھنؤ نے 1922 عیسوی میں شایع کیا۔ لیکن اس ناولٹ کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ ارشد تھانوی مشہور کتاب بہشتی زیور کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی۔ مثلاً حسن تخیل۔ بیاض ارشد، اجتماع ضدین۔ آثار سانچی، مسئلہ ازدواج۔ و مترجم طواف زمین وغیرہ۔ بنتِ نذرالباقر کا ناول ''اختر النسا بیگم کی غالباً تقلید میں منشی ارشد تھانوی نے اپنا ناولٹ اختر النسا بیگم لکھا۔ گو دونوں کا پلاٹ تقریباً یکساں ہے۔ بنتِ

نذرالباقر کے اختر النسا بیگم کے والد دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہیروئن کو بہت مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی ذہانت اور صلح کل طبیعت کی بدولت تمام مشکلات پر فتح حاصل کرتی ہے۔ منشی ارشد تھانوی کے ناولٹ میں اختر النسا بیگم بن ماں کی لڑکی ہے جو اپنے ماموں ممانی کے یہاں پرورش پاتی ہے اور اس کی شادی اپنے خالہ کے بیٹے کے بجائے کہیں اور ہو جاتی ہے بعد میں ممانی اپنی لڑکی کو اختر النسا کی سوتن بنا کر اس کے گھر میں بھیج دیتی ہیں۔ شوہر اختر النسا بیگم کو اپنے گھر سے نکال دیتا ہے اور وہ اپنے مصائب بڑی بہادری سے جھیلتی ہیں۔ آخر میں شوہر انھیں واپس بلا لیتے ہیں۔ دونوں ناول اس وقت کے رواج کے مطابق اصلاحی ناول تھے۔ ارشد تھانوی کا ناولٹ بیالیس صفحات کا کتابچہ ہے جبکہ بنتِ نذرالباقر کا اختر النسا بیگم دو سو پچاس صفحات کا ناول اور نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بے حد مقبول ہوا۔

ابھی ادبی تنقید بھی اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ چونکہ اس زمانے میں رسالوں میں کتابوں پر تبصرے اور تنقیدی مضامین وغیرہ بہت کم چھپتے تھے چنانچہ بنتِ نذرالباقر اور ارشد تھانوی کے اس توارد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

بنتِ نذرالباقر کا اختر النسا بیگم جو اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھا گیا یعنی آج سے نوے سال قبل اس کی ہیروئن کو جب گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو ایک فرضی نام اختیار کر کے وہ زندگی خود آپ بناتی ہے۔ وہ فرضی نام اختیار کرنا کچھ Fantasy معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے مشن یعنی تعلیم نسواں اور حریت نسواں کے پرچار کی غرض سے اس قسم کی Fantasy نوعمر مصنفہ کے نزدیک بالکل جائز رہی ہوگی۔ اسی طرح اس مصنفہ کے ایک اور ناول کی ہیروئن میڈیکل کالج میں داخل ہوتی ہے جہاں وہ لڑکوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ چونکہ بے حد حسین ہے اپنے چہرے پر کالا پاؤڈر لگایا کرتی ہے تاکہ بدصورت نظر آئے۔ آج ہمیں قصے کا یہ پلاٹ بے حد غیر حقیقی مضحکہ خیز معلوم ہوگا اور مصنفہ کی سادہ لوحی پر شاید ہنسی بھی آئے جیسا کہ پہلے لکھا گیا۔ اپنے مشن کی تکمیل کے جوش میں مصنفہ نے ہیروئن کے چہرے پر کالا پاؤڈر لگوا دیا۔ یعنی اس وقت جبکہ دوسرے فرقوں اور قوموں کی عورتیں حسین نظر آنے کے لیے میک اَپ کر رہی تھیں۔ ہماری بیچاری مسلمان

ہیروئن اپنے سماج کے ضابطوں اور پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے آپ کو بدنما بنا کر باہر نکلتی تھیں۔ چونکہ میڈیکل کالج کی تعلیم وہ نقاب پوش رہ کر حاصل نہیں کر سکتی تھی، اپنا چہرہ چھپانا ممکن نہیں تھا لیکن خود کو بدصورت ظاہر کرنا اس کے بس میں تھا۔

یہ ناول کا ایک بہت چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن اسے نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس زمانے کے حالات پر غور کیجیے جب پردے کی کتنی شدت تھی اور مسلمان لڑکیوں پر کتنی پابندیاں عائد تھیں۔

اسی طرح نذر سجاد حیدر کے ایک اور ناول "ثریا" میں ہیروئن ایک اینگلو انڈین گورنس کا روپ دھار لیتی ہے مطلب یہ کہ اس وقت سماج میں اگر آزادیاں حاصل تھیں اور عورتیں اپنا خود مختار کیریئر بنا سکتی تھیں تو زیادہ تر برہمو ہندو، بنگالی، اینگلو انڈین، کرسچین یا پارسی خواتین ہی تھیں۔ لیکن جیسے جیسے کانگریس تحریک نے زور پکڑا ہندو خواتین بھی میدان سیاست میں اتر آئیں۔ لہٰذا ہمارے فکشن رائٹرز کے لیے اب متعدد ٹائپ موجود تھے۔ پہلا تو وہی روایتی نازک اندام، پردہ نشین حسینہ (بقول ہماری پنجابی رائٹر دوست اجیت کور حسینہ مہ جبینہ) دوسرے کالج کی تعلیم یافتہ ماڈرن مس، تیسرے کندھے سے جھولا آویزاں کیے سیاسی ورکر یا Wemenslib کی قائد۔

اب عورتوں کی آزادی اتنی عام چیز ہو گئی ہے کہ اس کے متعلق کوئی نئی بات کہنے کے لیے نہیں رہی۔ سوائے اس کے کہ اب ذرا تھوڑی سی پابندی لگانی ضروری ہے۔ ورنہ حد سے زیادہ آزاد معاشرے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں اگر آپ اپنے بچے کو زیادہ ڈانٹیے تو وہ فوراً پولس کو ٹیلی فون کر دیتا ہے۔ امریکہ شخصی آزادی کے علاوہ ٹیکنالوجی میں ترقی کی اس اسٹیج تک پہنچ چکا ہے جہاں اس کے نزدیک باقی دنیا والے ابھی محض جنگلی ہیں۔ مجھے چند سال قبل برلن میں ایک جرمن لڑکی نے بتایا کہ جب وہ امریکہ گئی تو ایک امریکن خاتون نے اس سے پوچھا کہ کیا جرمنی کے لوگ ندی پر جا کر کپڑے دھوتے ہیں۔ جب جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک ایک اوسط درجے کے امریکن کے خیال میں اس قدر پسماندہ ہے تو بھلا ہندستان کے لیے وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے کہ ہم لوگ بطور زیبائش ناک میں سیفٹی پن آویزاں کر کے گھاس کی بنی ہوئی اسکرٹ پہنتے ہوں

گے۔ انگلستان میں ایک انگریز خاتون نے ایک ہندستانی لڑکی کے سنگھار میز پر مچھلی نما بلوری شیشی دیکھ کر پوچھا تھا کیا یہ تمھارا ایک خدا ہے۔ لڑکی نے جواب دیا نہیں یہ تو عطر دان ہے۔ لیکن خدا میں تمھیں ابھی دکھاتی ہوں۔ پھر اس نے الماری میں سے ایک گھنٹی نکال کر اس لڑکی کے سامنے رکھ دیا۔

ایک مشہور چینی فلسفی کی تصنیف کا عنوان ہے The Cloud of Unknowing لاعلمی کا بادل اور یہ بادل بے حد تعلیم یافتہ مغربی معاشرے پر سب سے زیادہ چھائے ہوئے ہیں۔

نذر سجاد حیدر کی تصنیف ثریا (1930) اس طرح شروع ہوتی ہے۔ سر چندر لال کا لڑکا سندر لال مکرجی بیرسٹری پاس کر کے انگلستان سے لوٹا ہے اور اس کی خوشی میں اس کے گھر پر ڈیز پارٹی دی جارہی ہے۔ پارٹی میں ازابیلا تھوبرن کالج کی چند لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ زمانہ 30-1920 عیسوی کی دہائی کا ہے۔ یعنی ہندستان کی برٹش کولونیئل سوسائٹی کی طرز زندگی۔ ناول کے کردار میں اس عہد کے افکار واقدار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپر مڈل کلاس کے نوجوان ولایت جاکے بیرسٹری پڑھتے ہیں۔ ان کے خاندانوں کی لڑکیاں بھی اگر وہ ہندو ہیں تو زیادہ کالجوں میں پڑھ رہی ہیں اور مسلمان لڑکیاں بھی اگر اکادکا کالج جارہی ہیں تو بڑی قابل ذکر بات ہے۔ ناول کی ہیروئن ثریا بھی ازابیلا تھوبرن کالج فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی ہے۔ عمر چودہ سال روایتی ہیرو نول والا سن وسال۔ یہ مصنفہ نے اپنی ساری جدت پسندی کے باوجود ہی روایت پرستی اختیار کی یعنی ہیروئن محض چودہ سال کی ہے لیکن انتہائی ہوش مند اور عاقل ودانا۔ کیونکہ ہیروئن کا مجموعہ خوبی ہونا ضروری ہے۔ یہاں ہندستان کے ناول نگار اٹھارھویں صدی انگلستان کی پیروی کر رہے تھے۔ جہاں اس زمانے کی ہیروئن نہایت کم سن لیکن بے حد عقل مند اور حسین ہوتی تھیں۔ اگلی صدی آتے آتے ناولوں میں انگریزی حقیقت پسندی آگئی تھی۔

ناول ثریا کے آغاز ہی میں ہیرو- ہیروئن سے مل کر اظہار مسرت کرتا ہے کہ وہ ایک کالج کی تعلیم یافتہ لڑکی ہے یعنی ناول میں قدم قدم پر تعلیم نسواں کا پرچار کیا جارہا ہے۔ ایک Point کو شروع ہی میں اظہار کر دیا جاتا ہے کہ ناول میں ہندو- مسلم رومانس کی گنجائش نہیں۔ ہیرو ہندو لڑکی

مس موہنی چندر لال کو سگی بہن کی طرح مانتا ہے۔ یہ معاملہ صاف ہو جانے کے بعد قصہ آگے بڑھتا ہے کیونکہ اس مسئلہ پر یعنی ہندو۔مسلم شادی کے موضوع پر مصنفہ نے بعنوان ''مذہب اور عشق'' ایک ناول الگ سے لکھا جو غالباً 1935 عیسوی میں شائع ہوا۔ نواب صاحب کیواں قدر کا اس پارٹی میں ثریا کو دیکھتے ہی Love at first Sight ہو جاتا ہے۔ سندر لال مکرجی نواب کیواں قدر ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ یہ دوستی قومی یکجہتی کے نظریے سے نہیں دکھلائی گئی بلکہ اس وقت کی اعلیٰ سوسائٹی میں کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا پردہ اور ہندوؤں کی چھوت چھات مڈل کلاس کی خصوصیت تھی۔ بالائی طبقے میں بھی عموماً ہندو خواتین مسلمانوں کے یہاں کھاتی پیتی نہیں تھیں مگر اس پابندی کا بُرا نہیں مانا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان مرد عموماً ایک دوسرے کے یہاں خورد و نوش کرتے تھے۔ لیکن بعض ہندو گھرانوں میں ان کی قدامت پرست مہیلائیں وہ برتن الگ رکھوا دیتی تھیں جن میں مسلمان دوستوں کے لیے کھانا پروسا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں شیعہ فرقہ ہندوؤں کے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا تھا۔ ان کے یہاں پارٹی میں تین مرتبہ غوطہ دے کر پاک کرنے کا دستور بھی تھا۔ لہٰذا اگر کپڑے کسی ہندو دھوبی نے دھوئے ہیں تو انھیں گھر میں دوبارہ تین مرتبہ پانی کا غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ پانی کی ناپاکی کا یہ عمل اور دستور مشرقی ممالک کی خاصیت رہی ہے۔ مغرب میں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں کہ آپ گرجا میں نہا دھو کر ننگے پیر جائیں۔ سینٹ پال نے مغرب میں عیسائیت کے فروغ کی خاطر وہ بہت سی پابندیاں اٹھالیں جن کی موجودگی میں سرد ممالک کے باشندے شاید یہ نیا ایشیائی مذہب قبول نہ کرتے۔ مثلاً لحم خنزیر۔ یہودیوں کے یہاں وہ حرام ہی رہا لیکن عیسائیوں نے اسے کھانا جائز قرار دیا۔ شراب نوشی کا بھی یہی معاملہ رہا کہ موسم سرما میں اپنے آپ کو سردی سے بچانے کے لیے شراب نوشی لازمی سمجھی گئی۔ چائے اور قہوہ تقریباً زمانہ حال کی دریافت ہیں۔ یورپ میں سردی سے نپٹنے کا واحد نسخہ شراب تھی جواب ان کی زندگیوں کا ایک لازمی جز بن چکی ہے۔ علاوہ ازیں خود ان کی کلیسائی عبادت کی رسوم میں شراب شامل ہے۔ عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے اپنی آخری ضیافت کے موقعے پر ایک ہاتھ میں جام شراب اور دوسرے میں روٹی کا ٹکڑا لے کر

فرمایا تھا کہ یہ میرا خون ہے اور یہ میرا گوشت۔ چنانچہ گرجا کے Holy Communion کے موقع پر پادری روٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تقسیم کرتا ہے جو گویا جسم عیسو ہیں اور شراب کا گلاس گویا عیسو کا خون ہے اور وہ اس گلاس میں سے سارے عبادت گزار باری باری ایک ایک گھونٹ پیتے ہیں یہ مسیحی عبادت کا ایک بنیادی جز ہے۔ انسانی فطرت کا قاعدہ ہے کہ وہ دوسروں پر معترض ہوتا ہے اور ان کو انوکھا بھی سمجھتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مشرقی مذہب میں Holy Communion جیسی کوئی رسم موجود ہوتی اور مغرب میں ایسی ناپید ہوتی تو یہی اہل مغرب ایشیائیوں کو مطعون کرتے کہ یہ اپنی عبادت کے دوران ایک دوسرے کا جھوٹا پانی پیتے ہیں مگر مثل مشہور ہے کہ اپنی آنکھ کا شہتیر دکھلائی نہیں دیتا اور دوسرے کے آنکھ کا تنکا فوراً نظر آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں لاعلمی کی وجہ سے ایک دوسرے کے مذاہب کے متعلق غلط اور بے بنیاد مفروضات بھی عام ہیں۔ جن کی فہرست یہاں گنوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مذاہب عالم نے انسانیت کو متحد کرنے کے بجائے ان میں خوب خوب تفرقے ڈالے۔ جنگیں لڑوائیں اور تعصبات کی فصلیں کھڑی کر دیں۔ خود ایک مذہب کے مختلف فرقوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ شیعہ اور سنی کے مابین جو خوف ناک غلط فہمیاں موجود رہی ان کا ہم سب کو اندازہ ہے۔

نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں اور اس عہد کے دوسرے ناول نگاروں کے یہاں بھی ہندو مسلم سیاسی لڑائی کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ محض ایک مخصوص طرز معاشرت کی تصویر کشی کی گئی ہے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان مجھے یاد پڑتا ہے کہ پریم چند کے ناول "چوگان ہستی" میں اشور سیوک، جون سیوک عیسائی کردار ملتے ہیں۔ یہ ناول میں نے بچپن میں پڑھا تھا۔ اسی طرح میں نے چچا عنایت اللہ دہلوی کے تراجم "سلاہو" اور شاید "تائیس" پڑھے تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ اناطول فرانس کے ناول تھے یا نہیں۔ اس زمانے میں "ساقی" کا ایک خاص نمبر پورا دانتے کے جہنم پر مشتمل تھا میرے خیال میں وہ اُردو میں مغربی تراجم کا سنہرا دور تھا اور اس وقت ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پہلے اردو فکشن عام طور پر خاصہ نحیف تھا۔ روایتی طرز بیاں اور رقعت خیز جذباتیت اس کی خصوصیات تھیں لیکن بعض چیزیں اتنی غیر معمولی اور شاندار تھیں گو ان کی تفصیل یا عنوان یاد نہیں۔

انصار ناصری کا ایک ڈرامے کا عنوان ''مگرم'' بھی مجھے یاد رہ گیا ہے۔ وہ بہت ہی دلچسپ اور زوردار ڈرامہ تھا۔ اس زمانے میں چند چیزیں ایسی لکھی گئیں جو یقیناً غیر معمولی تھیں مثلاً امتیاز علی تاج کا ''انارکلی'' اس سے بہتر ڈرامہ اردو میں آج تک نہیں لکھا گیا۔ ''چچا چھکن'' والی کہانیاں۔ کہا جاتا ہے کہ زیروم کے زیروم کا چربہ تھی پتہ نہیں۔ بہت سے افسانوں کے آخر میں نہایت باریک قلم سے بریکیٹ میں ''ماخوذ'' لکھا جاتا تھا یعنی اس کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کس مغربی زبان کے انگریزی ترجمے سے لیا گیا ہے۔ شوکت تھانوی کے افسانے ''سودیسی ریل'' جس کے لیے یہ مشہور ہے کہ برٹش سرکار نے تحریک آزادی کا مذاق اڑانے کے لیے لکھوائی تھی معلوم نہیں، مجھے کبھی شوکت تھانوی سے اس کے متعلق پوچھنے کا خیال بھی نہیں آیا۔

پنڈت سودرشن کے افسانے پریم چند کی روایت سے تعلق رکھتے تھے۔ پنجاب میں اردو برٹش سرکار نے رائج کی تھی اور ہندو مسلم اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک عظیم الشان جماعت تیار ہوگئی۔ ان تین فرقوں کی یکساں کاوشوں نے جس میں پنجابی انجمن کا بڑا دخل تھا۔ نوے سال کے اندر اندر اردو صحافت اور ادب کو چار چاند لگا دیے۔ ایک سے ایک شاندار رسالے لاہور سے نکلے۔ لکھنؤ سے ان کے مقابلے کا ایک رسالہ بھی نہ نکل سکا۔ ترقی پسند تحریک کی دھوم دھام بھی لاہور میں زیادہ رہی۔ وہ شہر فیشن کے اعتبار سے پیرس کہلاتا ہی تھا۔ اب ادبی اور انٹلیکچول سرگرمیوں کے باعث گویا پیرس کا لیٹن کوارٹر بن گیا۔ نئے ہندستان کی کہانی میں۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

یہ مصرع بار بار سامنے آجاتا ہے جس زمانے میں یعنی 40-1930 عیسوی کی دہائیوں میں لاہور واقعی ہندستان کا پیرس بنا ہوا تھا۔ ان ہی دنوں میں محکمہ قضا وقدر اس شہر کی تباہی اور آدھی آبادی کی جلاوطنی کے منصوبے بنا رہا تھا۔ لاہور میں فلم سازی بھی کی جارہی تھی وہاں کے ایک فلم خزانچی نے سارے ہندستان میں دھوم مچادی تھی۔ عبدالرحمٰن چغتائی اور امریتا شیرگل جیسے مصور بھی مصروف عمل تھے۔ ہندستانی موسیقی کا چرچہ خوب خوب تھا۔ آل انڈیا ریڈیو، لاہور اہل قلم اور فن کاروں کا بڑا مرکز بن چکا تھا۔ لیکن یہ گہما گہمی اور رونق اور سربلندی فلکِ کج رفتار کو ہرگز نہ

بھائی۔ چنانچہ 1947 عیسوی میں وہ بساط ہی الٹ گئی۔ ایک بارونق شہر سے دو فرقوں کی مشتمل آبادیوں کا المناک اور خوں چکاں انخلا ایک ایسی اجتماعی ٹریجڈی ہے جس پر جتنا غور کیجیے تعجب ہوتا ہے اور ایسے دل دوز وقت میں اس قسم کے بے حس ریمارک بھی سننے میں آئے کہ جب ہم دسمبر 47 عیسوی میں بہ ذریعہ ہوا لاہور پہنچے تو ہماری جائے قیام پر والدہ مرحومہ کے چند پرانے دوست احباب ملنے آئے ان میں سے ایک کے نوجوان فرزند نے مجھ سے کہا پاکستان میں فنون لطیفہ کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ سکھ چلے گئے۔ یعنی اتنی بڑی ٹریجڈی سے ان کے نزدیک نقصان محض یہ ہوا کہ اب سکھوں کے لطیفے سننے کو نہیں ملیں گے۔

انتہائی غم و غصہ اور شدید نفرت ابنارمل (Abnormal) نفسیات میں شامل ہیں۔ اور انھیں ابنارمل حالات تخلیق کرتے ہیں۔ وہ کرائسس گزر جانے کے بعد نارمل حالات میں واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن ان دونوں ملکوں کی بات ایسی بگڑی ہے کہ نصف صدی سے زائد گزرنے کے بعد بھی کسی صورت بنائے نہیں بنتی۔ دونوں طرف نئی نسلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ایک دوسرے سے متنفر اور بدگمان۔ ایسی خوفناک صورت حال میرا خیال ہے کہ دنیا میں اور کہیں موجود نہیں۔ برلن کی دیوار گر گئی، روس اور امریکہ میں دوستی ہو گئی نہیں ملتے تو بھائی ضلو اور مراری لال اور اس کی زیادہ تر وجہ پریس ہے۔ دونوں طرف کا پریس اور سیاست دانوں کی تقریریں۔ دونوں ملکوں کے ڈپلومیٹ جب ممالک غیر میں سوشل تقریبات کے دوران ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بڑی دوستی بھی ہو جاتی ہے۔ بالخصوص اگر دونوں فریق پنجابی ہوں تو بے تکلف پنجابی میں گفتگو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر ایک دوسرے کے مخالف۔ ہم جیسے سادہ دل بندے ان سے بے ڈھب سوال کر لیتے ہیں تو انھیں بہت غصہ آتا ہے۔ میں شاید ذکر کر چکی ہوں کہ لندن میں ایک مرتبہ وظیفہ دار مسز زخورشید اور شیرین کے رقص کا پروگرام تھا میں منتظمین میں شامل تھی۔ V.I.P بکس کی طرف گئی تو دیکھا پاکستانی ہائی کمشنر کی بیگم انڈین ہائی کمشنر مسز کرشنا مینن کے ساتھ بیٹھی قہوہ پی رہی ہیں۔ اصفہانی صاحب والد مرحوم کے دوست تھے اور جب والد مرحوم کلکتہ جاتے تھے تو ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے تو بیگم اصفہانی نے مجھ سے کہا تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ میں نے

فوراً جواب دیا آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔ انھوں نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا تو میں وہاں سے سٹک لی۔

سفارتی تعلقات اور ڈپلومیٹک گفتگو اکثر منافقت پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے منافقت کو ڈپلومسی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے بغل میں چھری منہ پر رام رام۔ تو یہ ساری دنیا کے ڈپلومیسی کا دستور ہے۔

الہ آباد برطانوی سرکار نے تینوں پریسڈنسی شہروں کلکتہ، بمبئی، مدراس کے علاوہ دہلی، لکھنؤ، لاہور اور پٹنہ میں جو درس گاہیں اپنی یونیورسٹیوں کی طرز پر قائم کیں۔ انھوں نے نئے ہندستان کی ذہنی تعمیر و تشکیل میں نہایت رفیع الشان رول ادا کیا۔ ان کا نصاب تعلیم پروفیسروں کی اعلیٰ علمیت اور درس و تدریس کے بلند ترین معیار پر مبنی تھا۔ یہی درسگاہیں 1875 عیسوی کے بعد ہمارے ملک کی تشکیل نو کے ذمہ دار ہیں۔ اگر یہاں انگریزی تعلیم رائج نہ ہوتی تو ہم بھی افغانستان و شیام وغیرہ سے زیادہ مختلف نہ ہوتے گذشتہ صدی میں غالباً 1857 سے پہلے ایک مورخ کے مطابق جب انگریزی کتابوں سے لدے برطانوی جہاز بنگال کے خضر پور بندرگاہ پر پہنچتے تھے تو بنگالی طلبا کا جم غفیر وہاں موجود ہوتا تھا۔ اس مجمع میں مسلمان نوجوانوں کی تعداد غالباً بہت کم تھی ورنہ اس صوبے کا مسلمان اتنا پسماندہ نہ رہتا۔ تعلیم کی طرف سے بے توجہی سارے ہندستان کے مسلمانوں کی علمی خصوصیت رہی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟ پہلے مولویوں نے فتویٰ دیا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے۔ اس کا ایک سیاسی پس منظر تھا۔ مسلمان اچانک اپنی سلطنت کھو بیٹھے تھے۔ وہ ایک رولینگ کلاس کے بجائے ایک نہایت آفت زدہ قوم بن چکے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے تھے کہ ان کے شان سلف کی دربار میں فرنگی جوتے اتار کر حاضر ہوتا تھا۔ آج انھیں انگریز کلکٹر ضلع کے پاس جوتے اتار کر جانا پڑتا ہے۔ یہ ایک ایسی شدید اندوہناک اور عبرت خیز صورت حال تھی جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے لیکن ہمارے بزرگوں نے اس کا بہ ذات خود تجربہ کیا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ نئے انگریزی تعلیم یافتہ ہندو فرقے نے مسلمان نوابوں کا لباس اور ان کے طور طریق اختیار کیے۔ کیونکہ وہ مسلمان کو ایک برتر تہذیب گردانتے تھے لیکن وہی نیا ماڈل

کلاس انگریزی داں بابو مسلمان کو حقیر سمجھتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے والد یعنی نئے بنگال کے ایک عالی ہمت نمائندے نے شمالی ہند میں اپنے کسی سفر کے دوران دیکھا کہ انگریز دہلی کے آخری بادشاہ کو قید کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ یہ ایک بڑا عبرت ناک واقعہ تھا۔ یعنی ایک پوری عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ ایک ہزار سالہ تہذیب کا انجام اور نئے ہندستان کے ایک ماڈرن بنگالی ترقی یافتہ انگریزی تعلیم سے بہرہ ور نئے بنگال کے ایک باشندے نے ایک جملے میں سرسری طور پر قلم بند کیا۔ انگریزی طرز سے گرمیاں گذارنے پہاڑ پر جا رہا تھا۔

سارے دنیا کے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سے یہ بے اعتنائی کیوں؟ یورپ کا واحد ملک البانیہ اس براعظم کا پسماندہ ترین ملک رہا ہے۔ اس وقت بھی ہندستان میں مسلمان لڑکیاں تعلیم میں اپنے بھائیوں سے آگے نکل گئی ہیں اور بھائی سنیما اور ٹیلی ویژن دیکھنے میں مصروف ہے۔ بمبئی میں ہر نئی پکچر کا افتتاح ایسے دن ہوتا ہے جب مسلمان زیادہ سے زیادہ آسکیں۔ اور زیادہ تر فلم مسلمانوں کی سرپرستی کی وجہ سے چلتی ہیں۔

چنانچہ 1898 عیسوی میں جب مولوی ممتاز علی نے رسالہ ''تہذیبِ نسواں'' جاری کیا اس وقت مسلم معاشرے میں تعلیم یافتہ عورتیں اتنی بڑی تعداد میں موجود تھیں جو اس اخبار کی خریدار بنی اور اس میں مضمون لکھے۔ یہ ایک بہت قابلِ ذکر سماجی ترقی تھی یعنی 1857 عیسوی سے پہلے مسلمان عورتوں کا اخبار شائع ہونا اور اس میں خود ان کی مضمون نویسی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ترقی بہت سست رفتار سہی لیکن ایک سماجی انقلاب کا پیش خیمہ بنی۔ اب اس اولیں دور میں جن مسلمان گھرانوں کی لڑکیوں نے مضمون نگاری شروع کی اس میں مس نذر الباقر کا نام بھی سرفہرست رہا۔ ہر مصنف یا ادیب کی ادبی سرگرمیاں یا تخلیقات اس کے سماجی پس منظر کا آئینہ دار ہوتی ہیں۔ بنتِ نذر الباقر نے ایک ایسے عبوری دور میں جنم لیا جب برطانوی تہذیب اور برطانوی حکومت ہندستان میں مستحکم ہو چکی تھی اور انڈیا تاجِ برطانیہ کا کوہِ نور کہلاتا تھا۔ اس دور میں برطانوی ہندستان رجواڑوں کے طبقۂ نسواں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہندو اشرافیہ کی عورتیں مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ گئی تھیں۔ بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبہ جات کی

عورتیں نسبتاً سب سے زیادہ بہتر حالت میں تھیں۔ بنگالی Native اور کرسچن عورتیں بہر حال
پیش پیش تھیں۔ ان کے متعلق بہت لکھا جا چکا ہے۔ بنگال بہ الفاظ دیگر کلکتہ ایک ایسا شہر تھا جو گویا
ہندستان میں شامل ہی نہیں تھا بلکہ مغرب کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ جہاں تورودت ان کی بہن آج
سے ڈیڑھ سو برس قبل فرانسیسی زبان میں شاعری کر رہی تھیں۔ بنگالی ہندو اپنی ترقی یافتہ حیثیت کی
وجہ سے اپنے آپ کو باقی ہندستان سے الگ سمجھتا تھا اور سارے ملک کا گویا ذہنی قائد بن چکا تھا۔
اس میں ایک احساس برتری بھی پیدا ہو گیا تھا۔ تاریخ کی ایک ستم ظریفی یہ تھی چونکہ مسلم نوابین کا
حکمراں طبقہ اپنی تہذیب کی وجہ سے بہت اعلیٰ وارفع سمجھا جاتا ہے۔ انگلش سرکار نے جب حکومت
مسلمانوں سے چھین کر ہندو طرف داروں کو سونپی تو ان نئے حکمرانوں نے مہذب کہلانے کے
لیے اور انھیں بنگالی ہندو زمین دار طبقہ نئے بنگالی فکشن اور سنیما میں خوب خوب اجاگر کیا گیا۔ مسلم
نوابوں کا لباس اور طور طریق اختیار کیے۔ چنانچہ ہندو زمین دار جو اپنی تخلیق کے لیے انگریزوں کا
مرہونِ منت تھا۔ اس نے اپنے آپ کو خود اس مسلم ارسٹوکریسی کے سانچے میں ڈھالا۔ مسلم
اشرافیہ اور نوابین کا طبقہ پس ماندہ ہوتا گیا اور ان کی جگہ نئے ہندو "نوابین" یعنی زمین داروں نے
لے لی۔ یہ نواب Nawab Syndrom بھی ایک عجیب و غریب چیز تھی۔ اس طبقے کے اصل
ماڈل امرائے ایران و توران تھے۔ اب یہ ایرانی تہذیب دور دراز چین سے لے کر مشرقی یورپ
تک پھیل چکی تھی۔ میں نے روسی آذربائی جان کے شہر باقو میں کئی ایسے مکانات دیکھے جو لگتا تھا
کہ دہلی، لکھنؤ، ڈھاکہ یا حیدرآباد اندرونِ شہر لاہور سے اٹھا کر وہاں رکھ دیے گئے ہوں۔ وہی
پردار صحن اور کمروں میں قالین گاؤ تکیہ ظروف و سامان آرائش یہ مخلوط ایرانی، ترکی اور مصری طرز
زندگی "نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک قاش گیر" تو رائج تھا ہی دوسری طرف عرب تمدن سے
ہسپانیہ میں آٹھ سو سال جگمگایا اور جنوبی امریکہ سے لے کر کیلیفورنیا میں یہ طرز تعمیر آج بھی باقی
ہے۔ خود ہندستان میں روز مرہ کی ضروریات کا سامان اور ان کے نام آج غیر مسلم سماج میں
صدیوں سے موجود ہیں۔ اب پیالہ کٹوری کہا جارہا ہے۔ لیکن لحاف، رضائی و تکیے اور چادر کے
لیے ابھی کوئی ہندی الفاظ ایجاد نہیں ہوئے۔ بلکہ بہت سے عربی فارسی ایسے الفاظ ہندی گیتوں اور

دو ہے میں صدیوں سے شامل ہیں گو ان کا تلفظ کہیں کہیں بدل ہی گیا ہے ۔

تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات
جھینی جھینی بھنگی چدریہ

بچے آج بھی چیز کو چیز ہی کہیں گے دستو نہیں کہہ پائیں گے۔ زبانوں کے ارتقا میں صدیوں کا ہیر پھیر شامل ہے اور یہ سرکاری طور پر دفتر کی میز پر نہیں بنائی جاتیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد جب مشرق کے پیش تر ممالک کو مغربی سامراج سے چھٹکارا ملا تو قومی شخصیت کی اہم ترین شناخت کے طور پر زبانوں پر سب سے پہلے توجہ دی گئی۔ عرب کے تمدنی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے پہلے ترکی نے رسم الخط بدلا اور یورپ سے ناطہ جوڑنے کے غرض لاطینی اسکرپٹ اختیار کیا۔ والد مرحوم نے اس صدی کے بالکل اوّلین برسوں میں عربی رسم الخط والی ترکی پڑھی تھی وہ اس طرح کہ حاجی اسماعیل خاں رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ مشرق وسطیٰ سے ٹرکی پڑھ کر آئے تھے اور والد مرحوم ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کو انگریزی پڑھاتے تھے اور اس کے بدلے میں حاجی صاحب سے ترکی سیکھتے تھے۔ چنانچہ برطانیہ کی وزارت خارجہ سے سلطنت عثمانیہ بھیجنے کے لیے ایک ٹرکی داں نوجوان کی درخواست طلب کی گئی تو والد مرحوم کا اس میں انتخاب ہوا۔ 1904 عیسوی میں وہ مرحوم بغداد روانہ ہوئے اور اپنے سفر نامے میں لکھا کہ جہاز پر ان کی ملاقات سند باد جہازی سے ہوئی گویا سفر نامے میں ایک افسانوی عنصر اور طرز بیان شامل کیا۔ اس لحاظ سے سفر بغداد کو اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ رپورتاژ ایک نئی اصطلاح ہے آکسفرڈ ڈکشنری کی جدید اصلاحات میں بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر کے ''پودے'' کو رپورتاژ کہا گیا۔

اب معاملہ یہ ہے کہ افسانہ، ناول اور ڈرامہ تینوں کی اساس ان ہی مغربی اصناف پر مبنی ہیں اور اس کے ماڈل بھی عصری وکٹورین فکشن کے بجائے سترھویں صدی کے ادب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ تمثیلی انداز کی اخلاقی کہانیاں ہمارے یہاں بہت مقبول ہوئیں۔ افسانے اور ناول کا طرز نگارش بھی تمثیلی رہا۔ یعنی کردار کا نام اور اس کے بعد اس کا مکالمہ اور (ہنس کر یا خفگی

سے) وغیرہ ہمارے بزرگوں نے انیسویں صدی کے جدید مغربی ناول کو اپنا ماڈل کیوں نہیں بنایا۔ کیونکہ ہمارا مشرقی طرزِ بیان سترھویں صدی انگلستان کے طرزِ بیان سے لگا کھاتا تھا۔ ہمارے یہاں جدید مغربی طرز کے ناول بہت ہی کم لکھے گئے۔ پریم چند کے یہاں بھی مکالمہ ڈرامے کے انداز میں ملتا ہے۔ بالکل نئے مغربی طرز کا ناول سب سے پہلے غالباً عزیز احمد نے لکھا جو کافی عرصہ انگلستان و یورپ میں گزار آئے تھے۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہمارا جدید ادب بنیادی طور پر Original نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہماری شاعری قطعاً Original تھی اور اگر ہمارے بنے بھائی ملک راج آنند وغیرہ دوسری جنگِ عظیم سے چند سال پہلے انگلستان نہ گئے ہوتے تو شاید یہ نئی لہر بھی اردو میں بہت عرصے کے بعد پہنچتی۔ ان نوجوانوں کے جوش اور ولولے کا کیا عالم رہا ہوگا جب لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج میں یہ نئے مغربی ادب سے روشناس ہوئے وہاں کے قہوہ خانوں میں انگریز طلبا کے ساتھ بحثیں کیں۔ ان کے جلسے جلوس میں شامل ہوئے وہ زمانہ بھی پہلی جنگِ عظیم کے بعد جولیفٹ ونگ انٹیلکچویل کا دور شروع ہوا تھا۔ اس سے یہ متاثر ہوئے۔ یعنی عالمی تاریخ کے سارے تانے بانے اور دھاگے آپس میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ اگر آپ تبت میں نہیں رہتے تو ان دھاگوں میں الجھ جانا ناگزیر ہے اور اردو کے علاوہ ساری جدید ہندستانی زبانوں میں نئے دور کا آغاز اسی طرح ہوا اور وہ سب مغرب سے نکل کر اسی انداز میں ان کا اثر قبول کیا۔ نئے ہندستان کے ایک علم بردار رابندر ناتھ ٹیگور نے کیٹس اور شیلے سے متاثر ہوکر اپنی شاعری کی۔ مطلب یہ کہ کولونیل مشرق اپنے دورِ جدید میں مغرب کا خوشہ چیں اور مقلد رہا۔ قوم پرستی کے جوش کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔

اب ذرا انیسویں صدی کے مشرقِ اوسط اور وکٹورین ہندستان پر نظر ڈالتے چلیے رومن امپائر کے بعد خلافتِ اسلامیہ ایک ہمہ گیر سلطنت کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئی۔ وہ کیا زمانہ رہا ہوگا جب اندلس اور شمالی افریقہ سے لے کر مشرقی ایشیا تک ایک ایسی بین الاقوامی تہذیب درخشاں تھی جس کا ثانی بعد میں محض برٹش امپائر کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس تہذیب میں

بھی ایک نوع کی کاسٹ سسٹم نے جنم لیا۔ یعنی حکمراں طبقہ مسلمان۔ تعلیم وتربیت عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی تجارت و مالیات یہودی اور ارمنی عیسائی وغیرہ۔ تقریباً یہی صورت سلاطین ہند اور عہد مغلیہ میں موجود رہی۔ وہاں محکوم عیسائی اور یہودی اقلیت میں تھے لیکن کلیدی اور اہم ترین معاملات حکمراں مسلمانوں نے انھیں سونپ دیے تھے اور خود بہ بطور پاشا یا خلیفہ یا سلطان ان کا طرز زندگی رفتہ رفتہ عیش پرستی کے لیے ضرب المثل بن گیا۔

اب صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں عیاش پاشا، کنیزیں، چار بیویاں اور حرم سرا کی ایک مستحکم تصویر اہل مغرب کی ذہنوں میں جاگزیں ہوگئی۔ بردہ فروشی یعنی کنیزوں اور غلاموں کی خرید وفروخت بھی اس تصویر میں شامل تھی اور یہ امیج اس حد تک دیرپا رہا۔ 55-1945 عیسوی میں میرے کچھ رشتہ دار بچے مانچسٹر کے ایک اسکول میں داخل ہوئے تو ان کے انگریز ہم درس بچوں نے ان سے پوچھا کیا تمھارے یہاں موٹر کار ہوتی ہیں تو ہمارے ماموں زاد بھائی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا نہیں۔ ہم لوگ ہاتھی پر بیٹھ کر اسکول جاتے ہیں لیکن ہمیں اہل مغرب کی اس لاعلمی پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔

ہندستان اور باقی مشرق کی عورتوں کے متعلق بہت ہی افسوس ناک تصورات اہل مغرب کے ذہنوں میں جاگزیں تھے۔ گذشتہ صدیوں میں جب یورپین عورتیں ہندستان پہنچیں تو یہاں کی عورتوں کو دو طبقوں میں منقسم پایا۔ اشرافیہ کی پردہ نشین خواتین اور غریب عورتیں جو باہر نکل کر سودا بیچتی تھیں یا کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ عیسائی مبلغین کو اچھوتوں اور غریب ہندوؤں کے سماج میں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرق وسطی میں عیسائی مبلغین زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ اس کے برعکس انڈیا میں ہندو کاسٹ سسٹم مشنریوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ حالانکہ ذات پات کا ہزاروں سال پرانا رواج تبدیلی مذہب نے فی الفور منقطع نہیں کیا چنانچہ عیسائی میں بھی اونچی ذات اور نیچی ذات کی تفریق موجود ہے جن کنبوں نے اپنے پرانے ہندو خاندانی نام برقرار رکھے ہیں وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اونچی ذات کے کرسچن ہیں اور وہ عیسائی جن کی خالص یورپین خاندانی نام ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپین مشنریوں

نے ان کے باپ اور دادا چھیدو لال اور چھوٹے لال کو فرانسس ڈی کوسٹا اور جان فیریز ربنا دیا تھا۔ نام شخصیت کا لباس ہے اور شخصیت میں اس سماجی حد بندی اور یا کلاس کی خصوصیات بھی شامل ہوتی ہے جس میں اس فرد نے جنم لیا۔ ہندستان میں دیسی عیسائی فرقہ ایک عجیب وغریب دوراہے پر موجود رہا۔ برطانوی عہد میں اس نے انگریز یا یورپین مشنری کسی غریب ہندستانی کو بپتسمے دیتے وقت اپنا ہی نام اسے عنایت کر دیا۔

نذر سجاد حیدر نے شمالی ہند کے اس بالائی انگریزیت زدہ طبقے کی عکاسی نہایت مشاقی سے اپنے ناولوں میں کی۔ وہ اسٹائل اس دور کے روحِ عصر کا حامل تھا۔ ہر دور میں الفاظ کم وبیش وہی رہتے ہیں لیکن ان کے تلازمات مختلف ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا مصنفہ کے اسٹراہیٹ پہننے والے فیشنبل نوجوان اور ستار بجانے اور انگریزی بولنے والی حسینائیں دوسری جنگ عظیم سے قبل کی تین دہائیوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ یہ سول لائنز کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والا طبقہ انگریزوں نے تخلیق کیا تھا اور اسی طبقے کے چند نوجوان جب لندن آکسفرڈ اور کیمبرج پڑھنے کے لیے گئے تو وہاں برطانیہ کی نئی لیفٹ ونگ تحریک سے متاثر ہوکر لوٹے۔ نیا ادب بھی اسی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور چند بنگالی نوجوان اس Movement کے قائد تھے۔ مجھے یاد ہے ایک روز بنّے بھائی ۲۱ فیض آباد روڈ پر بہت دیر تک والد مرحوم سے باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد ہمارے بھائی نے ذرا استہزا کے ساتھ کہا یہ سوشلیسٹ بنتے ہیں۔ ان کے والدین ہمارے ابا جان اور اماں کے بہت پرانے اور قریبی دوست تھے۔ والد مرحوم کو نئی ترقی پسند تحریک سے بہت دلچسپی اور ہمدردی تھی، کیونکہ وہ خود پینتیس چالیس سال قبل اردو کی نئی تحریک سے وابستہ رہے تھے اور اُردو ناول نویسی کے متعلق اپنے طویل مضمون میں 1898 عیسوی میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہر ناول میں امیروں یا نوابوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ابھی اردو میں مفلسی اور ناداری کی تصویر کشی نہیں کی گئی مجھے الفاظ صحیح طور پر یاد نہیں ہیں مگر مطلب یہی تھا۔ اماں کے روزنامچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں کی وہ ایک پیش رو رہی ہیں اور سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ لیکن انھوں نے اسٹیج پر جاکر تقریریں کبھی نہیں کیں۔ البتہ اپنے قلم کے ذریعے خوب خوب جدوجہد کی۔

آزادیٔ نسواں اور آزادیٔ ہند دونوں کے لیے سرگرم رہیں۔ ''عصمت'' اور ''تہذیب'' کے مدیروں نے بھی غالباً کوئی مبسوط تذکرہ ایسی خواتین کا شائع نہیں کیا۔ لہٰذا ہماری موجودہ نسل اور بالخصوص ہندستان کے دوسرے فرقوں کو پکا یقین ہے کہ ہندستانی مسلم خواتین سب پردے میں مقید اور اَن پڑھ اور مردوں کی محکوم آبادی کے لحاظ سے ان کی قلیل تعداد بھی زیادہ تعجب خیز نہیں۔ حالانکہ تعلیم کے میدان میں وہ اپنے تناسب کے لحاظ سے بھی بہت آگے تھیں۔ علی گڑھ، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد دکن، کلکتہ، بھوپال اور جنوبی ہند میں مسلمان اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ میں نے پہلے بھی کہیں ذکر کیا ہے کہ غازی پور جیسے دور افتادہ اور پسماندہ شہر میں 33-1932 عیسوی کے زمانے میں ڈاکٹر زبیدہ صالح ایم۔ بی بی ایس، مس حمید جہاں لیڈیز یونیورسٹی انگلستان کی ڈگری یافتہ انسپکٹرس آف اسکول اور زینب امجد علی لکھنؤ یونیورسٹی کی گریجویٹ بیک وقت موجود تھے۔ آپا حمید جہاں جو علی گڑھ والی اعلیٰ بی کی بھانجی تھیں جب دورے پہ آتیں تو ہمارے یہاں قیام کرتیں۔ اردو کا زنانہ پریس نہایت زوردار، بااثر اور بلند پایہ تھا۔ میرے خیال میں اس برصغیر کی دوسری زبانوں میں باتصویر ''عصمت'' اور ''تہذیب نسواں'' جیسے شاندار رسالے اور ہفتہ وار اخبار کم ہی نکلتے ہوں گے۔ عام طور پر گھروں میں خاتونِ خانہ اور دوسری عورتوں کی بہت عزت کی جاتی تھی اور گھر کے اندر حکومت بھی ان ہی کی تھی۔

تو پھر یہ مسلمان عورتوں کی پسماندگی، جہالت، محکوی اور بے علمی کا یہ امیج کس طرح بنا۔ بے علمی کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلمان گھرانوں میں آتو جی یا استانی جی ایک خاص اہمیت کی مالک تھیں۔ آتو سے ظاہر ہوتی ہے کہ شاید یہ ترکی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

آتو جی شادی کرنے پہ مائل ہے فاضلہ
پڑھنے کو حسن و عشق کی اس کو کتاب دو
آتو صاحب اُسے بلاتی ہے
منتظر ہیں محل میں جاتی ہیں

(مہذب اللغات از مہذب لکھنوی)

اتاترک، اتابیک سے ہم سب واقف ہیں۔ الماتا یعنی بڑا سیب روسی ترکستان کا مشہور شہر ہے۔ اودھ میں الواغو چمن مشتمل ہے۔ الفاظ کا سفر حیرت انگیز ہے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ قلم، کرسی، کتاب کو لیجیے۔ کتاب تو پستک ہوگئی لیکن قلم اور کرسی کے لیے ہندی میں غالباً کوئی الفاظ نہیں۔ اسی طرح عینک، چشمہ، دوا، تکیہ، کرتہ وغیرہ۔

نذر سجاد حیدر نے وکٹورین ہندستان میں جنم لیا اور آزادی کے بیس (20) سال بعد وفات پائی۔ اس طرح برٹش انڈیا پاکستان اور آزاد ہندستان تینوں ادوار کا تجربہ کیا۔ ان کی نسل کے بیش تر افراد سیاسی بدامنی، تقسیم ہند کی خونریزی، پاکستان یا دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کے مسائل سے دوچار رہے۔ سڈنی آسٹریلیا میں میری ملاقات مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نواسی سے ہوئی جو وہاں اپنی پوتی کے ساتھ مقیم تھیں اور وہاں کی تنہائی سے بے حد دل برداشتہ تھیں کیونکہ ان کا کوئی ہم زبان بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ آج کے دور میں بزرگ بھی خانہ بدوش ہوگئے ہیں اور اپنے پوتوں نواسوں کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ جو بیگمات انگنائی سے باہر بھی کم جاتی تھیں اب لندن یا اسلو یا کسی امریکن شہر کی گلیوں میں شاپنگ بیگ لیے سودا سلف خریدتی پھرتی ہیں۔ ان کی اولاد نے انھیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے وطن ہندستان یا پاکستان سے وہاں بلوا لیا ہے۔ والدہ مرحومہ جو پہلے متعدد بیرونی سیاحتیں کر چکی تھیں ایک مرتبہ میرے ساتھ انگلستان گئیں لیکن وہاں خوش قسمتی سے ان کو تنہائی کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ لندن میں ان کی آمد کی اطلاع شاید ''عصمت'' کراچی میں شایع ہوگئی تھی اور لندن میں مقیم ان کی مداح خواتین نے ان کے پاس آنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے سجاد حیدر صاحب مع بیگم تشریف لائے جو اس وقت وہاں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے۔ ان کی کہانی یہ ہے کہ غالباً ان کے نانا نجف علی خاں سے والد مرحوم نے دہرہ دون میں امیر کابل کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کے عہدے کا چارج لیا تھا اور اس کے بعد جب نجف علی خان صاحب کے یہاں نواسہ پیدا ہوا تو اس کا نام والد مرحوم کے نام پر سجاد حیدر رکھا گیا۔ جس روز سجاد حیدر صاحب والدہ مرحومہ سے ملنے کے لیے آئے وہ حسبِ معمول ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے صاحب فراش تھیں۔ سجاد حیدر صاحب اور ان کی بیگم روح افزا

ان کے پلنگ کے پاس تشریف فرما تھے۔ اتنے میں خواجہ احمد عباس بھی آ گئے جو یوری گاگارین کو انٹرویو کرنے برائے لندن ماسکو جا رہے تھے۔ ہمارے والدین کی ان کے خاندان سے بھی بہت پرانی دوستی تھی۔ پہلے زمانے میں دستور تھا کہ ایسے تعلقات نسلاً بعد نسلٍ قائم رہتے تھے چنانچہ خواجہ غلام حسین شاید اماں کے چچا سید ظہور حسنین کے ایم۔اے۔او، کالج علی گڑھ میں ہم درس اور دوست رہے تھے۔ خواجہ صاحب بے چارے اب جو لندن میں ہمارے یہاں پہنچے تو انھوں نے پاکستانی ڈپلومیٹ کو والدہ کے پلنگ کے پاس تشریف فرما پایا۔ وہ ذرا جھجکے۔ اماں نے دو چار باتوں کے بعد بڑے اطمینان سے ان سے کہا ذرا باورچی خانے سے چائے تو بنوا لائیے۔ کچن میں اس وقت میری دوست فیروز جبیں اور حسن آپا کے صاحبزادے مٹن (عمر عزیز سید) بھی موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے اطلاع دی کمال ہے ان ہی صاحب نے مجھے کراچی میں بلیک لسٹ کروا رکھا ہے اور میں اب ان کے لیے چائے بنوا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے جا رہا ہوں۔ ہم سب کو اس عجیب و غریب صورت حال پر ہنسی آ گئی۔ اسی وقت دو امریکن لڑکے کچن کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چند پمفلٹ تھے۔ انھوں نے کہا آپ لوگ ہنس رہے ہیں کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ دنیا عنقریب تباہ ہونے والی ہے؟ سرمایہ دار امریکہ نے جو ایٹم بم بنایا ہے وہ کسی لمحے بھی لندن پر بھی گر سکتا ہے۔ مٹن نے کہا آؤ بیٹھو مرنے سے پہلے ہم لوگ تھوڑی سی چائے پی لیں۔

والدہ مرحومہ کی ساری زندگی سیر و سیاحت میں گذری اور آخر وقت تک سفر کرتی رہیں۔ 1967 عیسوی میں وہ انگلستان آئیں وہاں سے واپس کراچی اور اس کے بعد بمبئی۔ لیکن یہ ان کا آخری سفر ثابت ہوا۔ کیوں کہ چھ سال بعد اکتوبر 67 عیسوی میں انھوں نے بمبئی میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

(قرۃ العین حیدر نے اپنی والدہ نذر سجاد حیدر کے ناولوں کی کلیات 'ہوائے چمن میں خیمۂ گُل' کے نام سے مرتب کی ہے۔ یہ دیباچہ اس میں شامل ہے۔)

سات کہانیاں

مجھے توصیفی مضامین لکھنے نہیں آتے اور جب کسی کتاب کا پیش لفظ تحریر کرنے کی مجھ سے فرمائش کی جاتی ہے تو میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتی ہوں۔ محض تکلف، مروّت یا ہمت افزائی کی خاطر بے جا تعریف و توصیف نئے لکھنے والے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی کئی مثالیں ہمارے یہاں موجود ہیں جب باقاعدہ ایک گروہ کی صورت میں ایک ادبی گروپ گویا اپنے اکھاڑے کے ایک پہلوان کے لیے ڈنکا بجاتا تھا اور دوسرا گروپ اس کے مقابلے میں دوسرا پہلوان کھڑا کرتا تھا۔ فرداً ادیبوں کے بارے میں باقاعدہ پبلسٹی کی گئی لیکن اصل چیز یہ ہے کہ اس تمام دھوم دھڑ کے کے باوجود وہی ادب زندہ رہا جس میں خوبی موجود تھی۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ عورتوں نے جب لکھنا شروع کیا اٹھارھویں صدی سے یورپ اور انگلستان میں اور اس کے بعد اواخر بیسویں صدی میں خود ہمارے یہاں اردو میں، تو خواتین محض موضوع سخن نہ رہیں بلکہ ان میں یہ جسارت آگئی کہ وہ یہ بتا سکیں کہ زندگی اور دنیا کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کی اس پیش رفت کو بھی بڑے شک و شبہ یا استہزا کی نظر سے دیکھا گیا۔ شروع شروع میں ایک عرصہ تک یہ کہا گیا کہ ارے صاحب فلاں فلاں خود

تھوڑے ہی لکھتی ہیں، ان کے والد شوہر یا بھائی ان کو لکھ کر دیتے ہیں۔ چلیے! عورتوں نے یہ مرحلہ بھی طے کیا کہ خود ان کی ادبی حیثیت کو بھی قبول کر لیا گیا۔

سماجی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خود میری والدہ نے جب اپنی شادی سے قبل لکھنا شروع کیا اور زنانہ رسالوں کی حد بندی کو توڑ کر ایک دم ان کے مضامین اور افسانے 'مخزن' میں شایع ہونے لگے تو ان کے لیے یہ افواہ پھیلی کہ وہ کلب میں جا کر گوروں کے ساتھ ڈانس کرتی ہیں، مگر بہت جلد ہی اُردو دنیا نے ان کو بحیثیت ایک مضمون نگار، مرد لکھنے والوں کی صف اوّل میں جگہ دے دی۔

اسی طرح والدہ مرحومہ کی پھوپھی اکبری بیگم جن کا معرکہ آرا، ناول ''گودڑ کا لال'' 1907 عیسوی میں چھپا۔ اس سے قبل ''گلدستۂ وفا'' انھوں نے مردانہ فرضی نام عباس مرتضٰی کی حیثیت سے چھپوایا تھا۔ 1907 عیسوی تک کے تعصبات کچھ کم ہوئے لیکن پھر بھی وہ اپنے بیٹے کی والدہ کی حیثیت سے ہی لکھتی رہیں۔ اپنا نام کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور گودڑ کا لال' بھی اُردو کے مین اسٹریم فکشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کی بھتیجی بنت نذرالباقر نے محض اپنے زورِ بیان اور ادبی صلاحیت کی بنا پر تعصبات کی اس سرحد کو بھی بہت جلد پار کر لیا اور ان کے مضامین و افسانے مردانہ رسالوں میں بھی شایع ہونے لگے۔

ان کا افسانہ ''ایک مکالمہ'' اپنی نوعیت کی پہلی ادبی تخلیق تھی جس میں محض مکالمے کی تکنیک استعمال کی گئی تھی اور یہ 1907 عیسوی میں رسالہ ''خاتون'' علی گڑھ میں شایع ہوا تھا۔ شاید ہمارے سماج کے پردہ سسٹم کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے ادب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اور بہت جلد یعنی آج سے تقریباً نوے سال قبل اُردو کی ان Pioneer خواتین نے جن میں محمدی بیگم، بنت نذرالباقر اور صغریٰ ہمایوں مرزا شامل تھیں ان حد بندیوں کو توڑا۔ اس کے باوجود عورت کے لکھے ہوئے ادب کے بارے میں تحفظات کہیں کہیں موجود ہے۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ان کا فکشن ادنیٰ درجے کا ادب ہے۔ یہ رائے ہمارے محترم نقاد پروفیسر وقار عظیم کی بھی تھی۔

لیکن تعجب ہوتا ہے اگر آپ محض ایک زنانہ ماہنامہ ''زیب النساء'' کے پرانے فائل اٹھا کر دیکھیے کہ خواتین کی کتنی بڑی تعداد نے کتنے اچھے افسانے لکھے۔ بے شک وہ افسانے مجموعی طور پر رومانٹک کہلائے جا سکتے ہیں لیکن ان میں انسانی نفسیات، زندگی کے پے چیدہ معاملات کے متعلق ان خواتین نے کیسی روانی اور فطری بیانیہ انداز میں کتنی اچھی کہانیاں لکھیں گو یہ افسانہ نگار خواتین زیادہ تر بھلا دی گئیں۔

حجاب امتیاز علی منفرد ہیں۔ ان کا اسلوب اور جس دنیا کی انھوں نے تخلیق کی وہ ایسی انوکھی اور دل آویز تھی کہ اس کی کوئی تقلید نہ کر سکا۔ گو ترقی پسندوں نے ان کا مذاق اڑانا اپنا فرض جانا۔ عصمت چغتائی پہلی خاتون تھیں جو اپنی مغلیہ ترک تازی کے ساتھ ادب کے قلعہ پر حملہ آور ہوئیں اور اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ان کے بعد دوسری عصمت چغتائی کا سامنے آنا ذرا مشکل تھا کیوں کہ عصمت آپا نے ادب میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ عصمت آپا کے پہلے مجموعہ ''کلیاں'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک ادب کی دنیا میں بہت انقلاب آئے۔ خارجیت سے داخلیت کی جانب جانے کا سلسلہ رہا۔ ہاجرہ، خدیجہ، بانو قدسیہ، خالدہ حسین پاکستان کے چند بڑے نام ہیں۔ بہت سی خواتین ڈائجسٹوں کی کمرشیل تحریروں کی طرف چلی گئی ہیں اور اس میدان میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت کامیاب رہی ہیں۔ ہندستان میں جیلانی بانو کا ادبی مقام تو مسلم ہے۔ واجدہ تبسم کمرشل رائٹر بن گئیں۔ رفیعہ منظور الامین نے ایک اچھا ناولٹ لکھا۔ نئی لکھنے والیوں میں ذکیہ مشہدی اور شمیم صادقہ قابل ذکر ہیں۔ مقبول فکشن رائٹرز کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پانچ سو پروفیسروں اور طلبا کی Reading Habits کا ایک سروے کرایا تھا جس میں زیادہ تر پروفیسروں اور طلبا نے اپنی پسندیدہ مصنفہ رضیہ کو بتایا۔ لہٰذا قبول عام بھی ادبی مرتبے کی سند نہیں ہے۔

اب بالکل آج کی نسل پر آئیے۔ میرے ہاتھ میں چند کہانیاں نئی لکھنے والی صباحت مشتاق کی ہیں۔ ان کو کس خانے میں رکھا جائے؟ یہاں پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ 1988 عیسوی میں جب میں لاہور گئی تو حجاب امتیاز علی نے مجھے بلایا۔ وہ میری والدہ کی بہت پرانی دوست تھیں

اوران کی شادی بھی امتیاز علی تاج سے میرے والد مرحوم نے کرائی تھی۔ اس سے قبل امتیاز علی تاج کے والد شمس العلما مولوی سید ممتاز علی نے جو میری والدہ کے منہ بولے بھائی تھے ان کی شادی یلدرم سے کرائی تھی۔ چنانچہ قصہ کوتاہ حجاب امتیاز علی سے ایک عرصے کے بعد لاہور میں ملی تو ان کو ماشاالله نہایت بشاش پایا۔ تب انھوں نے اپنے یہاں دعوت میں ایک ٹی۔ وی کے گائیک کو بلایا تھا۔ مجھ سے کہنے لگیں میوزک دو طرح کی ہوتی ہے۔ اچھی میوزک اور بری۔ یہ اچھی میوزک والے ہیں۔ تو آمدم برسر مطلب اس طرح قدیم وجدید نئی نسل اور پرانی نسل ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، بیانیہ، تجریدی اور علامتی قضیوں سے قطع نظر ادب محض دو طرح کا ہوتا ہے۔ اچھا ادب اور برا۔ تو صباحت مشتاق کے افسانوں کو میں سمجھتی ہوں کہ اچھے ادب کے خانے میں رکھا جائے گا۔ نئے لکھنے والوں کے ہجوم میں شناخت قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن صباحت بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا راستہ بنا چکی ہے۔ ان کے افسانوں میں مجھ کو ایک اہم وصف یہ نظر آیا کہ ان میں آورد نہیں ہے نہ ہی وہ اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کسی انوکھی تکنیک کا مظاہرہ کیا جائے۔ مصنفہ کی ذہنی پختگی اور اسلوب پر ان کی گرفت بہت واضح ہے۔ موضوعات کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے مجموعے کا پہلا افسانہ 'ماریا' دور حاضر میں لکھے گئے چند بہت اچھے افسانوں میں با آسانی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کے کسی بھی معاشرے کی کہانی ہوسکتی ہے۔ ماریا ایک چینی کیتھولک لڑکی بھی ہوسکتی ہے۔ وہ بمبئی کی گوانی لڑکی بھی ہوسکتی ہے اور لاہور، مری یا کینیڈا کی بھی۔ یہ ایک یونیورسل افسانہ ہے۔ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے صباحت مشتاق جذباتیت سے صاف بچ جاتی ہیں۔ غیر ضروری الفاظ اور فالتو تفصیلات کو ان کے افسانوں میں جگہ نہیں ملتی۔ ان کے بعض جملے اچانک چونکا دیتے ہیں۔ مثلاً یہ تعارفی جملہ کہ "میں وہ بن مانس ہوں جو خلائی سفر پر بھیجا گیا تھا"۔ "ماریا" اور "اعتراف" جدید اور مغربی انداز کی غیر معمولی کہانیاں ہیں۔ اسی طرح صباحت مشتاق کی ایک غیر معمولی داستان ہے۔ "برف" بھی بہت اچھی اور متاثر کرتی ہے۔ میں صباحت مشتاق کو ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔ اس کی بعض کہانیاں ضرورت سے زیادہ مختصر ہیں۔ وہ ایسی منی ایچر تصویریں بنانے کی بجائے کینوس کو ذرا وسیع بھی

کرسکتی ہیں۔ بہرحال ابھی تو اکیسویں صدی ان کی منتظر ہے اور اس کے آغاز میں اُردو افسانے کی عمر کے سو سال بھی پورے ہو جائیں گے۔ افسانے کے اس آنے والے عہد میں مجھے یقین ہے کہ صباحت ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرلیں گی۔

(صباحت مشتاق کے مجموعہ 'سات کہانیاں' کا تعارف یہ کتاب فکشن ہاؤس لاہور سے 1997 میں شائع ہوئی ہے۔)

میرا پیغام محبت ہے

آج کراچی سے سناؤنی آئی ہے کہ نفیسہ آپا بھی اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں۔ وہ ایک غیر معمولی خاتون تھیں اور ان کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے میں ان کی زندگی کے تہذیبی پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ کوئی تصویر ہوا میں معلق نہیں کی جاسکتی۔ اس کے ساتھ اس کا منظر بھی ہوتا ہے۔

اردو تہذیب بنیادی طور پر ایک انتہائی بارونق اور حیرت انگیز شعرستان ہے۔ الفاظ کی موزونیت اور روانی ایسی جس کی مثال بہت سی دوسری زبانوں میں کم ملے گی۔ اس تہذیب کی کثیر الجہت جمالیات میں شاعری، موسیقی اور مصوری ایک ہی قندیل کے تین رخ ہیں۔ شعر راگ میں ڈھلا اور راگ کی عکاسی رنگوں میں کی گئی۔ وہ راگ رنگ بنے۔ مینا توری (miniature) مصوری میں جزدیات کی پیش کش تعجب خیز رہی اور وہ ہی سات رنگ سات سر بن گئے یا سات سروں کو رنگوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس تخلیقی عمل کا میدان نہایت وسیع رہا۔

اجنتا کے فریسکو، ایلورا کی سنگ تراشی، راگ راگنیاں، لوک سنگیت اور کلاسیکل موسیقی۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہے اور اس کی وجہ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ مشرق کے اس عظیم

الشان آرٹ، فن تعمیر اور سنگیت کے خالق زیادہ تر گمنام کیوں رہے۔ یورپ میں عہد وسطیٰ سے لے کر آئندہ صدیوں تک کے تقریباً سب فنکاروں کے نام اور ان کے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔ لیکن کم از کم مجھے نہیں معلوم کہ اجنتا کی Black Princess کس نے بنائی تھی۔ ہمیں ان راجاؤں کے نام سے واقفیت ہے جن کے ادوار میں یہ تصویریں یا مورتیاں بنائی گئیں، ان کے خالق گمنام رہے۔ کیوں؟ محض چند مغلیہ مصوروں کے نام ہم تک پہنچے ہیں لیکن ان کے سوانحی حالات کے متعلق کم از کم مجھے علم نہیں۔

مصور اپنی چھوٹی چھوٹی تصویریں، جو بینا تور یعنی miniature پینٹنگ کہلائیں، اپنے بستے میں محفوظ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہم مصوری کی جس نمائش کے عادی ہو چکے ہیں وہ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد جو مڈل کلاس پیدا ہوئی اس کی دین ہے۔ بادشاہ لوگ اپنے ذخیرے کی نمائش عوام کے لیے نہیں لگاتے تھے۔ عوام کی تفریح کے ذرائع مختلف تھے یعنی Performing Arts۔ ناچ، گانا، نوٹنکی۔ اردو کی ترویج اور ترقی کے ساتھ مشاعرے بھی شروع ہوئے لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے پنجاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز افسر نے اردو کو مقبول کرنے کے لیے عوام کے لیے مشاعرے متعارف کیے۔ اس طرح وہ اپنے نظم و نسق کی ضروریات کے لیے اردو کو مقبول کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ کامیاب رہے۔ ایک ایسی قوم یا قبیلہ جو کسی ملک کے سرحدی علاقہ میں آباد ہو وہ دوسری اقوام کی آئے دن کی یلغار کی بدولت نئے رسم و رواج اور نئی زبانوں سے متاثر ہونے کا عادی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مغربی ساحلی علاقوں کے باشندے شمالی ہندوستان کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ باخبر اور روشن خیال ہیں۔ ممبئی کے عوام کی خاصی تعداد انگریزی سے واقف ہے۔ شمالی ہند میں مغل تہذیب برطانوی تسلط کے بعد تقریباً انڈر گراؤنڈ ہو گئی۔ وہ گھروں اور بازاروں میں اردو کے ذریعے زندہ رہی اور بالخصوص متوسط طبقہ کے خاندانوں میں یہ زبان بھی 1857 عیسوی کی سماجی کایا پلٹ کے باوجود گھریلو عورتوں نے محفوظ رکھی۔

اردو کی باریکی ایک یہ بھی ہے کہ محنت کش عوام کی اردو نئی مڈل کلاس کی پردہ نشین عورتوں

کی روزمرہ سے ذرا مختلف رہی، گویا یہ ایک ہی رنگ برنگی قندیل کی مختلف روشنیاں تھیں یا دھنک کے سات رنگ۔ جو زبان دکن میں بولی جاتی ہے وہ پنجاب کی اردو سے مختلف ہے۔ اس میں مراٹھی اور تیلگو کے عناصر بھی شامل ہیں۔ اسی طرح وادی گنگ وجمن میں بہار سے لے کر ہریانہ تک کے اردو بازار کی گہما گہمی اور رونق کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ قابل دید کے علاوہ قابل شنید بھی ہے۔ بولی ٹھولی اب بھی موجود ہے لیکن اس میں مزید ترمیم اور توسیع ہوتی جا رہی ہے جو ایک زندہ زبان کی خصوصیت ہے۔ گو ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگلستان میں چاسر کا زمانہ تو بہت دور رہ گیا، اٹھارھویں صدی کی انگریزی بھی متروک ہو چکی ہے لیکن برصغیر کے پرانے شہروں میں انگنائیوں اور گلی کوچوں میں آج بھی آپ کو میر وسودا کی زبان کی بازگشت سنائی دے جائے گی۔

ایک مثالی اور سب سے زیادہ طاقتور بارونق کولونی کی حیثیت سے برٹش انڈیا دنیا کے نئے نوآبادیاتی نظام کا لیڈر رہا۔ حکومت کے علاوہ مشنری عورتوں نے انگریزی اسکول قائم کیے اور نئی مڈل کلاس کے زنان خانوں میں بھی پہنچ گئیں اور بہت دیر میں یعنی بنگالی عورتوں سے تقریباً پون صدی بعد شمالی ہند کی خواتین میں تعلیم کا چرچہ شروع ہوا۔ جاننا چاہیے کہ جس سماج میں کچھ عرصہ قبل تک مولوی لڑکوں کے لیے انگریزی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے وہاں عورتوں کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ محمد عبداللہ بانی مسلم گرلز کالج علی گڑھ نے سوانح عمری عبداللہ بیگم میں لکھا ہے کہ ایک شام نواب محسن الملک کے یہاں باہر چبوترے پر ان کے چند احباب جمع تھے اور دو تین نوجوان طالب علم بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم شاید ابومحمد یا سجاد حیدر نے عرض کی کہ ایک لڑکیوں کا اسکول بھی قائم ہونا چاہیے۔ نواب محسن الملک نے طیش میں آ کر اپنی ٹوپی چبوترے پر پھینک دی اور فرمایا کہ ''مسلمان ابھی لڑکوں کی تعلیم کے لیے تیار نہیں ہیں اور تم لڑکیوں کی بات لے بیٹھے۔''

ایسی مخدوش صورت حال میں کسی شخص کا گرلز اسکول قائم کرنا بڑی ہی ہمت کا کام تھا لیکن

اس نومسلم کشمیری نوجوان نے یہ کام کر دکھایا اور میرے خیال میں اس میں نوجوان کا وہ حوصلہ بھی شامل تھا جسے انگریزی میں zeal of the convert کہا جاتا ہے۔ اگر آپ پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو تاریخ کے جتنے بھی نئے باب یعنی دروازے کھولے گئے، اس مہم جوئی میں وہی ولولہ اور جوش موجود تھا۔ یہ کشور کشائی تاریخ کے جس سیاق و سباق میں کی گئی عموماً ہم اسے فراموش کر دیتے ہیں اور محض نتائج پر نظر رکھ کے اپنے فیصلے دور حاضر کے تناظر میں صادر کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہماری عمرانی ترقی خاصی سست رفتار رہی۔ ساحلی شہروں میں پارسی اور دیسی عیسائی لڑکیاں اسکول جانے لگیں۔ یہی لڑکیاں ڈاکٹر، نرس اور ٹیچر بنیں۔ چنانچہ ہمارے اولین دور کے ناولوں میں کرسچن اور پارسی عورتیں بھی بطور stock character پیش کی جاتی تھیں۔ آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تعلیم نسواں کا بیڑا اٹھانے والے ہمارے بزرگ کس قدر باہمت اور مہم جو انسان تھے۔ علی گڑھ میں شیخ عبداللہ اور لکھنؤ میں جسٹس کرامت حسین؛ یہ دو حضرات آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہت بڑا کام کر گئے۔ جنہوں نے یہاں لڑکیوں کے لیے نہ محض مدرسے بلکہ boarding school قائم کیے۔ راقم الحروف کی والدہ نذر سجاد حیدر بتاتی تھیں کہ تقریباً 1918 عیسوی میں وہ بیگم وزیر حسن کے ہمراہ لکھنؤ میں مسلم گرلز ہائی اسکول کے boarding house کے باورچی خانہ کا ہفتہ وار معائنہ کرتی تھیں اور اسی زمانے میں دور دراز بھوپال کی چند لڑکیاں بھی ان کے روشن خیال والدین نے لکھنؤ پڑھنے کے لیے بھیجی تھیں۔

ایک بہت ہی حیرت انگیز خاتون نواب سلطان جہاں بیگم جن کا تذکرہ مجھے تعجب ہے اب بالکل نہیں کیا جاتا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی چانسلر تھیں۔ میرے خیال میں اس وقت تک ہندوستان میں کسی خاتون کو کسی یونیورسٹی کا چانسلر نہیں بنایا گیا تھا اور یہ عہدہ محض نمائشی نہیں تھا بلکہ وہ بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ اپنے عہدے کی ذمہ داریاں نبھاتی تھیں۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ گزشتہ تین پیڑھیوں سے بیگمات ہی اس ریاست کی فرمانروا رہیں۔ برطانیہ میں شاہجہاں مسجد بھی نواب شاہجہاں بیگم نے بنوائی۔ بھوپال کی باہمت اور باعمل خواتین کی روایت نہایت مضبوط رہی ہے یعنی آج کل women's litature کا بہت چرچہ ہے۔ لیکن ہمارے

یہاں اس تحریک کی رہنمائی دراصل بیگمات بھوپال نے ہی کی۔ چناچہ اس برصغیر میں women's litature کی تحریک در پردہ بہت پہلے شروع ہو چکی تھی اور اردو کا ہفتہ وار اخبار تہذیب نسواں اس کا نقیب تھا۔

اب اصل موضوع پر آتی ہوں۔ 1940 عیسوی کا تہذیب نسواں کا فائل میرے پاس موجود ہے۔ اس کے ایک شمارے میں ایک چھوٹی سی نظم شائع ہوئی جس کا موضوع ہے تعلیم نسواں کے فوائد اور شاعرہ کا نام ہے ن ف از نہٹور۔ میں یہ نظم پڑھ کر چونکی چونکہ نام کا بھی پردہ تھا۔ نوعمر شاعرہ نثار فاطمہ نے یہ نظم لکھی تھی جن کے والد ڈاکٹر کرار حیدر سجاد حیدر یلدرم کے چچا تھے۔ یہ ماہر امراض چشم بھی تھے اور وائسرائے کے اعزازی سرجن بھی مقرر کیے گئے تھے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اردو کے زنانہ رسالے قصباتی گھرانوں میں پہنچنے لگے تھے اور ان کی نوعمر لڑکیوں کو ان کے بزرگوں نے یہ اجازت بھی دے دی تھی کہ وہ ان رسالوں میں اپنی نظمیں یا مضامین شائع کرائیں۔ یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ میں اس دلچسپ اور دلدوز واقعے کا تذکرہ پہلے کہیں کر چکی ہوں کہ ہمارے پردادا میر احمد علی اپنی بیگم کے ہمراہ کہیں جا رہے تھے۔ وہ خود گھوڑے پر سوار تھے اور پردے سے منڈھی ہوئی بہلی میں بیگم مع اپنے نوزائیدہ بچے کے موجود تھیں۔ بچے کا نام جلال الدین حیدر رکھا گیا تھا۔ کچی سڑک کے دھچکوں کی وجہ سے بچہ بیگم صاحبہ کی گود سے پھسل کر سڑک پر گر گیا۔ انھوں نے اف تک نہ کی، دم بخود بیٹھی رہیں کیونکہ آواز کا بھی پردہ تھا۔ ایک راہ گیر نے سڑک پر وہ بچہ پڑا دیکھا، اس نے گاڑی رکوائی۔ ورنہ آج کہاں آپ کہاں خاکسار راقم الحروف۔

مغلیہ تصاویر میں زیادہ تر عورتیں مصور کی تخیل کی نمائندہ ہیں۔ ورنہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ سات پردوں میں رہنے والی مغل شہزادیاں ایسے نیم عریاں ملبوسات میں مصور کے سامنے بیٹھیں گی۔ اس میں اکثر تصاویر بیسویں صدی کی اولین دہائی میں دہلی کے ایک کمرشل آرٹسٹ نے بنائی

تھیں جن کا نام غالباً بھگوان داس تھا۔ تہران میں میں نے دیکھا ہے کہ وہاں کمرشل آرٹسٹ روایتی ایرانی اسٹائل کی تصاویر منٹوں میں بنا کر سیاحوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں اور یہ ایک بہت نفع بخش کاروبار ہے۔

چنانچہ اواخر انیسویں صدی تک مسلمان پردہ نشین عورتوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور پردہ مسلمان اور ہندو دونوں کے یہاں کلاس سسٹم کی نمائندگی کرتا تھا۔ کاری گر طبقہ میں کہا جاتا تھا کہ فلاں فلاں کے یہاں چار پیسے آگئے ہیں تو وہ پردے میں بیٹھ گئی ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب سے پوچھا کہ جتنی لاکھوں کروڑوں مسلمان عورتیں جو کھیتوں میں کام کر رہی ہیں یا بازار میں سبزی ترکاری بیچتی ہیں کیا یہ سب دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم بھی کلاس سسٹم کی نمائندگی کرتی تھی۔ اشرافیہ کا وہ طبقہ جو مغربی طرز زندگی اختیار کر چکا تھا، ان کی لڑکیاں کانوینٹ اسکولوں میں داخل کر دی گئی تھیں مگر اس میں بھی طبقاتی تفریق تھی۔ اشرافیہ کی وہ کلاس جس کو بعد میں ترقی پسندوں نے بورژوازی کہا لیکن جو شہر کے مکانوں سے نکل کر سول لائنز کی کوٹھیوں میں آباد ہو چکے تھے۔ یہ ٹاپ بورژوازی کہلائے۔

دراصل مغرب میں بھی نئے سماجی انقلاب کی پیش رو یہی نئی اپر کلاس اور اپر مڈل کلاس تھی۔ اس نئے بالائی طبقے کا پس منظر فیوڈل تھا۔ مسلم معاشرے میں اس طبقے کی رہنمائی زیادہ تر علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے کی۔ تعلیم نسواں کا پودا بھی عموماً انھوں نے ہی لگایا تھا۔

یہ میں شمالی ہند کی بات کر رہی ہوں۔ بمبئی، حیدرآباد اور مدراس فی الوقت میرے اس تذکرہ میں شامل نہیں۔ دراصل شمالی ہند پنجاب سے لے کر بہار اور بنگال تک قدیم شاہی اور جاگیری روایات کا وارث تھا۔ اس میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ پردہ کی پابندی اس قدر تھی کہ بعض گھرانوں میں نوعمر لڑکیوں کا پردہ اجنبی عورتوں سے بھی کرا دیا جاتا تھا۔ ہندو اشرافیہ بھی پردے کی اس حد تک پابند تھی کہ اعلیٰ خاندان کی عورتیں جب کسی مذہبی تقریب کے لیے گنگا اشنان کرتی تھیں تو ان کی پردے دار ڈولی پانی میں اتار دی جاتی تھی اور وہ اندر بیٹھے بیٹھے پانی میں ڈبکی لگا لیتی تھیں۔ میری یادداشت میں ہندو مستورات کی محض ایک مثال محفوظ ہے۔

لکھنؤ میں ایک کائستھ لڑکی جو اسکول آتی تھی اس کے تانگے پر باقاعدہ پردہ بندھا ہوتا تھا اور اس کے خاندان کی ساری خواتین پردہ نشین تھیں۔ لیکن قومی تحریک کے زمانے میں زیادہ تر ہندو سماج میں پردے کا رواج شاید اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ہندو تعلقداروں کے یہاں یہ روایت کچھ کچھ باقی رہی۔

صوبہ سرحد اور پنجاب میں ہندو خواتین زرد رنگ کا شٹل کاک برقع اوڑھتی تھیں تاکہ اس رنگ کے ذریعے ان کے اپنے فرقے کی شناخت قائم رہے۔ میری بچپن کی دوست بملا جسپال بتاتی تھیں کہ ان کے خاندان کی خواتین ایک زمانے میں سب پردہ نشین اور برقع پوش تھیں۔ لیکن بملا کے والد نے اپنے گھرانے کی روایات سے بغاوت کر کے اپنے بال ترشوا دیے اور داڑھی مونچھ بھی منڈوالیں۔ اپنے سلسلۂ نسب کے لحاظ سے ریاست کے تخت و تاج کے دعوے داروں میں بھی شامل رہ سکتے تھے لیکن اس بغاوت کی وجہ سے ان کو اپنے حقوق سے دستبردار ہونا پڑا۔

فیوڈل راجستھان میں پردے کی پابندی اور بھی زیادہ تھی۔ اس طرح پردہ بنیادی طور پر سماجی مراتب کا آئینہ دار تھا۔ ایسے معاشرے میں جن بزرگوں نے اپنے گھر کی لڑکیوں کو انگریزی پڑھانے یا اسکول بھیجنے کی ہمت کی آج ہم ان کی اولوالعزمی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اب آپ قصبہ نہٹور ضلع بجنور یوپی کی ایک جھلک دیکھئے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ گیارہویں، بارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک شمالی ہند میں جتنی سلطنتیں قائم ہوئیں اور خانہ جنگی اور بیرونی حملوں سے ان سلاطین کے ادوار بائیسکوپ کے تماشہ کے بدلتے ہوئے مناظر کی طرح تبدیل ہوتے رہے۔ اس ساری ہنگامہ آرائی میں قصبات نسبتاً محفوظ تھے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے قصبات کی پر امن اجتماعی زندگی سازگار رہی۔

طرز معاشرت کی نفاستیں، محاورے، شعر و شاعری یعنی تہذیب کی قندیل کی رنگا رنگ روشنیاں برابر فروزاں رہیں۔ اس خوشگوار تصویر کا تاریک رخ یہ ہے کہ ترقی کی رفتار اٹھارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے بہت سست پڑ گئی۔ دراصل ایک عظیم الشان سلطنت کے خاتمے نے مسلمانوں کو حیرت زدہ اور سراسیمہ اور نئے زمانے کی ہر بات سے برگشتہ کر دیا تھا۔ کل تک جو

افرادنشان اور ڈنکے کے ساتھ نکلتے تھے آج انھیں انگریز حاکم کے سامنے جوتے اتار کر جانے کا حکم تھا۔ ہم اس لرزہ خیز انقلاب کی دہشت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے نبشور تاریخی اعتبار سے نہایت قدیم علاقہ ہے۔ کالی داس کے شکنتلا ناٹک کا جائے وقوع ہے۔

کالی داس کے زمانے کا آج تک صحیح تعین نہیں کیا جاسکا۔ اگر اس کو چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح سمجھا جائے تو یہ یونان سے لے کر بھارت ورش تک اعلیٰ تہذیب کا ایک جگمگاتا ہوا چندن ہار تھا۔ یونان کی سنگ تراشی، ایران کی قلم کاری، ہندوستان کا رقص و موسیقی، ڈراما اور ادبیات۔ یہ تمام اپنی اپنی تہذیبوں کی اندرونی روح کے آئینہ دار تھے۔ لیکن عموماً ہوا یہ کہ تہذیب اپنے ذرائع پیداوار کی مناسبت سے ترقی کے جس زینے پر پہنچی اس نے کسی ایک خصوصی فن میں عروج حاصل کیا۔ برطانیہ میں شاعری اور اداکاری، جرمنی میں موسیقی اور فلسفہ دانی، فرانس میں آداب و تکلفات، اٹلی میں سنگ تراشی، روس میں داستان طرازی وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان میں، جسے بعد میں اتنا پسماندہ ملک سمجھا گیا، تمام فنون لطیفہ بہ یک وقت موجود تھے مگر ہمارے یہاں وہ شئے ناپید رہی جسے اتحاد کہا جاتا ہے۔ میں پہلے بھی کہیں ذکر کر چکی ہوں کہ ہماری والدہ کی نانی اشرف جہاں بیگم کہا کرتیں تھیں کہ بیٹا ہندستان وہ واحد ملک ہے جہاں ایک ایسا پھل پیدا ہوتا ہے جس کا نام ہی پھوٹ ہے۔

چنانچہ ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ نفاق ہماری قومی خصوصیت ہے۔ اب تو لفظ قوم ہی متنازع فی اور تشریح طلب ہو چکا ہے۔ کون سی قوم؟ ہندو، مسلم پاکستان کی پانچ قومیتیں اور بنگلہ دیش اور وغیرہ وغیرہ۔ جن اقوام مشرق کو دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی تسلط سے چھٹکارا ملا وہ آپس میں ہی جم کر لڑیں اور آج تک جا بجا سیاسی، لسانی اور تہذیبی گھمسان کے رن پڑ رہے ہیں اور خواص و عوام اس مسلسل مارا ماری، افراتفری اور بدنظمی کے عادی ہو گئے ہیں۔ صبح کے اخباروں میں جا بجا مختلف النوع مارا ماری کی خبریں شائع ہوتی ہیں اور ان کو اطمینان سے پڑھ لینے کے بعد سب اپنے اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں یا اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح کسی مغربی ملک میں مستقلاً سکونت اختیار کرنے کا موقع مل جائے یا اپنی اولاد کو وہاں بھیج دیں۔

اس موجودہ خانہ بدوشی کی صورتحال میں راقم الحروف نے چند دلدوز مناظر دیکھے ہیں۔ سب سے پہلے وہ زمانہ جس میں برصغیر کے نوجوان مستقبل کے متعلق نہایت سہانے خواب لے کر برطانیہ، امریکا اور کینیڈا پہنچے۔ ان میں سے بہت سے نہایت کامیاب رہے اور کافی تعداد میں نوجوانوں کو محض پانچ پاؤنڈ ہفتہ پر برطانیہ میں گزر بسر کرنی پڑی۔ انھوں نے Lions Corner House میں کھانا کھایا جو وہاں کا غریب پرور طعام خانہ تھا۔ لیکن بقول شخصے وہ سستا سماں تھا۔ بہت سوں نے انڈیا یا پاکستان کے سفارت خانوں میں جز وقتی کام بھی کیا اور طعام خانوں میں برتن دھونے کی پارٹ ٹائم ملازمت تو بہت ہی آسان بات تھی۔ اب ہوا یہ کہ برطانیہ کے انگریزوں کو آسٹریلیا وغیرہ میں بہت اچھی ملازمتیں مل گئیں اور وہ انگلستان کے مزدور طبقے سے نکل کر سمندر پار چلے گئے اور ہندوستان اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے پڑھے لکھے نوجوان برطانیہ میں وہ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرنے لگے جنہیں انگریز ترک کر چکا تھا۔ ان نوجوانوں نے محنت کر کے نئے معاشرے میں مالی استحکام حاصل کیا۔

پاکستان اور انڈیا سے آئے ہوئے پنجابی، مسلمان، ہندو اور سکھ اس تگ ودو میں پیش پیش تھے۔ لیکن دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے مہاجرین بھی بہت کامیاب رہے۔

انگلستان میں بھاری ڈیتھ ڈیوٹی نے طبقہ امراء کو بے حد دل برداشتہ اور خستہ حال کیا۔ وہ ٹکٹ لگا کر سیاحوں کو اپنے ذاتی محلات کی سیر کرانے لگے۔ یہ ایک بہت ہی دلدوز نظارہ تھا۔ لیکن انگریز ایک عمل پسند اور حقیقت پرست قوم ہے۔ وہ پدرم سلطان بود کے نشے میں مبتلا نہیں رہا۔ اس نے مختلف کام کرنے شروع کر دیے۔ میں نے بہت پہلے اپنے رپورتاژ لندن لیٹر میں لکھا تھا کہ کیمبرج کے سمر اسکول میں ایک شام چائے کا انتظام ایک متوسط العمر انگریز کے سپرد تھا۔ وہ ایک عام ملازم کی طرح ایک میز کے پیچھے استادہ چائے بنا بنا کر سب کو پیش کر رہا تھا۔ سمر اسکول میں میں واحد ایشیائی خاتون تھی۔ وہ بڑے ہی تپاک اور مسرت کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگا اور اس نے بتایا کہ وہ بمبئی پریذیڈنسی میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے بہت اونچے عہدے کا نام بھی بتلایا جو اب مجھے یاد نہیں۔ یہاں وہ شاید چائے پلانے کا ٹھیکہ لیتا تھا اور ایک عام آدمی کی طرح

کام کر رہا تھا۔ تب میں نے سوچا کہ اللہ اکبر، بمبئی میں اس کی کیا شان و شوکت رہی ہوگی۔ مالا بار ہل پر اس کا کیا عالی شان بنگلہ رہا ہوگا، کتنے ملازم وغیرہ وغیرہ لیکن یہاں وہ ایک گمنام چائے والا ہے اور کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ اس نے اپنے بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔

سب جانتے ہیں کہ 1857 عیسوی کے بعد 1947 عیسوی ہماری جدید تاریخ کا اہم ترین واٹرشیڈ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد آزادیٔ نسواں اس عظیم انقلاب کی ایک واضح خصوصیت رہی ہے۔ لیکن یہ تحریک بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی اور اس کے محرک چند روشن خیال حضرات بھی تھے جن کی ہمت افزائی کے بغیر خواتین خود کچھ نہ کرسکتی تھیں۔ اس زمانے کا تصور کیجیے جب غدر کے بعد ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ اشرافیہ کے گھروں میں کھانا پکانے والی ماما اصیل کہلاتی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ یہ ایک اعلیٰ طبقہ کی خاتون ہے جو اب مصیبت زدہ ہوچکی ہے۔ بہت سی غریب مسلمان لڑکیاں مشنریوں کے ہتھے چڑھ گئیں۔ چنانچہ مسلمان جو لڑکوں کی تعلیم ہی سے بدظن تھے، تعلیم نسواں کے متعلق سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ یہاں ہمیں شرق اوسط کے ممالک ایران اور مصر اور ترکی کے اس وقت کے حالات کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ہندوستان تو پوری طرح غلام بن چکا تھا۔ ایران، مصر، ترکی آزاد تو تھے گو یورپین سامراج کا تہذیبی اور سیاسی اثر ان پر مسلط تھا۔ ان گورے ساحروں اور ساحراؤں نے اہل مشرق کو پوری طرح مسحور کرلیا تھا۔ مصر، ایران اور ترکی فرانس کے جادو کے مغلوب تھے۔ ان کے بالائی طبقے نے یورپین تہذیب اختیار کرلی تھی۔ فرانسیسی زبان سے آشنائی ان کے لیے سرخاب کے پر کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک واقعہ یاد آیا۔ تہران کی ایک گارڈن پارٹی میں شاہ محمد رضا پہلوی اپنے ایک یورپین دوست کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ مجھ سے ایک درباری نے چپکے سے کہا "اعلیٰ حضرت فرنچ میں گفتگو کر رہے ہیں" روم، پیرس، برلن، لندن اور ماسکو مہذب دنیا کے اہم ترین مراکز تھے۔ امریکا ابھی بہت دور تھا۔ لہٰذا وہ ایک اور طلسماتی دنیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس زمانے میں ایشیا اور افریقہ کی گویا غیر مہذب آبادیوں کو تمیز سکھانے اور یسوع مسیح کا پیغام دینے کے لیے مشنری عورتوں نے اپنی اپنی پیٹیاں کسیں یعنی کمربستہ ہوئیں اور انجیل مقدس ہاتھ میں لے کر دخانی

جہازوں پر بیٹھیں اور کلکتہ، بمبئی، مدراس اور کولمبو کا رخ کیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہاں ایک بڑا گروپ فوٹو دیکھا تھا جو 1868 عیسوی میں کھینچا گیا تھا۔ اس میں سفید سایوں میں ملبوس نہایت سنجیدہ شکلوں والی گوری عورتیں ایک قطار میں بیٹھی تھیں۔ کچھ پیچھے استادہ، چند سامنے فرش پر کہنیاں ٹیکے نیم دراز (گروپ فوٹو کھنچوانے کا یہ انداز ہمارے بچپن تک رائج رہا)۔ اس گروپ فوٹو کے نیچے لکھا تھا India calls them۔ یہ مشنری خواتین دور دراز امریکہ کے چھوٹے بڑے شہروں سے نکل کر ایک اجنبی پراسرار ملک کے گویا نیم وحشی لوگوں کو تہذیب سکھانے اور یسوع کا پیغام دینے کے لیے آ پہنچی تھیں۔

مس ازابیلا تھوبرن ان ہی خدا پرست بیبیوں میں شامل تھیں جو ہاتھ میں بائبل لیے غالباً 1865 عیسوی میں لکھنؤ تشریف لے آئی تھیں۔ غدر کے المناک سانحہ کو فرو ہوئے محض آٹھ سال ہوئے تھے۔ اس وقت لکھنؤ کی کیا حالت رہی ہوگی، سوچ کر دکھ ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ کلکتے میں مقید اپنی مثنوی لکھ رہے ہیں۔ لکھنؤ میں سوئٹزرلینڈ سے آئے ہوئے مہم جو جنرل مارٹین نے یورپین لڑکوں کے لیے اسکول بھی قائم کر لیا تھا جو لا مارٹینیئر کالج اور گرلز اسکول کے نام سے آج تک جاری ہے۔ چنانچہ میں پھر یہی سوال کرتی ہوں کہ ہمارے شاہان دہلی اور نوابین اودھ نے یورپین جرنلوں سے اپنے فوجیوں کی تربیت تو کروائی، لکھنؤ میں موجود دانش مند اور اہل انگریزوں سے یہ کیوں نہ کہا کہ وہ ہندستانی طلبہ کو بھی مغربی علوم پڑھا دیں۔ چند ہونہار نوجوانوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج کیوں نہ بھیجا جبکہ اسی زمانے میں ایران، مصر اور ترکی کے نوجوان طالب علم یورپ پہنچ چکے تھے۔ لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اس دور میں ایران و مصر کی حرم سراؤں میں یورپین اُستانیاں شہزادیوں وغیرہ کو فرنچ سکھانے میں مصروف تھیں۔

ہندستان میں اواخر اُنیسویں صدی کا زمانہ مجھے بہت ہی طلسماتی معلوم ہوتا ہے۔ ایک عظیم الشان ورلڈ کلچر ہسپانیہ سے لے کر جزائر شرق الہند اور شمالی روس سے لے کر جنوبی ہند اور افریقہ تک پھیلا ہوا تھا اور جس کی علمی، ادبی اور رابطہ کی زبانیں عربی، فارسی اور ترکی تھیں۔ یہ تینوں زبانیں اُنیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے پچھڑ گئیں۔ اُن کے سائنس اور ادب اور فنون لطیفہ

کے کارنامے داستانِ پارینہ میں شامل ہو گئے اور اُن کے خالق پسماندہ نیٹو اور بلیک مین کہلانے لگے جن پر حکومت کرنے اور تہذیب سکھانے کا فریضہ خداوندِ خدا نے گورے عیسائیوں کو سونپا تھا۔

اِس زمانے میں مغربی خواتین آزادی کا بگل بجانے لگی تھیں اور چونکہ ہر ملک، قوم اور نسل کے طبقۂ اناث میں مذہب کا جوش زیادہ ہوتا ہے جس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گھر آنگن، خاندان، شوہر اور اولاد کے تحفظ کے لیے ایک ان دیکھی الوہی طاقت کا سہارا چاہتی ہیں۔ چنانچہ آپ آج کے زمانے میں بھی دیکھیے کہ مرد عام طور پر اپنے اپنے مذہب سے بے نیاز ہو کر زندگی کی تگ و دو میں منہمک ہو چکے ہیں۔ اُن کے گھروں میں خواتین نے اپنے اپنے دین دھرم یا اُس سے وابستہ کلچر کی پاسداری باقی رکھی ہے۔ بہت سے توہمات انھی کی وجہ سے اب تک موجود ہیں گو انھیں اب کلچر پکارا جاتا ہے۔

مجھے اب تک یاد ہے جب میں پہلی بار روس گئی۔ سوویت قونصل خانہ وارڈن روڈ پر میرے اپارٹمنٹ کے نزدیک ہی واقع تھا۔ میں پروگرام کے مطابق اُن کے یہاں پہنچی تو دو سینئر ڈپلومیٹس خواتین جو میرے ہمراہ ماسکو جا رہی تھیں، میرے انتظار میں بیٹھی قہوا نوش کرنے میں مصروف تھیں۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ ایئر پورٹ جانے کے لیے اُٹھے۔ دو منٹ کھڑے رہنے کے بعد وہ خواتین پھر صوفے پر بیٹھ گئیں اور دو تین منٹ خاموش رہنے کے بعد پھر اُٹھیں اور خود ہی ہنس کر بتایا کہ یہ ہمارے یہاں دور دراز کے سفر پر جانے سے پہلے کا ٹوٹکا ہے۔ ہم روانگی سے پہلے کھڑے ہونے کے بعد چند منٹ کے لیے پھر بیٹھ جاتے ہیں تا کہ بلاؤں کو دھوکا دے سکیں۔ ''بلاؤں کو دھوکا'' میں نے تعجب سے دہرایا۔ اُنہوں نے جواب دیا ''اگر کوئی بلا یہاں موجود ہے تو وہ سمجھے کہ ہم کہیں نہیں جا رہے''، میں نے سوچا کہ ہمارے یہاں نیک و بد کی شگون دیکھنے کو اب جہالت سمجھا جاتا ہے لیکن یہ روسی کیمونسٹ خواتین اب بھی بڑے اطمینان سے ان رسوم کی پابند ہیں۔

اِسی طرح انگلستان میں گھروں کی دیوار پر ایک گھوڑے کی نال بطور نیک شگون اکثر آویزاں نظر آئے گی۔ 31 کا عدد منحوس سمجھا جاتا ہے اور اکثر مکانوں پر 21 کے بعد 21-بی لکھا

جاتا ہے۔ کیونکہ مسیحی روایت ہے کہ مصلوب کیے جانے سے پہلے جب حضرت عیسیٰ کھانا تناول کرنے کے لیے بیٹھے تو میز پر 31 افراد موجود تھے۔ بر سبیلِ تذکرہ عیسائیت ایک مغربی یا یوروپین مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں اہلِ مشرق میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ لہٰذا ایک نئی نسل کے اطالوی فلم ڈائریکٹر نے حضرت عیسیٰ کے متعلق جو فلم بنائی ہے اُس میں بالکل اُسی زمانے کی فلسطین، یہودی، عرب طرزِ زندگی پیش کی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ یوروپین میز کرسی پر بیٹھ کر طعام نوش کرنے کے بجائے زمین پر بچھے دسترخوان کے کنارے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔

بچوں کے ابتدائی نصاب کی کتاب کنگ ریڈر کہلاتی تھی اور اُس کے شروع میں دو فل پیج فوٹوگراف جارج پنجم اور ملکہ میری کے ہوتے تھے۔ بادشاہ سلامت فرنچ کٹ داڑھی والے اور ملکہ میری ہیرے جواہرات کے گلوبند اور سر پر چھوٹا سا تاج سجائے اور چہرے پہ خفیف شاہانہ تبسم لیے۔ بے شک وہ اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تاج دار تھے۔

اب سنیئے کہ زمانہ کس طرح پلٹتا ہے۔ ملکہ میری جو کوئن مدر میری کہلاتی تھیں وہ دنیا سے رُخصت ہوئیں تو اُن کے جنازے کا آنکھوں دیکھا حال یعنی اُردو پروگرام کے لیے رواں تبصرہ کرنے کی غرض سے صدیق احمد صدیقی (جنہیں ہم سب چچا کہتے تھے) اور اُن کے ساتھ راقم الحروف ویسٹ منسٹر ایبے گئے۔ چچا صدیق مائیکروفون لے کر اوپر ایک برجی میں جا بیٹھے اور میں عین اُس جگہ پہنچی جہاں اُن سورگ واشی خاتون کا جنازہ الطار کے برابر میں رکھا ہوا تھا۔ اُس تاریخی ہال میں ساری دنیا کے سفیر اور دوسرے بے انتہا اہم لوگوں کے علاوہ سب سے اگلی قطاروں میں موجود بادشاہ جارج ششم اور ان کی بیوی ملکہ الزبتھ اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کچھ دیر پہلے تک موجود تھے۔ میں اطمینان سے الطار (altar) کے نیچے پہنچ کر جنازے کے پاس گئی جہاں وہ ابدی نیند سو رہی تھیں۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ ۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

ایک زمانہ تھا جب کوئی ہما شما اور بالخصوص کالا نیٹو اُن کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ رابعہ،

مہاراجے، نظام حیدرآباد، بیگمات اور مہرانیاں اُن کے حضور میں شرف باریابی حاصل کرنا فخر سمجھتی تھیں اور کہاں میں ایک عام نیٹو ہاتھ میں قلم اور کاغذ لیے بطور رپورٹر یہاں موجود یہ نوٹس کرنے میں مصروف تھی کہ موصوفہ کے چہرے پر پورا میک اپ کیا گیا تھا اور وہ اپنے گرد وپیش اور دنیا سے قطعی بے خبر ہو چکی تھیں یا کیا پتا بھئی اُن کی روح اسے کے کسی دریچے میں بیٹھی نیچے جھانک کر سارا منظر دیکھ رہی ہو۔

دو تین منٹ وہاں ٹھہر کر میں آگے چلی گئی اور پھر ایک تنگ وتاریک پُر اسرار سے زینے پر جاکر اُس دریچے میں پہنچی جہاں چچا صدیق اپنے رواں تبصرے میں مصروف تھے اور مجھے اب تک یاد ہے اُن کے آخری الفاظ تھے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

چچا ایک ماہر فن ریڈیائی مبصر تھے۔ اُنہوں نے ایک باموقع شعر پڑھ کر اپنی تقریر ختم کی۔ لیکن میں نے سوچا اور بعد میں اُن سے کہا کہ ان خاتون نے کون سے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ قسمت نے اُن کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی ملکہ بنا دیا تھا۔ اُس میں ان کا اپنا کیا کمال تھا۔ اب زمانے ہی نے یوں پلٹا کھایا کہ ہم اور آپ اُن کے متعلق رواں تبصرے میں مصروف ہیں۔ وہ محض ایک ریڈیائی موضوع بن چکی ہیں۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

تو سارا معاملہ زندگی پر موقوف ہے جب تک بندہ زندہ ہے اہم ہے، مرا تو گیا۔

اب قابلِ غور نقطہ یہ ہے ناظرین! کہ چچا صدیق ماہر فنِ گفتگو، انتہائی ذہین اور دلچسپ باتیں کرنے اور فرنگی محل لکھنؤ کے ایک روشن چراغ۔ آج اُن کو بھی دنیا سے گئے زمانہ گزر گیا اور اب وہ کتنے کم لوگوں کو یاد ہوں گے۔ جب وہ بی بی سی کینٹین میں بیٹھ کر محفل آرائی کرتے تھے تو اگر اُن کی گفتگو ریکارڈ کر لی جاتی تو آج لوگوں کو تعجب ہوتا کہ کیسی کیسی نادر الوجود ہستیاں ہمارے درمیان سے اُٹھ گئیں جو بہر حال قانونِ قدرت ہے۔ کوئی نوے سو برس تک نہیں جیتا اور زیادہ تر

جانے والے بھی بہت جلد فراموش کر دیے جاتے ہیں کیونکہ یہ بھی ایک اور قانونِ فطرت ہے۔

چچا صدیق کی بعض باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ مثلاً میں مائیکروفون کے سامنے کھڑی اپنے مکالمے کی ریہرسل کر رہی ہوں۔ چچا دیوار کے سہارے فرش پر بیٹھے ہیں۔ چند منٹ بعد فرماتے ہیں "بیٹا اُس میں تھوڑا سا ڈرِیاما اور ڈال دیجئے۔"

چچا ایک روز شام کے وقت اپنے دفتر سے گھر جا رہے تھے جب بس اپنے اڈے پر پہنچی جہاں سے اُن کا مکان بہت قریب تھا۔ ساری بس خالی ہو گئی۔ چچا دوسری منزل پر اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ کنڈیکٹر نے قریب آ کر دیکھا تو وہ دنیا ہی سے جا چکے تھے۔ دنیا سے کنارہ کرنے کا ایسا پرسکون راستہ انھیں ملا۔ اُن کے انتقال کے بعد میں نے اُن کے متعلق ایک مضمون شاید افکار کراچی میں لکھا تھا۔ اُس وقت تقی احمد سید بی بی سی والے اور فیروز جبیں لندن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز والی ـــ دونوں ابھی حیات تھے اور ہم لوگ جب ملتے تھے تو چچا کو یاد کرتے تھے۔ اب یہ دونوں بھی دنیا سے جا چکے ہیں۔ بھئی آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اچھی بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آیا تو ہم آپ کس گنتی میں ہیں۔

نفیسہ آپا کی ماموں زاد حسنہ لقمان حیدر بھی شعر کہتی تھیں۔ حسنہ کے والد سید نثار حیدر زیدی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ جگر مراد آبادی اور ساغر نظامی نے اپنا بیشتر کلام انھی کے یہاں اپنے دورانِ قیام قلمبند کیا۔ ساغر نظامی کی ایک نظم "زہرا کے گلدستہ پیش کرنے" پر اُسی زمانے کی یادگار ہے۔ جب یہ خاتون چھ سات سالہ بچی تھیں۔

یہاں میں یہ ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ 1857 عیسوی کے بعد جس نئے معاشرے نے جنم لیا اس میں برطانوی کولونیل کلچر بھی شامل ہو چکا تھا۔ غدر سے تباہ شدہ خاندان کہاں گئے ہمیں معلوم نہیں۔ کیا ہم جانتے ہیں کہ زوالِ غرناطہ اور سقوطِ اندلس کے بعد ہسپانوی مسلمانوں پر کیا بیتی۔ آج وہ تاریخ کی ایک گمشدہ کتاب ہیں۔ عیسائیوں کے عروج کے بعد سے لے کر آج تک

ہسپانوی کلچر پر عرب تہذیب کی چھاپ موجود ہے۔ واللہ "اولے" بن گیا۔ ہسپانوی عوام اور تماشہ بین اولے اولے کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ ایک پوری آٹھ سو سالہ تہذیب تھی جس نے مسیحی یورپ پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ آج اُس کا مذہب ہسپانیہ سے غائب ہو چکا۔ ہمارے میر جی نے بالکل ایک دوسرے سیاق و سباق میں فرمایا تھا۔ "قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا۔ ارض، ہسپانیہ میں صلیب پہنی، چرچ میں بیٹھے، کب کا ترک۔۔۔"

ایک پروفیسر نے بیرونِ ملک کے کسی ادبی مذاکرے میں راقم الحروف کے متعلق فرمایا تھا کہ جب یہ بی بی اسپین کا ذکر کرتی ہے تو آنسو بہانے لگتی ہے۔

ہسپانوی عورتیں سر پر جو باریک دوپٹہ اوڑھتی ہیں وہ آج تک مسلمان عورتوں کے نقاب سے مشابہ ہے۔ مطلب یہ کہ تبدیلی مذہب کے باوجود پرانے کلچر کی پرچھائیں باقی رہتی ہے اور اس کی مثال پیش کرنے کے لیے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ برصغیر ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے تمدن آج تک ویدک زمانوں تک کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ عمرانیات اور سماجی تاریخ کا ہے۔ ہمارے سیاست دان اِن گہرے معاملات سے زیادہ تر نابلد اور بے نیاز رہے ہیں۔ ورنہ وہ سب نہ ہوتا جو اس برصغیر کی مسلسل مارا ماری اور تقریر بازی کے ذریعے ہوا۔ لیکن مسئلہ عموماً یہ رہا کہ دانشور میدانِ سیاست میں نہیں اترے سوائے جواہر لال نہرو اور مزید چند افراد کے۔

نفیسہ اطاعت حسین نے جس معاشرے میں جنم لیا وہ ہی زمانہ تھا جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا تھا قمار خانہ

وہ یوپی کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں جسے ہم بیسویں صدی کے نصفِ اول کا

نمائندہ خاندان کہہ سکتے ہیں۔ بیگم نفیسہ اطاعت حسین راقم الحروف کی پھوپھی زاد بہن تھیں یعنی اُن کی والدہ سید سجاد حیدر کی فرسٹ کزن تھیں۔ چونکہ میں ہرتذکرے کا تاریخی اور عمرانی پس منظر بتانا ضروری سمجھتی ہوں تاکہ تصویر کا فریم ورک کم از کم میری استعداد کے مطابق اطمینان بخش ہو جائے۔ میں پہلے کہیں لکھ چکی ہوں کہ بنگال، مدراس اور مہاراشٹرا کے بعد سب سے آخر میں یو پی جاگا۔ لیکن ہمارا مسلمان بھائی کروٹ بدل کے پھر خراٹے لینے لگا۔ سرسید احمد خاں نے جھنجھوڑ کر اُسے جگایا تو اُس کے بعد کے معاملات سے ہم سب واقف ہی ہیں۔ لیکن تعلیم نسواں اُس کے ایجنڈے میں شامل نہیں تھی۔ تو آج آپ سوچئے کہ وہ کتنے متوالے صاحبان تھے جنہوں نے فرنگی کی اس نئی چھاؤنی میں زنانہ تعلیم کا بگل بجایا۔ مسلمان اس نئے دور سے اس قدر خائف اور دل برداشتہ کیوں تھے۔ ہم اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے بہ زور شمشیر اپنا دین پھیلایا۔ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے عوام ایک نئی آواز کی طرف لپکے۔ ہم نے خود اپنے دور میں دیکھا ہے کہ مشنری ہریجنوں کو کس طرح اپنی طرف راغب کرتے تھے۔ اب میں آپ کو خود اپنے چشم دید واقعات بتلاؤں۔ دہرہ دون میں ہماری عیسائی جمعدارنی بے حد صاف ستھری رہتی تھی۔ صبح کو گڈ مارننگ میڈم اور رات کو گڈ نائٹ میڈم کہہ کر ہماری والدہ سے باضابطہ گھر جانے کی اجازت طلب کرتی تھی۔ کرسمس کے روز چرچ سے واپسی پر گلدستہ اور دو انڈے بطور تحفہ پیش کرتی تھی۔ یہ گویا اُس انڈو برٹش تہذیب کا ایک منظر تھا جو ہمارے یہاں 1857 عیسوی کے بعد رائج ہوئی۔

جس طرح بائیسکوپ کی مشین میں ایک منظر کے بعد دوسرا منظر پھٹ سے سامنے آجاتا تھا۔ یہ مشین ہمارے چچا جان کے یہاں الموڑے میں اُن کے ایک دوست مسٹر سکینہ لے کر آئے تھے۔ پہاڑی کے نیچے ایک سینما گھر بھی تھا جس میں مس سلوچنا اور ماسٹر نثار کے فلم چلتے تھے جو ہم بچوں کو نہیں دکھلائے جاتے تھے۔ ہم لوگ بھی اُسی انڈو برٹش تہذیب کے پروردہ تھے۔ بیک گراؤنڈ زمینداری کا تھا اور پیش نظر سرکاری ملازمت۔

اِس نئی تہذیب میں بنگالی بابو تو بہت آگے نکل چکا تھا۔ یو پی کا مسلمان اب اکثر بادلِ

نا خواستہ اس steeple chase میں شامل ہوا تھا۔ اس کھیل کے نام پر مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ میرے برادر محترم سید مصطفیٰ حیدر کے پاس اس برطانوی کھیل کا ایک ڈبا موجود تھا جس میں چھوٹے چھوٹے شہسوار ریس کرتے تھے۔ آپ یہ غور فرمائیے کہ اُس خوشحال طبقے کے بچے انگریزی کھلونوں سے کھیل رہے ہیں اور Father Tuck London کی چھپی ہوئی نہایت شاندار باتصویر کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ انگریزی کھیل کھلونے اور انگریزی ملبوسات ہیں۔ جو لڑکیاں کانوینٹ اسکول میں پڑھتی ہیں، وہ ایک بہت ہی اعلیٰ وارفع منتخب روزگار طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ منظر مڈل ایسٹ میں بھی موجود ہے۔ لیکن وہاں انگریزی کے بجائے فرنچ کی عمل داری ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور برٹش انڈیا اور سیلون میں جابجا کیتھولک کانوینٹ اور مشن اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں میں نئے فیشن ایبل طبقات کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی۔۔۔ ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ۔۔۔ یہ ڈراما دکھلائے گا کیا سین۔۔۔ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

لیجئے صاحب! بائیسکوپ کے پہلے منظر میں دلی کے ایک جادوگر نے اپنی چھڑی گھما کر لڑکوں کو انگریزی پڑھادی۔ اب میں اُس منظر کا تصور کرنا چاہتی ہوں جہاں کمپنی اسٹائل کی ایک کوٹھی کے سامنے گول چبوترے پر شام کے وقت کرسیاں بچھی ہیں۔ ایک آرام کرسی پر نواب محسن الملک تشریف فرما ہیں۔ کچھ نوجوان طالب علم بھی حاضرِ خدمت ہیں۔ ایک نوجوان لڑکیوں کا مدرسہ قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے تو نواب صاحب طیش میں آکر اپنی ترکی ٹوپی چبوترے پر پھینک دیتے ہیں۔ اب اس منظر میں چند رموز و نکات پنہاں ہیں۔ برطانوی کولونیل سماج کی نئی اپر کلاس کے نمائندے نواب صاحب جو برطانوی امپیریل کولونیل سماج کی نئی عکاس ایک رہائشی عمارت میں رہتے ہیں جو مکان کے بجائے کوٹھی کہلاتی ہے اور نئے سماجی رتبے کی نمائندہ ہے۔ ایسا مضبوط و مربوط اور خوشحال اور ترقی پذیر یا ترقی یافتہ معاشرہ ابھی ہمارے ایشیا اور افریقہ میں پیدا نہیں ہوا۔

فرنچ، ڈچ اور پرتگالی کولونیل نظام پسماندہ ہیں۔ کیونکہ برطانیہ اٹھارہویں صدی کے لبرلزم یعنی روشن خیال کا علم بردار ہے۔ وہ اپنے زیرنگیں ملک ہندستان میں، جس میں برما اور لنکا

بھی شامل ہیں، جابجا یونیورسٹیاں قائم کر چکا ہے۔ ہندستان کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے نئے اعلیٰ تعلیم یافتہ معاشرے کے نوجوان یورپ اور برطانیہ کے معاصرین سے ٹکر لے چکے ہیں۔

ڈچ اور فرانسیسی نوآبادیاں جس ناگفتہ بہ پسماندگی کا شکار رہیں ان کے تذکرے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ غلام ہندوستان کے انگریزی زبان کے اہلِ قلم مشہور مصنف اور شاعر بن چکے تھے۔ شمالی افریقہ کی ایک فرنچ کالونی میں پہلا ناول ہی عربی زبان میں آج سے محض چند سال قبل لکھا گیا۔ ببیں تفاوتِ راہ — انقلاب فرانس کو جنم دینے والے فرانسیسیوں کی زیرِ نگیں افریقی اور ایشیائی نوآبادیوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قارئین شاید مجھے انگریز پرستی کا ملزم ٹھہرائیں لیکن قومی آزادی کے جوش کو ٹھنڈا پڑے اب بہت طویل مدت گزر چکی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم تاریخ کو اُس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

تاریخ، حالات، واقعات اور انسانوں کی نفسیات کی پیچیدگیوں کے تانے بانے کی اُلجھی ہوئی گتھی کا دوسرا نام ہے۔ اُسے آپ دو اور دو چار کے ترازو میں نہیں تول سکتے۔ گپتا لوگ کمزور نہ پڑتے تو قبائل سر نہ اُٹھاتے۔ اُن کی خانہ جنگیاں نہ ہوتیں تو مسلمانوں کے لیے راستے نہ کھلتے۔ ہندستان میں ایک ہزار سال حکومت کرنے کے بعد بھی اٹھارھویں اُنیسویں صدی میں جب دنیا عہدِ حاضر میں داخل ہو چکی تھی۔ ہمارے بادشاہوں نے مغرب سے کچھ نہ سیکھا۔ اپنے شہزادے آکسفورڈ، کیمبرج اور سوربون پڑھنے کے لیے نہیں بھیجے۔ امریکن عورتیں اکثر تن تنہا ہاتھ میں بائبل لیے تبلیغ و تعلیم کے پرچار کی غرض سے ہندستان پہنچیں۔ اُنہوں نے اکثر پُرخطر حالات کا مقابلہ کیا۔ اب یہاں ہمیں چند تاریخی حقائق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ Cause and Effect کا قانون ہر جگہ اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ بعض بہت چھوٹے چھوٹے واقعات حالات کو اُلٹ پلٹ دیتے ہیں۔

اگر دمشق یا شاید بغداد کے ایک عیاش خلیفۂ وقت کے دور میں شہر غیر ملکی اور مقامی طوائفوں سے بھر نہ گیا ہوتا تو مسلم شرفاء اپنی عورتوں کو یہ حکم نہ دیتے کہ وہ نقاب پہن کر باہر نکلیں یا زیادہ تر اپنے گھروں ہی میں رہیں تاکہ اُن کو زنانِ بازاری نہ سمجھا جائے۔ اب دیکھیے اس کے

نتائج کتنے دوررس ثابت ہوئے کہ سارے عالم اسلام کے خوشحال طبقے میں پردہ رائج ہو گیا اور وہ طبقاتی برتری اور تموّل کی علامت سمجھا گیا۔ غریب محنت کش عورتیں نقاب پہن کر کھیتوں میں کام کر سکتی ہیں اور نہ بازار میں سبزی ترکاری بیچ سکتی ہیں۔ ہمارے علماء نے کبھی اس نقطے پر دھیان نہیں دیا۔ کیا غریب مسلمان عورتیں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں؟ حالانکہ وہ ہی بیچاریاں روزے نماز کی سب سے زیادہ پابند ہوتی ہیں۔

نفیسہ اطاعت حسین کے کلام کا مجموعہ میرا پیغام محبت ہے تین ابواب پر مشتمل ہے۔ جس طرح جاپان میں پھول سجانے کا فن صنفِ نازک کی لطیف ترین حسیات کی نمائندگی کرتا ہے، اسی طرح ہماری خواتین نے اردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے۔ لیکن ایوانِ ادب میں انھیں بھی عرصۂ دراز تک چلمنوں کے پیچھے رہنا پڑا۔ یہ ہمارے سماجی حالات کا تقاضہ تھا۔ مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ کے مشاعروں میں ایک چھوٹا بچہ مائیکروفون لیے پردے کے پیچھے آتا تھا اور شاعرات اپنے کلام سے سامعین کو نوازتی تھیں۔ رفتہ رفتہ مشاعرہ کم از کم ہمارے یہاں ایک شو بزنس میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اب میں اپنے یہاں کی ادبی محفلوں کا کچھ تذکرہ کرنا چاہتی ہوں۔

عام طور پر شادی بیاہ کے مواقع پر باہر مردان خانہ میں پروفیشنل گلوکار اور محل سرا میں مراثنیں گاتی تھیں لیکن ہمارے یہاں محفل رقص و سرود کے بجائے مشاعرے منعقد کیے گئے اور اس نئی روایت کے لیے ہمارے چچا سید نثار حیدر زیدی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جنھوں نے جن اضلاع میں بطور ایک سرکاری افسر تعینات رہے وہاں انھوں نے دھوم کے آل انڈیا مشاعرے منعقد کروائے۔ وہ خود بھی ایک قادرالکلام شاعر تھے۔ نفیسہ اطاعت حسین بھی اسی ماحول میں پروان چڑھیں۔ لیکن چونکہ یہ خاندان روایتی فیوڈل کلچر کے ورثہ کے علاوہ مغربی کولونیل طرز معاشرت اختیار کر چکا تھا۔ اس خاندان کی لڑکیوں نے کانوینٹ اسکول میں بھی پڑھا۔ چنانچہ نفیسہ آپا کے والد سید صغیر حسین نے اُن کو کانوینٹ آف جیز زاینڈ میری دہرہ دون میں تعلیم دلوائی۔ اُس زمانے میں مسلمان لڑکیاں شاذ و نادر ہی انگلش اسکولوں میں پڑھنے کے لیے بھیجی جاتی تھیں

لیکن نفیسہ آپا کے کزن سجاد حیدر یلدرم تعلیم نسواں اور آزادیٔ نسواں کا بگل کافی پہلے بجا چکے تھے۔ چنانچہ اس روایت پرست خاندان کی لڑکیوں نے بھی اپنے ان روشن خیال بزرگوں کی ہمت افزائی کی بنا پر انگریزی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔

سید نثار حیدر کی بیٹی حسن زہرا بیگم ضلع بجنور کی پہلی گریجویٹ خاتون تھیں۔ اُس وقت اس ضلع کی کسی ہندو یا عیسائی لڑکی نے بھی بی اے پاس نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں جاپان کے آرائشِ گلستاں کے بجائے آرائشِ لفظیات ایک تہذیبی فن بنا۔ میں نے عرصہ ہوا جاپان میں دیکھا تھا کہ چائے پینے کی رسم کی طرح پھول سجانے کا آرٹ بھی ایک علم دریاؤ ہے۔ ہمارے یہاں اردو شاعری کی رنگ برنگی قندیل تین چار سو سال سے مسلسل فروزاں رہی ہے۔ پردہ نشین خواتین نے بھی شعر کہے مگر وہ ہماری سماجی پابندیوں کی وجہ سے میرؔ و غالبؔ نہ بن سکیں۔

ہمارے ٹکسالی اردو کے محض دو الفاظ ملاحظہ کیجیے: علامہ اور حرافہ۔ یہ دونوں الفاظ تعلیم یافتہ عورتوں کے لیے بطور تضحیک استعمال کیے جاتے تھے "تو بڑی علامہ ہے۔" "ارے وہ تو نہایت حرافہ ہیں۔" لیجیے ختم ہوئی بات۔ چنانچہ جب مولوی ممتاز علی نے عورتوں کا ہفتہ وار اخبار تہذیبِ نسواں 1898 عیسوی میں لاہور سے جاری کیا آج ہم ان کی مجاہدانہ ہمت اور دلاوری کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اسی اخبار تہذیبِ نسواں میں 1906 عیسوی میں ایک چھوٹی سی نظم تعلیم کے فوائد پر شائع ہوئی۔ نیچے لکھا گیا تھا ن ف از نہٹور کیونکہ اُس وقت تک عام طور پر نام بھی پردے میں رہتا تھا۔ یہ کمسن شاعرہ نثار فاطمہ تھیں۔ جن کی بھانجی نفیسہ خاتون کے متعلق میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں۔ 1906 عیسوی سے لے کر آج 2006 عیسوی تک ایک صدی میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ 1906 عیسوی میں وہ چھوٹی سی نظم لکھنے والی شاعرہ کی آئندہ پیڑھیوں کی لڑکیوں کے لیے انگلستان اور امریکا کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ایک بہت ہی عام اور روزمرہ کی بات ہو چکی ہے۔

نفیسہ آپا نے آج سے تقریباً 80 سال قبل ایک کانوینٹ اسکول میں پڑھا۔ اُس کے ساتھ ہی اپنے خاندان کی روایت کے مطابق شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لی۔ وہ اپنے ماموں نثار

حیدر زیدی کے مانند ایک خوش گو شاعرہ تھیں لیکن اُنہوں نے کبھی مشاعروں میں شرکت نہیں کی، نہ اُن کا کلام جہاں تک مجھے علم ہے مشاعرے کے کسی اسٹیج پر پڑھا گیا۔ اُن کی کزن حسنہ لقمان حیدر اور عذرا حیدر بھی بہت اچھی شاعرات تھیں۔ لیکن اُنہوں نے بھی اپنے آپ کو گمنام رکھا۔

ہمارے یہاں دورِ حاضر میں مشاعرہ شو بزنس میں بھی تبدیل ہو چکا ہے۔ خوش گلو خواتین شاعروں سے نظمیں اور غزلیں لکھوا کر اسٹیج پر پیش کرتی ہیں۔ یہ ایک افسوسناک صورتِ حال ہے۔ بہرکیف نفیسہ آپا اکثر مشاعروں کی موجودہ ہڑبونگ کے زمانے سے علیٰحدہ ایک مختلف تہذیب کی نمائندہ تھیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اُن کا کلام مشاعروں کے اسٹیج سے بھی پڑھوا کر نہیں سنا گیا۔ اُن کے شوہر خان بہادر سید اطاعت حسین سی پی کے مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔ 1947 عیسوی کے بعد وزارتِ امورِ خارجہ پاکستان میں جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے پر معمور ہوئے۔ اُس کے بعد سانفرانسسکو میں پاکستان کے قونصل مقرر کیے گئے۔ اُسی زمانے میں ہندستان کے مسٹر حسین انڈیا کی طرف سے اُسی عہدے پر تعینات۔ اِس شہر کے امریکنوں میں ایک لطیفہ مشہور ہو گیا تھا کہ فلاں بات دیکھ لینا کون سے مسٹر حسین سے کہنی ہے۔ امریکا سے واپس آ کر نفیسہ آپا کراچی میں مقیم رہیں۔ ایک مرتبہ دونوں میاں بیوی اپنے رشتہ داروں سے ملنے ہندستان آئے اور الہ آباد بھی گئے جہاں اُن کے فرسٹ کزن جسٹس جرار حیدر اور زہرا حیدر مقیم تھے۔ میں بھی اُن دنوں بمبئی سے الہ آباد گئی ہوئی تھی۔ ایک روز بھائی اطاعت حسین نے فرمایا کہ وہ مسلم ہاسٹل دیکھنا چاہتے ہیں جس میں رہ کر اُنہوں نے یہاں پڑھا تھا۔ ہم سب لوگ کشتی میں بیٹھ کر دریا میں گئے۔ میں نے سوچا گنگا جانے کتنے ہزار برس سے اسی رفتار کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ ہمالیہ کے کن دور افتادہ گمنام برف زاروں سے نکل کر آئی ہے اور ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے خلیج بنگال میں جا گرتی ہے۔ اُسے کوئی فرق نہیں پڑتا، کوئی جیے کوئی مرے۔ کوئی کہیں چلا جائے۔ انسان ایک سے ایک بادشاہ، سپہ سالار، عالم، فاضل اپنی اپنی زندگیوں کی بہت ہی مختصر مسافتیں طے کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ کتنی قومیں آئیں اور گئیں۔ اسی گنگا پر کتنے راجاؤں اور بادشاہوں کے بجرے تیرے، فرنگیوں کے اسٹیم بوٹ چلے، ملکوں کے نقشے بدلے، کتنے گیت اِس کے لیے بنائے

گئے۔ ایک پرانی فلم کا گیت یاد آیا۔ ''ری گنگا میاری تیرا جل امرت کی دھارا'' یہ فلم ہم نے لکھنؤ میں ہائی اسکول کے زمانے میں دیکھی تھی اور پھر جب ہم ہائی اسکول کا امتحان دینے بنارس آئے، امتحان کے بعد ایک روز دو تین بڑی سی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کے لیے گئے تو میں نے گویا بالکل فلمی situation کے مطابق ''اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو'' الاپنا شروع کیا۔ عزیز بانو وفا اور چند اور لڑکیاں گیت میں شامل ہو گئیں۔ اب وہ سب کہاں ہیں۔ عزیز بانو تو جیون گنگا کے پار ہی اُتر گئیں اور نہ جانے کون کہاں گئیں۔

اب نفیسہ آپا اور بھائی اطاعت حسین مدتوں بعد بطور پاکستانی مہمان اِلٰہ آباد آئے اور بھائی اطاعت نے فرمایا کہ وہ اپنا پرانا ہاسٹل بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر ہم لوگ سب گنگا پر گئے۔ دنیا کے سارے دریا راقم الحروف کے لیے بہت اہم ہیں۔ پھر ہمارے برادرانِ وطن کا کیا کہنا جن کے لیے گنگا شیو جی کی جٹاؤں سے نکلی ہے۔ ہندی میں کہکشاں کو بھی آکاش گنگا کہا جاتا ہے جو ایک نہایت شاعرانہ تصور ہے۔

چنانچہ جب وزارتِ امور خارجہ پاکستان کے جوائنٹ سیکریٹری اُس روز بطور ایک بیرونی مہمان ہمارے ساتھ کشتی پر گنگا کی سیر کے لیے گئے تو وہ یادوں کے مختلف حصوں میں بٹے ہوئے انسان رہے ہوں گے۔ جیسے جب آپ ایک کیک بنایئے تو اُس کی مختلف تہیں تیار کر کے اُسے بیک کیا جاتا ہے۔ پھر اُس کے اوپر چاکلیٹ یا کریم سے گل کاری کر کے اسے سجاتے ہیں۔ جب ہمارے یہاں ٹی پارٹی ہوتی تھی جو ایک خالص برطانوی کولونیل کلچر کی ایک روایت تھی تو خانساماں کے بیک کیے ہوئے کیک پر کاغذ کا پونگا بنا کر کریم یا سیال چاکلیٹ سے گل بوٹے بنانے کا کام امی نے میرے سپرد کر رکھا تھا۔

نفیسہ آپا ایک بہت ہی سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ نہایت پُر امن شخصیت، اندازِ گفتگو میں دھیما پن۔ میں نے اُنہیں کبھی برافروختہ یا اُلجھا ہوا نہیں دیکھا۔ انگلش کانوینٹ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے اپنے آبائی کلچر کو بھی نہایت سلیقے سے برقرار رکھا تھا۔ اُنہوں نے امریکا میں ایک سینئر ڈپلومیٹ کی بیگم کی حیثیت سے بھی زندگی گزاری اور کراچی میں بھی وہ ایک ہر دل عزیز،

نہایت باوقار خاتون کے طور پر جانی گئیں۔ اُن کی شخصیت کے اندر غیر معمولی ٹھہراؤ اور توازن تھا۔ کسی قسم کے غرور یا احساسِ برتری کا ان کے یہاں مکمل فقدان تھا۔ اُن کی اولاد نے بھی اُن کی شخصیت کا پورا پورا اثر قبول کیا تھا۔

لہٰذا ہم لوگ زندگی بھر اپنے اپنے کیک تیار کر کے اپنی یادوں کے گل بوٹوں سے سجاتے رہتے ہیں۔ آبِ رودِ گنگا کی لہروں پر سے لاکھوں کروڑوں کشتیاں گزر گئیں اور جب تک زمین سورج سے نہ ٹکرائے یا جو کچھ بھی ہونا ہے وہ ہو، (ہم آپ کو کیا معلوم بھائی) اُس وقت تک دریا بھی یوں ہی بہتے رہیں گے۔ ہمالیہ پر برف گرتی اور پگھلتی رہے گی۔ آگے کا حال اللہ جانیں مولا جانیں۔ وقت سحر ہے اے روزے دارو اُٹھو، ہوشیار ہو سحری کھالو۔

3 رمضان المبارک 1427 ھجری
(27 ستمبر 2006 عیسوی)

قرۃ العین حیدر

(نفسہ اطاعت حسین کے مجموعہ کلام 'میرا پیغام محبت ہے' کا تعارف ہے، جو 27 ستمبر 2006 میں تحریر کیا گیا۔)

تخیلات

اردو کا بہترین انشائی ادب کے زیرِ عنوان مضامین کا ایک انتخاب کافی عرصہ ہوا مکتبۂ جدید لاہور نے شایع کیا تھا۔ اس میں ایک مضمون ''جہنم سے ایک خط'' از قلم میر افضل علی بھی شامل تھا لیکن کتاب کے مرتبین کو اس غیر معمولی ادیب کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ بہ طورِ تعارف ایک سطر بھی نہیں لکھی گئی تھی اور یہ بات مجھے بہت ہی افسوس ناک معلوم ہوئی کیونکہ اس شخص نے اپنی ساری تابناک زندگی پنجاب ہی میں گزاری اور جنوری 1938 عیسوی میں اُن کا انتقال ہوا۔ جبکہ ان کی عمر چالیس کی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ پنجاب کے پہلے انڈین افسر تھے جنھیں اسسٹنٹ انکم ٹیکس کمشنر مقرر کیا گیا۔ ہندستانی کے بجائے میں نے انڈین اس لیے لکھا کیونکہ پنجاب میں یوپی والوں کو ہندستانی کہا جاتا ہے اور اگر میں لکھتی کہ وہ پہلے ہندستانی افسر تھے تو بہت عجیب لگتا کیونکہ جو لوگ اس صوبے سے تعلق نہیں رکھتے انھیں یہ بات متحیر کرتی ہے۔

بہر حال میر افضل علی کے مورثِ اعلیٰ کا اپنے جدِّ بزرگوار امام رضاؑ کے مشہدِ مقدس کے قلید برداروں میں اسم تھا۔ وہ ہندستان کیسے آئے؟ اس کے متعلق ہمارے اِلّن ممّاں یعنی پروفیسر تہور علی نقوی، استادِ تاریخ، بہاالدین کالج، جوناگڑھ (کاٹھیہ باڑ) اپنے بے حد دلچسپ انداز

میں تذکرہ کرتے تھے۔ اب اُس زمانے کی آسائش، دلجمعی اور اطمینان کا تصور کیجیے۔ رام گنگا کے کنارے محلہ مغل پورہ حصہ اوّل کی ایک صاف ستھری گلی کے سرے پر وسیع چبوترا۔ اُس کے کنارے ایک چھتنار درخت کے نیچے کنواں۔ ڈیوڑھی کے اندر قدیم دومنزلہ مکان۔ حویلی میں نے نہیں لکھا کیونکہ ہندستانی فلموں میں ہر چھوٹے بڑے ہندستانی وضع کے مکان کو حویلی کہا جارہا ہے۔ اس قسم کے مکان کا اپنا طرزِ تعمیر تھا اور اپنا تہذیبی ماحول۔ یہ مکان دو حصوں میں منقسم ہوتے تھے جو مردانہ اور زنانہ مکان کہلاتے تھے۔ یہ طرزِ تعمیر شمالی ہند کے پرانے شہروں میں اب بھی موجود ہے۔ گو رفتہ رفتہ ایسے مکانات معدوم ہوتے جارہے ہیں اور اُن کی جگہ نہایت بدذوقی سیاہ راستہ، رنگ برنگی عمارات نے لے لی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں سے احساسِ تاریخ اور تہذیبی ورثے کی اہمیت کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ انگلستان میں گزشتہ صدیوں کے مکانات کو نہایت اہتمام سے اس طرح محفوظ کیا گیا ہے کہ لوگ اب بھی اُن میں رہتے ہیں اور انھیں کرایہ پر اٹھانے یا فروخت کرنے کے لیے اُن کی تصاویر اخباروں میں مشتہر کی جاتی ہیں۔ میں نے تو اپنے یہاں فتح پور سیکری کے شاہی محل کو دیکھا جس میں کتے لوٹ رہے تھے۔ یہی شاہی محل اگر انگلستان میں ہوتا تو اسے اُسی عہد کے فرنیچر، قالین اور پردوں سے آراستہ کیا جاتا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اب محلہ مغل پورہ اوّل کے ایک مکان کا تصور کیجیے۔ گرمیوں کا موسم۔ دروازوں پر خس کی ٹٹیاں۔ اندر ایک طویل کمرے میں دوطرفہ پلنگ اور وسط میں تختوں کا چوکا یعنی دو تین تخت جوڑ کر اُن پر دری اور چاندنی بچھائی گئی ہے اور گاؤ تکیے لگے ہیں۔ اس کے اوپر آتش دان جو ہندستانی لہجے میں کارنس بھی کہلاتا ہے۔ اُس پر خاندان کے افراد کی تصاویر۔ دونوں طرف بلوریں گل دان۔ اوپر خانۂ کعبہ یا روضۂ امام رضا کی تصویر۔ شہنشاہِ ایران رضا شاہ پہلوی کا فوٹوگراف (اگر خاندان اہلِ سنت کا ہے تو وہاں نظام دکن اور سلطان ترکی یا مصطفیٰ کمال پاشا یعنی کمال اتاترک کے فوٹوگراف بھی ہوں گے۔ یہ اسلامیان ہند بین الاقوامی اسلام سے جذباتی رابطے کی نمائندگی

کرتے ہیں۔ عام طور پر سنّی مسلمان حج کرنے جاتا ہے اور شیعہ زیادہ تر کربلائے معلی۔

رابطہ بہر حال دونوں فرقوں کا بیرونِ ہند سے ہے لیکن دونوں ہندستان کو ہی اپنا وطن اور اپنے باپ دادا کی سرزمین سمجھتے ہیں۔ خواجہ اجمیر کی درگاہ کے علاوہ اَنگنت عظیم درگاہیں سارے ہندستان میں موجود ہیں جہاں ہندو زائرین کی بھی کمی نہیں۔ ایامِ محرم میں اکثر ہندو بھی سبیلیں لگاتے ہیں اور اُن کی عورتیں اپنے بچوں کو تازیوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اجمیر کا میوا اسکول جو ہندستان کا ایک بے حد اہم انگلش پبلک اسکول ہے جس میں والیانِ ریاست اور متمول ترین ہندو خاندانوں کے کمسن لڑکے پڑھتے ہیں، اُن کی مائیں اکثر و بیشتر خواجہ صاحب کی درگاہ پر حاضری دیتی ہیں اور کہتی ہیں ''خواجہ صاحب یہ بچہ میں آپ کے سپرد کرکے جارہی ہوں، میں آپ ہی سے واپس لوں گی۔''

دراصل جذبات کا معاملہ ایک عجیب الواغوچن ہے۔ میری ایک دوست نے بمبئی میں مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خواجہ صاحب کے سپرد کر آئی ہیں۔ اب ان خاتون کو مذہبِ اسلام یا تصوف وغیرہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ وہ خود اور اُن کے شوہر گجراتی جین تھے اور وہ دونوں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور بیوی احمد آباد کے ایک کروڑ پتی کی چھوٹی بہن تھیں لیکن انسان ہمہ وقت اپنے خیالات اور سیاسی رویے کے تجزیے میں مصروف نہیں رہتا ہے۔ وہ بحیثیت ایک انسان کے زندہ ہے جسے پارٹی لائن کے علاوہ اپنی اولاد کی محبت اور فکر بھی دامن گیر رہتی ہے۔

چنانچہ ہماری مارکس وادی دوست جنھوں نے پیرس میں ظروف سازی سیکھی تھی اور ایک عرصہ لندن کی اشتراکی تنظیموں میں شامل رہی تھیں۔ اپنی اولاد کی محبت میں خواجہ صاحب کی درگاہ شریف پر جانے لگیں۔

افضل خالو بھی انسان کے نبض شناس تھے۔ موت نے انھیں مہلت نہ دی ورنہ وہ کیا کچھ کرتے اور لکھتے لیکن زمانے کی ناقدری نے خود اُن کی زندگی میں اُن کو وہ شہرت اور مقبولیت نہ بخشی جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ جو بندہ نو سال کی عمر سے بلاناغہ نمازِ تہجد پڑھ رہا ہو لیکن

اُس کے ساتھ ہی نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف طبع ہو اُس کی شخصیت کیسی حیرت انگیز اور دلآویز رہی ہوگی۔ افضل خالو نے اپنے عالمِ غنودگی سے چونک کر آواز دی "انعام اللہ! انعام اللہ!!"

انعام اللہ اُن کے ڈرائیور کا نام بھی تھا۔ میں اُسے بلانے کے لیے فوراً باہر بھاگی۔ چند منٹ بعد جب میں لوٹ کر آئی تو اندر کہرام مچ چکا تھا۔ افضل خالو دنیا سے روانہ ہو گئے تھے۔ انعام اللہ ماموں شاید ڈیڑھ سال قبل وفات پا چکے تھے تو کیا اُس وقت ان کی روح افضل خالو کے استقبال کے لیے آئی تھی؟ خدا کی باتیں خدا ہی جانیں۔

انعام اللہ ماموں کے صاحبزادے اور بیٹی ثروت شاید پاکستان ہی میں ہیں۔ وقت کا جھکڑ ایسا چل رہا ہے۔ درختوں کی پتیاں دور دور تک بکھر جاتی ہیں۔ اِن سب کو سمیٹنا ناممکن ہے۔

سید امتیاز علی تاج نے لاہور ریڈیو کی ایک ٹاک میں افضل خالو کے متعلق بتایا تھا کہ اپنے کالج میگزین میں جس کے وہ مدیر تھے انھوں نے کالج کے سب سے دراز قد اور سب سے کوتاہ قامت دو لڑکوں کی تصویر شائع کر کے نیچے لکھا تھا "The long and short of it" مجھے امتیاز بھائی کی اُس ٹاک کا یہ جملہ یاد رہ گیا ہے جو میں نے لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو لاہور سے سنا تھا۔

اُدھر راوی اور اِس طرف گومتی کا کتنا پانی اب تک بہہ کر اِن کے پلوں کے نیچے سے گزر گیا ہے۔ افضل خالو بھی گئے اور مجھے یاد ہے کہ لاہور میں اُن کی وفات کے روز حجاب امتیاز علی دروازے میں کھڑی کسی خاتون سے بآوازِ بلند شکایتاً کہہ رہی تھیں "میں آپ کو کال کرنے گئی ہوئی تھی۔" اگلا جملہ مجھے یاد نہیں۔

سر ظفر اللہ ثانی ماموں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ جب آزادی سے قبل دوسری عالمی جنگ ستمبر 1939 میں شروع ہوئی اور حکومت ہند نے سپلائی کا نیا محکمہ قائم کیا اور سر محمد ظفر اللہ خاں کو اُس کا چارج دیا گیا۔ وائسرائے اُس کونسل کے صدر اور سر محمد ظفر اللہ خاں اُس کے چیئرمین تھے۔ سر ایون جنکینز ایک فرض شناس اور محنتی افسر تھے۔ وائسرائے کی کونسل میں سر محمد ظفر اللہ خاں کا دوبارہ تقرر کیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار جب وہ اماں سے ملنے قرول باغ آئے تو مجھے اپنے ساتھ یہاں لیتے گئے جہاں اُن کے دفتر اُن کی میز کے پیچھے ہندستان کا بہت بڑا نقشہ

آویزاں تھا۔ چونکہ وہ مرحوم افضل خالو کے عزیز ترین اور بچپن کے دوست تھے۔ امی سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ چودھری شمشاد حسین جو اُن کے سُسر تھے اور روہتک یعنی علاقہ ہریانہ کے رہنے والے تھے جو تہذیبی لحاظ سے پنجاب کے بجائے دہلی کے تہذیبی حلقۂ اثر میں شامل تھا۔

سر ظفر اللہ ماموں کی بیگم جنھیں ہم بدر ممانی کہتے تھے وہ شلوار کے بجائے چوڑی دار پاجامہ پہنتی تھیں۔ چودھری صاحب بے حد قدامت پرست مسلمان تھے یعنی جماعتِ احمدیہ کے اراکین پوری طرح پابند شریعت افراد تھے۔ پنج وقتہ نمازی۔ عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔ چنانچہ جب چودھری ظفر اللہ بہ طور فارن منسٹر پاکستان لندن تشریف لے گئے، میں اُس زمانے میں وہیں تھی۔ پاکستان ہاؤس میں اب مجھے یاد نہیں لیڈی ظفر اللہ تھیں یا اُن کی بیٹی بہرحال اُن کے لیے ایک زنانہ دعوت منعقد کی گئی جس میں پوری طرح پردے کا انتظام کیا گیا کہ شاید کوئی ولایتی پرندہ وہاں پر نہیں مار سکتا تھا۔ لندن کے اعلیٰ ترین انگریز طبقے کی میمیں مدعو کی گئی تھیں۔ مجھ سے وہاں کسی نے چپکے سے کہا "دیکھیے یہ اصل مسلمان کی شان۔ وہ کسی انگریز لارڈ یا لیڈی لوگ کے رعب میں نہیں آتا۔ یہاں بھی چودھری صاحب نے اپنی خواتین کے پردے کی پابندی میں ذرا سی بھی کسر نہیں آنے دی۔

ڈرتا نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے

لندن میں اُن کی بیگمات نے اپنی شاپنگ وغیرہ بھی اسی پردے کے ساتھ کی۔ ہماری والدہ جو شروع سے پردہ مخالف پارٹی کی لیڈر رہی تھیں وہ اُن سے کوئی بحث نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہماری خالائیں بھی اُن کے سامنے آتی تھیں۔ البتہ ایک دن جب میں اُن سے ملی مجھ سے کہنے لگے "تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ میں باجی کو لکھوں گا کہ تمھیں واپس بلالیں۔" میں ڈر کے چپکے سے اُن کے سامنے سے سرک گئی۔

سر ظفر اللہ ماموں کی بیگم یعنی بدر ممانی چودھری شمشاد حسین کی بیٹی تھیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ زیادہ تر مسلمانوں نے احمد فرقے کے افراد کو مسلمان نہیں مانا کیونکہ اسلامی عقیدے کے مطابق حضور پُرنور ﷺ کو نبی آخرالزماں مانتے ہیں لیکن قادیان ضلع گرداس پور کے ایک

صاحب نے جن کا نام مرزا غلام احمد تھا اعلان کیا کہ وہ بھی نبی ہیں اور اُن پر وحی آتی ہے۔

اُس زمانے میں ہندو اور مسلمان دونوں کے یہاں مذہب ایک بڑا دلچسپ اور اہم مشغلہ تھا۔ برطانوی حکومت نے بہت سی سیاسی پابندیاں اہلِ ہند پر عائد کر رکھی تھیں۔ چنانچہ مذہب ہندستانی بورژوازی کے لیے ایک نہایت مفرح اور دلچسپ مشغلہ حکومت کی ہمت افزائی کے ذریعے وجود میں آ گیا تھا۔ آریہ سماج نے ہندو احیا پرستی شروع کی تھی۔ اُس کے مقابلے میں مسلمان مولوی بالخصوص جماعتِ احمدیہ کے اراکین صف آرا ہو گئے تھے۔ زندہ دلانِ پنجاب کے لیے ایک نہایت دلچسپ مشغلہ بھی تھا اور حکومت کے لیے Divide and Rule کا سنہرا موقع۔ آج کل پبلک کی تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ سنیما ٹیلی ویژن اور ریڈیو خواص و عوام کی زندگی کے لیے لازم و ملزوم ہو چکے ہیں۔ اُس وقت مذہبی مناظرے ایک نہایت دلچسپ Public Entertainment یعنی ذرائع تفریح بن گئے تھے۔ آریہ سماجی قادیانی اور عام مسلمان سب ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ پنجاب کا ولولہ انگیز اردو پریس میدانِ جنگ تھا۔ لڑائی میں قادیانی، غیر قادیانی، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی مشنری بھی شامل تھے۔ زندہ دلانِ پنجاب کے یہاں جو چہل پہل، خوش دلی اور ہنگامہ آرائی موجود تھی۔ وہ میرا خیال ہے یوپی میں مفقود رہی۔ یہاں کے لوگ اپنی تہذیبی برتری کے احساس میں غلطاں اور پیچاں تھے لیکن اسی زمانے میں لاہور اور لکھنؤ کی اردو صحافت خوب پھلی پھولی۔ ہندو، مسلمان اور سکھ اس بارونق بازارِ قصہ خوانی کی تخلیقی ہنگامہ آرائی میں برابر کے شریک تھے اور اہم ترین بات یہ ہے جس کا تذکرہ ہمارے ادبی مورخین بالکل نہیں کرتے کہ خواتین بھی اسی دور میں مردوں کے دوش بدوش خوب خوب لکھ رہی تھیں۔

پنجاب اُس زمانے میں ہندستان کا ایل ڈوریڈو تھا اگر آپ اس کا موازنہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے امریکہ سے کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ جب نپولین کی لڑائیوں سے تھکے ہارے اہلِ یورپ قسمت آزمائی کے لیے جوق در جوق شمالی امریکہ جا رہے تھے۔ ایک ہی خطے کے باشندوں کا ایک دوسرے کے قریب رہنا محض اہلِ سندھ کی خاصیت ہی نہیں ہے۔ امریکہ میں آئرلینڈ، اٹلی، جرمنی، برطانیہ، اسپین وغیرہ کے مہاجرین نے ایک ہی ایریا میں ایک دوسرے کے

قریب بود و باش اختیار کی جو قدرتی عمل تھا کیونکہ ایک نئی جگہ میں آدمی اپنے ہی ساتھیوں کا قرب چاہتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں برطانیہ، اٹلی، اسپین وغیرہ کے باشندے اکٹھے آباد ہیں۔

افضل ماموں نہایت شگفتہ نثر لکھتے تھے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اُن جیسے غیر معمولی ادیب کو اردو والوں نے یکسر فراموش کر دیا۔ کوئی اُن کے نام سے بھی واقف نہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرے درجے کے لکھنے والے مشہور و مقبول ہو جاتے ہیں اور غیر معمولی ادیب گمنام رہتے ہیں۔ شاید اُس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ وہ محکمۂ انکم ٹیکس کے بے حد فرض شناس افسر تھے اور رات گئے تک اپنی فائلوں میں مستغرق رہتے تھے اور زندہ دلانِ پنجاب کی ادبی محفلوں میں جانے کی فرصت انھیں بہت ہی کم ملتی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے عمر بھی بہت کم پائی۔ اگر زندہ رہ جاتے تو شاید ادب کی طرف مزید توجہ دیتے۔ اُن کی والدہ بھی مقبول و معروف مصنفہ اور ماموں زاد بہن جو اُن کی ہمشیرۂ نسبتی یعنی ہماری والدہ جو اُن کی ماموں زاد بہن بھی تھیں اردو کی ناول نگار اور جرنلسٹ دونوں تھیں اور مختلف قومی مسائل پر اُن کے جوشیلے مضامین مردانہ اخبارات اور رسائل میں برابر شائع ہوتے رہتے تھے۔ واضح ہو کہ اُس زمانے میں زنانہ صحافت ایک علاحدہ ادبی صنف تھی۔

مس نذر الباقر کو ہاٹ جو بعد میں نذر سجاد حیدر کہلائیں اور اُن کے چند سال بعد حجاب اسمٰعیل از مدراس کے مضامین اور افسانے مردانہ جرائد میں بڑی آب و تاب سے شائع کیے جاتے تھے۔ مئی 1912 میں جب نذر زہرا بنتِ نذر الباقر کی شادی سجاد حیدر سے ہوئی تو ایک اردو اخبار نے لکھا ؎

نذرِ زہرا نذرِ حیدرؓ ہو گئیں
نذرِ بی بی نذرِ شوہر ہو گئیں

افضل خالو نے دنیا سے جانے میں بہت جلدی کی۔ 40 سال کوئی عمر نہیں ہوتی۔ نہ معلوم یہ محکمۂ قضا و قدر کی کیا پالیسی ہے کہ بہت ہی غیر معمولی قسم کے افراد کو جینے کی مہلت زیادہ نہیں ملتی

لیکن اردو والوں کی ایک کوتاہ نظری بھی عجیب ہے کہ انھوں نے اردو کے ناقدین، مورخین اور مبصرین سب نے میر افضل علی کو یکسر نظر انداز کیا۔ کوئی اُن کی کتاب کا نام بھی نہیں جانتا۔ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ وہ کون تھے۔ یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات ہے۔ ریسرچ بھی ایسے اہلِ قلم پر کروائی جاتی ہے جن پر پہلے بھی اَنگنت مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کے نہایت شاندار کارناموں کی میں بے حد معترف ہوں لیکن انھوں نے 1936 کے پہلے کے ادب کو یکسر مسترد کر کے اپنی ذہنی پختگی کا ثبوت نہیں دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ایوانِ اردو میں ایک گھنٹہ آویزاں تھا اُسے ایک ہتھوڑی کے ذریعے بجا کر اعلان کیا گیا کہ اِس وقت سے نیا دور شروع ہوتا ہے۔ پچھلا سارا زمانہ جاہلیت کا دور تھا۔ ہاں، ہم منشی پریم چند کو قبول کرلیں گے کیونکہ انھوں نے ''کفن'' جیسی کہانی لکھی ہے۔ بس اللہ اللہ خیر صلّا۔

اب جو نئے رسالے نکلنے شروع ہوئے لکھنؤ سے اضطراب اور نیا ادب نکلا لیکن یہ شہر نگار مجاز کا عشق اور تار نئے ادب کے لیے راس نہ آیا۔ نئی تحریک کی دھوم مچی تو وہ بھی زندہ دلانِ پنجاب ہی کے جوش و خروش اور ذہنی اُپج کی مرہونِ منت رہی۔ علاوہ ازیں غدر کے بعد سے ایک انگریز یعنی کرنل ہالرائیڈ نے وہاں اردو کی کاشت کاری شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیت لہلہانے لگے، جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے بھی لازماً اردو پڑھی۔ اُن کی دھارمک کتابیں اردو رسم الخط میں چھپیں۔ لڑکیاں ہندی پڑھتی رہیں۔ ہندو سکھ سوسائٹی میں ہندی لڑکیوں کی زبان کہلائی۔ عیسائی مبلغین نے بھی اپنی تبلیغ کے لیے اردو کو اپنایا۔ لاہور میں سماج کے ہر طبقے کے لیے اُسی کے مذاق کے رسالے چھپنے لگے۔ 'مست قلندر' اور 'بیسویں صدی' خالص عوامی رسالے تھے۔ دوسری طرف 'نیرنگِ خیال' عالمگیر اور ہمایوں مڈل کلاس کے نمائندے تھے۔ آزادی سے ذرا قبل ترقی پسند تحریک نے ایک خاص طبقۂ دانشوراں تخلیق کیا۔ ہمایوں، ادبِ لطیف، سویرا، نقوش بالکل نئی ذہنی جاگرتی کے معلّن بنے۔ رسالوں کے مدیروں نے نئی اہمیت حاصل کی۔ حکیم یوسف حسن خاں لاہور میں اور شاہد احمد دہلوی دہلی میں اپنے اپنے شاندار مستحکم قلعوں کے صوبے دار تھے۔ نہ جانیں کیوں لکھنؤ اپنے سارے طمطراق اور شان و شوکت اور

احساسِ برتری کے باوجود ادبی صحافت کے میدان میں بہت پیچھے رہ گیا۔ نیاز صاحب کا نگار ایک ثقیل جریدہ تھا۔ سبطِ حسن کا ''نیا ادب'' بہت جلد بند ہو گیا۔

اب آیا پارٹیشن، جس نے ادب کی بساط ہی الٹ دی لیکن ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنی شدید مار اماری کے بعد بھی ہندو اور سکھ آبادی نے اردو سے اپنی محبت ترک نہیں کی۔ پاکستان سے افتاں و خیزاں آئے ہوئے شرنارتھیوں نے یہاں بھی اردو اخبار اور رسالے شائع کیے۔ گو اب اُن کی نئی نسل اردو سے نابلد رہی اور یہ ایک اجتماعی تہذیبی ہلاکت کی ہولناک مثال تھی لیکن اُن کے باوجود اردو نے سنیما کے ذریعے مزید مقبولیت حاصل کی۔ لیکن اب اس زبان کو اردو کے بجائے ہندی کہا گیا۔ چنانچہ اب نہایت نفیس اور شگفتہ مکالموں والے فلم ہندی اور جو اِکا دُکا فلم جن میں مسلمان ہیرو ہمیشہ شاعر ہوتا ہے اور ہیروئن پردہ نشین۔ ایسی فلم کو مسلم سوشل پکچر کہا جاتا ہے اور یہ رویہ آج تک موجود ہے۔ اِن فلموں کے کہانی کار اور مکالمہ نویس زیادہ تر اردو ادیب ہیں لیکن انھوں نے اس صورتِ حال کے متعلق کبھی کوئی احتجاج نہیں کیا۔ جس ''مسلم سوشل'' میں کہانی دورِ حاضر کی ہو اُس میں بھی ہیرو اونٹ پر بیٹھ کر حج کرنے جاتا ہے اور ہیروئن پردہ نشین نقاب پوش ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ نواب زادی ہوتی ہے یا طوائف۔ ہمارے فلم سازوں کو مسلم اشرافیہ یا مڈل کلاس نظر ہی نہیں آتی اور ہر مسلمان ہیرو محض شاعری کرتا ہے۔ جب میں نے کئی نامور فلم سازوں سے پوچھا کہ آپ لوگ مسلم تعلیم یافتہ موڈرن مڈل کلاس کیوں نہیں دکھاتے تو اُن کے پاس ایک ہی جواب تھا کہ ہمارے عوام اور خواص دونوں کو یہ مسلم فینٹسی ہی پسند ہے۔ اگر ہم نوابوں اور طوائفوں کے بجائے عام متوسط طبقے کی زندگی پیش کریں گے تو اُس میں اور ہندو معاشرے کے مسائل میں کیا فرق نظر آئے گا۔ ترچھی ٹوپیاں اوڑھے قوالی گانے والی لڑکیاں عام پبلک کے لیے ایک مسحور کن نظارہ ہیں۔

چنانچہ اب ہندستانی مسلمانوں کی زندگی کی جھلکیاں دیکھنے کی امید نہ رکھیے۔ عام غیر مسلم پبلک کے لیے کم از کم شمالی ہند کی مسلم سوسائٹی آج بھی ایک Hot-House Culture ہے۔ میں یہ واقعہ شاید پہلے بھی قلم بند کر چکی ہوں کہ ابھی چند سال قبل میں ٹرین میں کہیں جا رہی تھی اور میں

نے سلیکس پہن رکھی تھی تو ایک ہم سفر خاتون کو باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ تو وہ بولیں "آپ محمڈن ہیں؟ پھر تو جی آپ نے بڑی ترقی کی۔ آپ نے تو پتلون پہن رکھی ہے اور پردہ بھی نہیں کرتیں۔" میں نے جواب دیا "جی آپ نے بھی بہت ترقی کی ہے۔" "وہ کیسے؟" انھوں نے پوچھا۔ میں نے کہا "وہ ایسے کہ آپ اتنا لمبا گھونگھٹ نکالتیں، کھلے منہ اس طرح نہ گھومتیں۔" وہ خاموش ہو گئیں۔

بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں اردو ادب نے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ ہندستان تاج برطانیہ کا اہم ترین ہیرا کوہ نور تھا۔ یہ ہیرا زمانے کی پیچ در پیچ گلیوں میں شانِ بے نیازی سے جگمگا رہا تھا۔ اسے کبھی پرواہ نہیں ہوئی کہ اب وہ کس کے تاج میں جڑا گیا ہے اور یہ کس بادشاہ کے سرپہ فروزاں ہے۔ وہ تو ایک بے حس پتھر تھا جسے زیرِ زمین کیمیائی عمل نے پتھر سے ہیرا بنا دیا تھا۔ ان ہیروں اور دوسرے جواہرات کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے کتنے اَنگنت انسانوں کا خون بہایا گیا۔ اُس کا حساب کسی نے نہیں لکھا۔ البتہ ان پتھروں کی قیمت اور مالیت کی رقوم تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو گئیں۔ یہ ہیرے جواہرات Crown Jewels کہلاتے ہیں۔ برطانیہ کے ایک عجائب خانے میں محفوظ ہیں اور دنیا بھر کے سیاہ جوق در جوق انھیں دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ کوہ نور شاید برطانیہ کے اس تاج میں جڑا ہے جسے ملکہ الزابیتھ اہم مواقع پر زیبِ فرد کرتی ہیں۔ ایک نہایت اہم اور پُر غرور اور بے اندازہ دولت مند شہنشاہ محمد رضا شاہ پہلوی اور ان کی ملکہ فرح دیبا کو میں نے اس کے عروج کے زمانے میں بھی دیکھا اور اُن سے ملی۔ مجھے وہ وقت بھی اچھی طرح یاد ہے جب تہران سے ایک دور دراز شہر کی پرواز کے لیے شاہ موصوف اپنا بڑا ہوائی جہاز خود اڑا رہے تھے۔ کوئی معاون پائلٹ اُن کے ساتھ نہیں تھا بلکہ فرح اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں اور پچھلی سیٹوں پر ملکہ کی والدہ مادام قطبی اور دو تین افراد میرے ہمراہ تھے۔ ہم لوگ شاید اصفہان گئے تھے۔ مادام قطبی ایک مالٹے کی قاشیں کاٹ کاٹ کر ہمیں پیش کر رہی تھیں۔ وہ وقت خوابِ و خیال ہو گیا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مجھے اُن کے زوال کے بعد دور دراز کیلی فورنیا میں بھی اُن کی جلاوطنی کے احوال معلوم ہوئے۔ لیکن یہ عروج و زوال کوئی انوکھا ڈرامہ نہیں ہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

شاہ ایران اور اُن کی ملکہ سے اُن کے عروج کے زمانے میں ملاقات ہوئی۔ شہبانو سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ اب یہاں ایک اہم پہلو پر ذرا دھیان دیجیے۔ ایک مالکِ تخت و تاج، ایک وزیر، ایک امیر، ایک ارب پتی تاجر میں کیا فرق ہے؟ دولت اور وہ سیاسی طاقت جو وہ شخص اپنی اس دولت کے ذریعے خرید سکتا ہے۔ جب شاہ ایران تخت سے اتارے گئے اُس سے قبل اور ذرا بعد کا وہ دل دوز اور عبرت ناک ڈرامہ اس ناچیز نے بہ چشم خود ملاحظہ کیا۔ جب وہ کیلی فورنیا میں جلاوطن ہوئے، کچھ عرصہ بعد میں بھی اپنے بھتیجوں کے پاس گئی جو لاس اینجلز شمالی ہالی وڈ میں رہتے تھے۔ شاہ کی جلاوطنی کا حال اخبار میں پڑھا کہ اچانک وہ اپنی عظمت و شوکت، جاہ و جلال سے کس طرح محروم ہوئے۔ تب مجھے یاد آیا سکوتِ حیدرآباد کے فوراً بعد ایک تصویر شائع ہوئی تھی کہ نظام حیدرآباد ایک مقتدر سیاسی رہنما (جو لاوہ پرش کہلاتا تھا) کی پائگی میں تشریف فرما ہیں اور وہ شخص پلنگ پر نیم دراز۔ اللہ اکبر۔

ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اب ایک بار پھر میر افضل علی کو یاد کیجیے کہ اگر وہ پندرہ بیس سال اور جیے ہوتے تو حکمت قضا و قدر کا کیا حرج تھا۔ انھوں نے اپنی دریادلی اور انسان دوستی کی بدولت کتنے لوگوں کو خاموشی سے فائدہ پہنچایا تھا اور اُن کے کام آئے تھے۔ خود اردو ادب کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہوتا۔ مگر تعجب اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اُن کی جو کتاب شائع ہوئی وہ بھی گمنام رہی۔ اُن کا اسلوب منفرد تھا جو شگفتگی اور شائستگی سے مزین۔ تخیلات کے مضامین میں ظرافت کی مثالیں بہ کثرت موجود ہیں جس میں زندگی کے سنجیدہ مسائل کو موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ مسائل کو مزاح کی چاشنی میں پیش کرتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ اُن کے بیان کی شیرینی نے تخیلات کو اور بھی دلکش بنادیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ میر افضل علی کو اُن کی بے وقت روانگی کے بعد فراموش کر دیا گیا۔ ادب کی دنیا بڑی عجیب دنیا ہے۔ یہاں کسی کے لیے نہیں کہا جا سکتا کہ کون کب تک یاد رکھا جائے گا۔ لیکن وہ ادبی فیشن بدلتے رہتے ہیں لیکن ادب کی اعلیٰ اقدار تو زندۂ جاوید ہیں اور ایسے ناقابل فراموش اہلِ قلم کو یکسر بھلا دینا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔

بہر حال خیالستان سے متاثر ہو کر مصنف نے اپنے مجموعہ کا نام تخیلات رکھا تھا۔

(قرۃ العین حیدر نے اپنے خالو میر افضل علی کے مضامین کا مجموعہ 'تخیلات' کے نام سے مرتب کیا ہے۔ یہ دیباچہ اس میں شامل ہے۔)

نوائے سروش

جس فرد نے بحیثیت ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ، ریڈیو براڈ کاسٹر اور صحافی اپنے کالج کے زمانے سے طرح طرح کے مشاہیر کو انٹرویو کیا ہو جب خود اس کا انٹرویو لیا جائے تو اسے عجیب لگتا ہے۔ والد مرحوم کے ملاقاتیوں میں جو ہمارے یہاں آیا کرتے تھے بعد میں پتہ چلا کہ یہ سب مشاہیر ادب تھے۔ آنند نرائن ملا، جگر و جوش و مجاز، علی عباس حسینی، سید سجاد ظہیر اور منشی دیا نرائن نگم وغیرہ۔ ہماری والدہ اس صدی کی اولین روشن خیال خاتون تھیں، لہٰذا نامور خواتین کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ایسی صورت حال میں ہوتا ہے بچوں نے اپنی تربیت کے مطابق ان سب کا ادب تو بے حد کیا لیکن ان کی ادبی اہمیت کا کچھ احساس یا اندازہ نہیں تھا اور چونکہ یہ ایک بہت متقی قسم کا گھرانہ تھا، یہاں محافل ناؤ نوش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دراصل آزادی سے قبل ہمارا معاشرہ زیادہ تر نہایت ہی صالح قسم کا معاشرہ تھا۔ ماہرین عمرانیات کو جاننا چاہیے کہ سیاسی زلزلے نے ذہنوں کو بھی کس طرح اور کس حد تک متاثر کیا کہ ہم اچانک ایک صارفی دور میں داخل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک جو آزادی سے چند سال قبل ہی شروع ہوئی تھی اسی سرعت کے ساتھ معدوم ہوئی، ان ساری تبدیلیوں کا اثر ہمارے ادب پر بھی پڑا۔ یہ واقعہ

ہے کہ تخلیقی ادب کرائسس کے زمانوں میں پھلتا پھولتا ہے۔ مصوروں اور موسیقاروں کو پرامن زمانوں کی ضرورت ہے۔ قلم کار کا دماغ ہی اس کا اسٹوڈیو بھی ہے اور جلسہ گھر بھی۔ اسے اپنے سامنے جیتے جاگتے حاضرین اور سامعین کی بھی ضرورت نہیں وہ تنہائی میں اپنا کام کرتا ہے۔ اسی تنہائی سے اپنے پیغامات دنیا کو بھیجتا رہتا ہے اور ایک دن خاموش ہو جاتا ہے۔ لکھنا ایک بے حد انفرادی عمل ہے لیکن اسی کے ذریعے لکھک اجتماعی زندگی میں اپنا اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے دور کی سیاسی اور دوسری تحریکوں کا اثر قبول کرتا ہے یا ان سے الگ بھی اپنی ایک راہ بناتا ہے۔ بعض دفعہ یہ راہ بالکل غیرارادی طور پر بنتی ہے مثلاً جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ترقی پسندی کے عروج کا دور تھا، بیشتر ادیبوں نے سطحی مارکسیت کو اپنے اوپر اوڑھ لیا تھا۔ ڈگر سے ہٹ کر جو بھی چلا وہ رجعت پسند۔ مجھے اب تک یاد ہے اور میں اس کا پہلے بھی ذکر کر چکی ہوں۔ چونکہ جو باتیں بہت دکھی کرتی ہیں وہ ہمیشہ یاد رہتی ہیں۔ میرے دو کزن جو انڈین پولس کے ایک اعلیٰ افسر کے بیٹے تھے، یہ دونوں بھائی زبردست سرخے بن گئے تھے۔ ایک دن وہ ایک ضخیم کتاب لے کر آئے جس کا گرد وپوش سرخ رنگ کا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا 'ہل کے سایے میں'۔ اندر اس وقت کے تمام نامی گرامی ترقی پسند اہل قلم کے افسانے شامل تھے۔ دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا جس میں انھوں نے 'میرے بھی صنم خانے' کا تذکرہ کیا تھا جو ان ہی دنوں چھپ کر آئی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ اس ناول میں ڈرائنگ روم، تعلقہ داروں اور ڈنر پارٹیوں وغیرہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مجھے اصل الفاظ تو یاد نہیں مطلب یہی تھا۔ مجھے یہ پڑھ کر بہت صدمہ ہوا اور تعجب بھی کہ اتنے بڑے بڑے ادیب اتنی سطحی بات بھی کر سکتے ہیں اور وہ افسانے کے متن کی گہرائی میں جانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ میں اس وقت بہت کم عمر تھی لیکن مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ ادب میں اب بھیڑ چال زیادہ ہوگئی ہے۔ انفرادی آوازوں کی گنجائش رہی ہے نہ اہمیت، لیکن میں لکھتی رہی چونکہ یہ میرا ایک پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک بہت ہی بچکانی متھ طبقاتی ترجیحات کی بھی تیار کی گئی جس میں ایک طبقے کی بالادستی کا تذکرہ تھا، اور ان کی موٹر کاروں اور پارٹیوں کو ہدف ملامت بنایا جاتا تھا لیکن 1956 میں جب میں بمبئی گئی تو میں نے ان ہی اہل قلم کو فلم انڈسٹری میں شمولیت کی وجہ سے موٹر

کاروں اور ڈنر پارٹیوں والی زندگی بڑے طمطراق سے گزارتے دیکھا۔

ہماری چنداں ممانی اکثر کہا کرتی تھیں اے ہے میں نے فلاں بات سنی یا فلاں چیز دیکھی تو میں قائل ہوئی۔ چنانچہ میں بھی بمبئی میں ان اہل قلم کے دوہرے معیار کو دیکھ کر بہت قائل ہوئی لیکن میرے دیکھتے دیکھتے زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے۔ وہی نامور کامریڈ جو بات بات پر ٹاپ بورژواڑی کا تذکرہ استہزائیہ انداز میں کرتے تھے اب انھوں نے کامریڈوں کی یہ اصطلاحات استعمال کرنی بالکل ترک کردی اور اس دن تو مجھے بہت ہی حیرت ہوئی جب ایک نامور ترقی پسند ادیبہ نے مجھ سے فخریہ کہا کہ ان کی بیٹی کو اس کے منگیتر نے ہیرے کی انگوٹھی دی ہے جس کی قیمت بیس ہزار روپے ہے۔

تو ہمارے یہاں ترقی پسندی کا یہ غلغلہ دال چاول کا وقتی ابال ثابت ہوا۔ دراصل چند دانش وروں، یونیورسٹی کے طالب علموں اور اہل قلم کے انقلابی مضامین یا خیالات کسی ملک میں انقلاب نہیں لا سکتے یا سارا ہندستان اہالیان کیرالہ یا بنگال کی طرح پڑھا لکھا اور باشعور ہو تو تان آ کے ٹوٹی تعلیم پر اور فی الحال تعلیم کا رنگ کیسری ہوتا جاتا ہے...پس چہ باید کرد....

گزشتہ برسوں میں میرے جو انٹرویو لیے گئے ان سے بہ سرعت بدلتے ہوئے حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ میں پہلے بھی یہ کئی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ ہمیں اپنا موازنہ مغرب یا جاپان کے اہل قلم سے نہیں کرنا چاہیے۔ وہاں کا ادیب ایک تعلیم یافتہ پبلک کے لیے لکھتا ہے ان کے یہاں آبادیاں بہت کم ہیں اور تعلیم بہت زیادہ...ہمارے یہاں آبادی ایک ارب تک پہنچ گئی ہے اور تعلیم آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے بہت ہی خوش ہو کر نیوکلیئر بم بھی بنا لیا ہے۔ یہ صورت حال جتنی دہشت ناک ہے لوگ اس سے اتنے ہی بے پرواہ ہیں۔ پہلے ہندستان کے ادیب دشاعر چھوٹے چھوٹے مسائل کے لیے بطور احتجاج سڑکوں پہ نکل آتے تھے وہ نسل یا تو خاموش ہو گئی ہے یا اب دنیا ہی سے رخصت ہونے والی ہے۔ ان کی جگہ تیزی سے ایک جنگجو اور منفی قسم کے جارحانہ خیالات والی نوجوان پیڑھی سامنے آرہی ہے۔ ہمارے اہل دانش نے ابھی اس انتہائی خطرناک صورت حال کا بھی شاید باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا ہے۔ ایسے موقع پر ادب،

آرٹ، فلسفہ یا ان کی خدمت عجب مسخرے پن کی بات معلوم ہوتی ہے۔ فرقہ پرستی کا جنون جس حد تک لوگوں پر طاری ہو چکا ہے اس کا بھی ہمیں صحیح اندازہ نہیں ہے۔ طوفان نوح بڑھیا کے تنور سے نکلے گا؟

میں نے آج سے مدتوں قبل ایک سرسبز، پرفضا، پرسکوں، دلآویز مقام کی سیر کی جسے اجودھیا کہتے ہیں۔ میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد اپنے ماموں کے یہاں فیض آباد گئی ہوئی تھی جہاں وہ چھاؤنی میں انڈین آرمی کے ایک میجر کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں تعمیر کی ہوئی ان وسیع و عریض نیچی کرسی والی کوٹھیوں کے گرد ایک سے ایک خوبصورت لان اور باغات لہلہار ہے تھے۔ ایک روز ہم لوگ اجودھیا گئے اور رام مندر دیکھا۔ باہر ایک بے حد گھنے چھتنار برگد کے نیچے چبوترے پر ایک ملاجی اطمینان سے بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کے ان کے پاس ایک پنڈت جی بھی آ گئے۔ دونوں کو سیاحوں سے بخشش ملنے کی امید تھی۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ مندر میں تالا پڑا تھا یا نہیں۔ بہر حال وہ ایک نہایت پرسکوں اور پرفضا مقام تھا۔ ایودھیا، اودھ، رام لکشمن اور سیتا کا دیس۔ میرا بچپن مشرقی اضلاع میں گزرا جو رامائن کی سرزمین ہے جہاں ہر تیسرے آدمی کا نام رام اور تیسری عورت کا نام سیتا ہے۔ ہماری کوٹھی کے مالک سیٹھ سیتارام تھے جو شہر کے اندر ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتے تھے اور ہمارے ایک پنکھا قلی کا نام بھی سیتارام تھا۔ وہاں ہندو ایک دوسرے کو رام رام کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ رام لیلا کے موقع پر دولڑکے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر رام اور لکشمن بنتے تھے اور ہمارے ہندو معززین شہر جا کر ان دونوں کو پرنام کرتے تھے۔ رام لیلا کے کرداروں کا روپ دھارن کرنے میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ وہیں پر ہمارے ڈرائیور نے ایک لطیفہ بیان کیا کہ ایک بار کارڈ بورڈ کے پہاڑ کو بڑھئی نے کیلوں کے ذریعہ نہایت سختی سے جڑ دیا تھا۔ کئی لڑکے ہنومان جی بنے تھے۔ ان سب نے باری باری وہ پہاڑ اکھیڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ جب ایک مسلمان لڑکے کی باری آئی جو ہنومان جی بنا تھا اس نے آگے جا کر زور سے ایک نعرہ لگایا 'یاعلی' اور پہاڑ اکھیڑ دیا۔ بہت تالیاں بجیں۔

چنانچہ 'یاعلیؑ' پکارنے والے ہنومان جی کی یہ کلچر بہت اچھی طرح پھل پھول رہی تھی مگر 1947 میں لوگ گڑبڑا گئے ۔ پھر بھی ہمارے اضلاع کے دیہات میں یہ تہذیب موجود ہے ابھی تین چار سال قبل میں نے اودھ کے ایک گاؤں میں آدھی رات کے بعد نہر کے کنارے کنارے بیل گاڑیاں جاتی دیکھیں جن پر مرصع تعزیے لدے ہوئے تھے۔ محرم آنے والا تھا۔ یہ سارے تعزیے اہل سنت کے گھروں میں دس دن تک رکھے جائیں گے ۔ یہ تعزیوں، پیروں، فقیروں اور درگاہوں اور رام لیلاؤں کی کلچر ہماری اصل کلچر ہے اور بڑی نعمت ہے اور اسے ہرگز ہرگز مٹنے نہیں دینا چاہیے ۔ نہ یہ بدعت ہے نہ اوہام پرستی، نہ شرک، نہ بت پرستی، یہ محض ہمارے عوام کا تہذیبی سرمایہ ہے ۔ جب اسپین یا اٹلی میں کورپس کرسٹی کے جلوس نکلتے ہیں تو ہم پر بہت رعب پڑتا ہے چونکہ وہ گوروں کا مذہب ہے ۔ یا جب ویسٹ منسٹر ایبے کے اندر تاج پوشی سے پہلے لاٹ پادری ملکہ الیزبتھ کے سر پر تیل ڈال کر وہ قدیم عبرانی رسم ادا کرتا ہے جس کے ذریعے کنعام و فلسطین کے بادشاہوں کو جس کے بعد تخت نشیں کیا جاتا تھا تو آج کا انگریز لاٹ پادری یعنی Arch-Bishop of Canterbury ملکہ الزبتھ کے سر پر ایک چمچہ تیل انڈیلتے ہوئے مطلق نہیں شرماتا اور سر پر تیل سے مسح کر کے بادشاہ بنانے کی اسی رسم اور اسی لفظ مسح سے مسیح نکلا ہے یعنی مسح کیا جانے والا ۔ ہمارے یہاں بھی مسح وضو کے فرائض میں شامل ہے ۔ ان کی اور ہماری تہذیبوں کا منبع ایک ہے ۔ یعنی ہمارا ابا اور ان کا ایبے (Abbey) اور ایبس (Abbess) بھی لفظ ابا پر مبنی ہے ۔ دور حاضر کے اسرائیلی لیڈر کا نام ایبان Eban تھا ۔ مسیحی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے مصلوب ہونے کے بعد تکلیف کی شدت سے چلا کر پکارا تھا ابا... ابا... لما سبقطنی یعنی ابا... ابا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ۔ یعنی یہ الفاظ دیگر حضرت عیسیٰ اللہ میاں کو ابا کہتے تھے ۔ یعنی یہی نظریہ تثلیث کی بنیاد ہے ۔ باپ، بیٹا اور روح القدس ۔ تو گویا جب برصغیر کے مسلمان گھرانوں کے بچے اپنے باپ کو ابا کہہ کر پکارتے ہیں تو وہ حضرت عیسیٰ کے ہم زبان ہیں ۔ لفظ کہاں سے کہاں تک کا سفر کرتا ہے ۔ مذہبی نظریات اور تاریخی فاصلوں سے الفاظ کے معنی بدل گئے اور ان کی دنیائیں مختلف ہو گئیں ۔

الزبتھ نام کو لیجیے ۔ ایل ایلیٰ الٰہی، اللہ قدیم عبرانی الفاظ ہیں ۔ الزبتھ کے لغوی معنی ہوئے

اللہ رکھی یعنی ایل-ایلیٰ زبتھ... رکھنا، بیٹھنا۔ یعنی یہ الفاظ ہمارے الفاظ کی دنیا سے بہت قریب ہیں لیکن جس تمدن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں ہم سے وہ بہت مختلف مغربی تمدن ہیں۔ اسرائیل کے ایک وزیر کا نام ہی ابا، ایبان تھا۔ اب جو تمدن ابا کے نام کے ساتھ ہمارے آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ خالص ہندستانی (یا پاکستانی) ہے۔ لیکن ابا، ایبان لفظ وہی ہے اس سے منسلک دنیا بالکل ہم سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح لفظوں کے معنی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جو الفاظ یا اصطلاحات ہمارے لڑکپن میں مستعمل تھیں وہ اب متروک ہو چکی ہیں۔ ہمارے یہاں کار کو موٹر اور گیراج کو موٹر خانہ کہا جاتا تھا۔ کوٹھی میں پینٹری یا آبدار خانہ ہوتا تھا، باہر احاطے میں موٹر خانہ۔ حال ہی میں، میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ تمھارا موٹر خانہ کس طرف ہے تو ہنسنے لگی اور بولی موٹر خانہ کیا چیز ہے؟ ہمارے یہاں بیرے کو سردار کہا جاتا تھا وہ سارے ملازموں کا ہیڈ تھا۔ ہمارے آخری سردار غازی پور میں عبدل تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی کلچر کے پروردہ تھے اور تھوڑی بہت کچن انگلش بھی جانتے تھے۔ جب لنچ یا ڈنر کے لیے بلاتے تو فرماتے کھانا میز پر، یہ فقرہ بھی کمپنی کلچر کی باقیات میں شامل تھا اور انھوں نے خود ہی لطیفہ بیان کیا تھا کہ ایک تازہ وارد انگریز افسر نے سمجھا کہ میز پر کا مطلب ہے تیار ہے تو اس نے عبدل کو آواز دی گھوڑا گاڑی میز پر؟ یعنی تیار ہے؟ یہ 'کوئی ہے' کی کلچر تھی۔ خود میں نے بچپن میں اپنے ایک بزرگ عزیز کو کوئی ہے پکارتے سنا یا وہ محض آواز دیتے تھے یہاں آؤ۔ ملازم کا نام لے کر پکارنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے اضلاع میں اپنی سول سروس کے عہدہ داروں کی جو کلچر تخلیق کی وہ ساری دنیا میں منفرد تھی۔ ڈچ، جرمن، فرنچ، نوآبادیوں کی کولونیل آقاؤں نے اپنی محکوم ایشیائی اور افریقی آبادیوں کو باقاعدہ ان پڑھ اور جاہل رکھا جبکہ ایک ہندستانی اس زمانے میں ممبر آف پارلیمنٹ بن گیا اور آکسفورڈ اور کیمبرج ان کے لیے گھر آنگن بن چکے تھے۔ انگریزوں کی یہ کشادہ دلی ان کی لبرل ازم کے نظریے کی مرہون منت تھی۔ بے شک انھوں نے یہاں نسل پرستی کا بھی خوب مظاہرہ کیا، بہت سے طعام خانوں اور ریل کے ڈبوں پر لکھا ہوتا تھا فار یورپین اونلی، لیکن اس کے باوجود وہ تاریخ کے سب سے زیادہ روشن خیال کولونیل آقا ثابت ہوئے۔

انگریزی تعلیم نے ہماری دنیا بدل دی۔ بقول ملک راج آنند اگر شیلے اور کیٹس نہ ہوتے تو ٹیگور بھی نہ ہوتے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ محکوم اقوام آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے سابق آقاؤں کی زیادتیاں تو یاد رکھتی ہیں ان کی نیکیاں بھول جاتے ہیں۔ یہی مغلوں کے ساتھ ہوا۔ مغلوں نے جو نیکیاں اس ملک کے ساتھ کیں انھیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ انھوں نے طرز حیات میں جو نفاستیں یہاں متعارف کیں ان کو بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ اعلیٰ تہذیب کے جو اسباق انھوں نے پڑھائے وہ بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ چمن بندی، آداب نشست و برخاست، دسترخوان پر ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کرنا، ماں کو تو کے بجائے آپ سے مخاطب کرنا۔ ماں تو کیا کہہ رہی تھی اور امی جان آپ کیا فرما رہی تھیں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ فرقہ جو اپنی کلچر کی وجہ سے ممتاز تھا اب نامساعد حالات کا شکار ہو کے اپنی بدتمیزیوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے یا اپنے مذہبی جوش کے جا و بے جا اظہار کے لیے۔ دو مرتبہ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایک صاحب چلتی ٹرین کی کوریڈور میں بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں اور سارے میں پانی بہا رہے ہیں جس کی وجہ سے دوسرے مسافروں کا آنا جانا مشکل ہو گیا کیا وہ تیمم نہیں کر سکتے تھے؟ نامساعد حالات کیا رفتہ رفتہ انسانوں کا آئی کیو بھی بتدریج کم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے اس دن بڑی کوفت ہوئی جب ایک صاحب کی کسی بے وقوفی کی وجہ سے امپرنٹ کے دفتر میں میرے مہاراشٹرین رفیق کار نے مجھ سے کہا فکر کی کوئی بات نہیں، ہم اس کیونٹی کو کلچر سکھا دیں گے۔ عہد نامہ قدیم میں ایسی ایسی آفاقی صداقتیں موجود ہیں تعجب ہوتا ہے کہ ولادت مسیح سے ایک ہزار سال قبل بھی دنیا کے حالات وہی تھے جو آج ہیں اور اس میں کئی جگہ ان لوگوں کا ذکر آیا ہے جو پہلے سیاسی اقتدار کے مالک تھے اور اب وہ پانی بھرنے والے اور لکڑیاں چیرنے والے بنا دیے گئے۔ Drawers of Water and hewers of wood یہ قدیم واقعہ تاریخ میں بار بار دہرایا گیا ہے اور آج بھی ہمارے اپنے ملک میں اس کے مناظر موجود ہیں۔

سنہ 1953 سے لے کر آج تک جتنے انٹرویو اخبارات و رسائل کے لیے کیے گئے ان میں سے چند اس کتاب میں شامل ہیں۔ بی بی سی لندن، ماسکو، تاشقند، تہران، ہانگ کانگ، سڈنی،

پاکستان اور امریکہ کے مختلف شہروں میں ریڈیو یا پریس کے لیے جو انٹرویو کیے گئے ان کی شمولیت ممکن نہیں تھی پھر بھی جمیل اختر صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے جانے کہاں کہاں سے کھود کر یہ انٹرویوز نکالے جس کے لیے ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے۔ دراصل اس قسم کی ادبی مہم کا بیڑا اٹھانا فرد واحد کی اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ مولف کی محنت اور اردو ادب کے موجودہ سیاق و سباق پر ان کی گہری نظر یقیناً قابل تعریف ہے۔

قرۃ العین حیدر
19 اکتوبر 2001

بے 140، جل وہار
نوئیڈا، سیکٹر-25

(یہ پیش لفظ جمیل اختر کی مرتبہ کتاب 'نوائے سروش' جو قرۃ العین حیدر کے نادر و نایاب انٹرویوز کا مجموعہ ہے، میں شامل ہے۔)

آئینۂ جہاں

پہلی بات جو میں اس مجموعے کے متعلق عرض کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ میری والدہ اور ان کی پھوپھی نے بہ طور مس نذر الباقر اور والدہ افضل علی جو مضامین اور افسانے بیسویں صدی کے اولین برسوں میں لکھے ان کی قدامت کے لحاظ سے ان دونوں خواتین کو اردو فکشن کی پیش رو قلم کاروں میں شامل سمجھنا چاہیے۔ لیکن ہمارے یہاں اردو میں خواتین قلم کاروں کا گویا ایک علاحدہ زنانہ کمپارٹمنٹ مخصوص کر دیا گیا اور ان کو بچوں کے ادب کے ساتھ بریکٹ کیا گیا۔ یہاں تک کہ پروفیسر وقار عظیم جیسے دانش مند نقاد نے خواتین کے لٹریچر کو ادنیٰ درجے کا ادب پکارا۔ ہمارے پورے سماج میں بلا تخصیص مذہب و ملت عورتوں کے لیے جو رویہ عرصے سے چلا آتا تھا یہ تخصیص اُسی رویے کی آئینہ دار تھی۔ اردو ادب انیسویں صدی سے انگلش لٹریچر کا حاشیہ بردار رہا۔ اٹھارھویں صدی سے انگریزی میں ناول نگار عورتوں نے اہم مقام حاصل کر لیا۔ ہندستان میں بیشتر خواتین کو اَن پڑھ رکھا گیا تھا لیکن وہ لوک کہانیوں کے خزانے کی مالک تھیں۔ اسی روایت کی بنا پر دورِ حاضر میں انتظار حسین نے نانی اماں سے سنی ہوئی کہانیوں کی ایک Myth (متھ) تیار کی۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ناقدین اور ادبی مورخوں نے 1936 یعنی ترقی

پسند تحریک کے آغاز سے قبل خواتین کے لکھے ہوئے ادب کو یکسر نظر انداز کیا۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ ہندستان کی بہت کم زبانوں میں عورتوں کا اتنا عظیم الشان یوگ دان شامل ہوگا۔ اگر آپ خاتون، تہذیب نسواں، عصمت، زیب النساء وغیرہ کے پرانے فائل دیکھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ برصغیر کے دور دراز علاقوں میں رہنے والی پردہ نشین عورتوں نے کتنا کچھ لکھا اور کتنا اچھا لکھا۔

فن تحریر ہند ایرانی کلچر کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ ہمارے دور انحطاط میں جو اٹھارھویں صدی سے شروع ہوا عورتیں تقریباً محصور کر دی گئیں۔ لیکن اس زمانے میں بھی متمول خاندانوں میں استانی جی یا آتو جی لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے مقرر کی جاتی تھی۔ آتو ترکی زبان کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ عموماً مفلوک الحال شریف زادیاں امرا کے گھرانوں میں ملانی جی یا استانی جی کی حیثیت سے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مقرر کی جاتی تھیں۔ سترھویں اٹھارھویں صدی کے انگلستان میں بھی خستہ حال پڑھی لکھی عورتوں کو امیر زادیوں کی تعلیم کے لیے رکھا جاتا تھا۔

چونکہ مغل تہذیب ایک علم پرست تہذیب تھی' علمیت کی یہ روایت تو باقی رہی لیکن سماجی اور سیاسی تغیرات کی بدولت ارباب نشاط کی تحویل میں چلی گئی۔ اٹھارھویں صدی میں جب یورپ اور امریکا میں بڑی دھوم دھام سے دور جدید کا آغاز ہو چکا تھا ہندستانی معاشرہ پس ماندگی اور جہالت کی علامت بن چکا تھا۔

چینی کاغذ اور عرب ترکستانی، ایرانی کشور کشائی کی بدولت ایشیا اور شمالی افریقہ یعنی مصر میں تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ عرب جنھوں نے اسپین کے ذریعے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے چراغ روشن کیے تھے اس تاریخی حقیقت کو یورپین بالا دستی کی وجہ سے اہل مغرب نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ ہر قومی تہذیب اپنے ملک کی فوجی اور سیاسی طاقت کے بل بوتے پر ہمہ گیری حاصل کرتی ہے۔ زوال بغداد کے بعد اہل ترکستان نے سیاسی اہمیت حاصل کی۔ ہسپانیہ سے لے کر دور افتادہ بنگال، انڈونیشیا چین، ماچین اور شمالی روس تک یہ تہذیب پھیل گئی۔ میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ روسی آذر بائی جان کے شہر باکو میں مجھے پرانی دلی اور لاہور کی جھلک دکھلائی دی اور سمرقند کے ایک مکان میں ایک بزرگ خاتون چھینٹ کی شلوار میں ملبوس تخت پر بیٹھی قرآن

شریف پڑھ رہی تھیں تو مجھے ان کی شخصیت میں اور ہماری اپنی بڑی بوڑھیوں کے سراپا میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ عربی زبان نے چودہ سو سال سے ایک بین الاقوامی رابطے کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیے ہیں۔ مسیحی یورپ کے عروج کے بعد عربی کی اس بین الاقوامی حیثیت کی جگہ بہت حد تک انگریزی، فرانسیسی اور ولندیزی نے لے لی۔ کیونکہ یہ نئے مغربی سامراج کی ترجمان تھی اور صنعتی انقلاب نے ان زبانوں کو مالا مال کر دیا تھا۔ مشرقی ممالک پر سیاسی تسلط کی بدولت وہاں کی دولت مغرب میں پانچ چکی تھی۔ میں نے بہت پہلے کہیں ذکر کیا تھا کہ میں نے انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں چند قدیم محلات ایسے دیکھے جنھیں ان کی اصلی حالت میں محفوظ رکھا گیا ہے اور ان میں قالین ناپید ہیں۔ غالیچے، قالین بھاری اطلسی پردے اور دیگر سامان آرائش ان محلات میں نظر آتا ہے جو زیادہ تر اٹھارھویں صدی میں تعمیر کیے گئے اور جنھیں مشرق سے لوٹی گئی دولت کے ذریعے سجایا گیا۔

مگر سوال یہ ہے کہ ہم نے ان یورپین فوجیوں کو اس لوٹ مار سے روکا کیوں نہیں بلکہ اکثر ہم نے اپنے آپسی مناقشوں کی وجہ سے ان بیرونی طاقتوں کو یہاں پوری طرح کامیاب ہونے دیا۔ انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اٹھارہ سو ستاون میں ختم ہوا اور ہندستان براہ راست ملکہ وکٹوریہ کا غلام بنا۔

آپ نے اٹھارھویں صدی کی چند یورپین روغنی تصاویر میں دیکھا ہوگا کہ گورے افراد کی محفل میں ایک حبشی غلام بچہ بھی کونے میں موجود ہے۔ یہ تصاویر اس دور کی سیاسی صورت حال کی بخوبی عکاسی کرتی تھیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرق کے مجموعی انحطاط کی بنیادی وجہ کیا تھی۔ ہمارے امرا کی کاہلی اور عیش پسندی؟ میں پھر وہی پوچھوں گی کہ ہمارے حکمرانوں نے خواہ وہ پنجاب کے سکھ رہے ہوں یا جنوبی ہند کے مرہٹے انھوں نے یورپین فوجی اپنے لشکروں کی تربیت کے لیے تو منگوائے لیکن آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس یا ہائیڈل برگ سے پروفیسر کیوں نہ مدعو کیے؟ جو یہاں آکر علوم مغرب کے کالج قائم کرتے۔ دور دراز امریکا سے مشنری عورتیں یہاں آن پہنچیں مگر ہماری عورتوں کو ہمارے بزرگوں نے چہار دیواری میں محصور رکھا۔ تو ہمارا بالائی طبقہ مغرب

کے مقابلے میں ایک نوع کی احساس کمتری میں مبتلا کیوں نہ ہوتا۔ جب اس سوسائٹی کی لڑکیوں کے لیے شادی کی بات چیت چلتی تو فخر یہ بتایا جاتا کہ ہماری بچی نے گھر پہ رہ کر میم سے انگریزی پڑھی ہے۔ یہ میم صاحب عموماً اینگلو انڈین یا دیسی عیسائی ہوتی تھیں۔

بالکل یہی صورت حال مصر، ترکی اور ایران وغیرہ میں پیدا ہوگئی تھی۔ یہاں فرانسیسی یا دوغلی یورپین عورتیں امیر زادیوں کو فرانسیسی پڑھاتی تھیں اور اتنی فرنچ حاصل کرنے کے بعد پاشاؤں کی میرج مارکیٹ میں ایک فرانسیسی تعلیم یافتہ پاشازادی کی قدر و قیمت بڑھ جاتی تھی۔ یہ سارا کولونیل مشرق کیسے عجیب وغریب اجتماعی احساس کمتری کا شکار رہا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک قدم اور آگے بڑھا یا پردہ قانوناً متروک کیا گیا۔ خانموں نے فراک پہنے اور مصنوعی فرنگنیں بنیں۔ اس زمانے میں اہل مغرب ہم مشرقیوں کی اس نقالی کا کتنا مذاق اڑاتے ہوں گے۔

مجھے تین مرتبہ بذریعہ بحری جہاز نہر سوئیز سے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ سوئیز کنال پر مشرق و مغرب کے اس اجتماع ضدین کے عبرت ناک مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ بندرگاہ سوئیز پر پہنچتے ہی دنیا بدل جاتی تھی۔ غربت، بدنظمی، افراتفری گورے سیاح پانی میں سکے پھینکتے جونک دھرنگ مصری بچے غوطہ لگا کر باہر نکال لیتے تھے۔ ایک طویل القامت مصری جو گیلی گیلی مین کہلاتا تھا عرشے پر آکر گورے بچوں کو کھیل تماشے دکھلاتا۔ حالانکہ اب سارا مشرق آزاد ہو چکا تھا لیکن مغربیوں کے احساس برتری اور اہل شرق کی غلامانہ ذہنیت اب بھی ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ تین سو سال تک شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا اور ہندستان پر حکومت کرنے کے بعد یہ گورے اپنی کولونیل آقاؤں والی ذہنیت کو فراموش نہیں کر سکے تھے۔ ایک عجیب وغریب کایا پلٹ کا شاید میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں۔ ایک مرتبہ جہاز پر ایک پنڈت جی ملے جو پکے گاندھی وادی تھے ہمیشہ کھدر پوش رہتے اور صبح کو عرشے پر بیٹھ کر تہر کن چرخے پر تھوڑا سا سوت کاتتے۔ چند سال بعد جب میں لندن سے واپس آرہی تھی اُسی جہاز پر وہی پنڈت جی پھر مل گئے لیکن اب ان کا حلیہ بدل چکا تھا دھوتی کرتے کے بجائے سوٹ بوٹ میں ملبوس بار کے اسٹول پر جلوہ افروز ہاتھ میں جام شراب۔ مجھے سامنے سے گذرتا دیکھ کر پہچان گئے اور بے طرح جھینپے۔ بعد میں شاید وہ لندن ہی میں قیام

پذیر رہے۔ اسی طرح ایک پکے چائناوادی کامریڈ لندن میں طویل عرصہ گذارنے کے بعد پکے انگریز بن گئے۔ ہاتھ میں رولڈ چھتری، پورا برٹش اسٹائل سوٹ، تو میں نے سوچا انسان اپنے ماحول کا اثر کسی نہ کسی حد تک ضرور قبول کرتا ہے اور ہمارے ذہنوں میں مغرب کی برتری لاشعوری طور پر اس حد تک حاوی ہو چکی ہے کہ آج آزاد ہندستان اور آزاد پاکستان میں مغربی طرز رہائش ایک عام چیز بن چکا ہے۔ اور ہمارے مختلف طبقات نے اُسے پوری طرح قبول کرلیا ہے۔ ایک عام مڈل کلاس گھر میں بیٹھک کی جگہ ڈرائنگ روم، چوکے اور تخت کی بجائے ڈائنگ ٹیبل ہمارے فرنیچر کا لازمی جز ہیں۔ مغرب کا یہ تمدنی تسلط اس حد تک حاوی ہے کہ کوئی اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں۔ ہم نے اپنے تخت اور گاؤ تکیے اور قالین کیوں ترک کیے جبکہ جاپانیوں نے اپنے طرز بہ لحاظ صنعت و حرفت ان سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی اور قوم مشرق میں نہیں لیکن جاپان میں میں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے اندر فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اپنے آداب و تسلیمات کے طریقے بھی انھوں نے ترک نہیں کیے۔ ہمارے یہاں ایران میں تو یہ حالت ہے کہ عالی مرتبت خانموں نے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کروالیے۔ سب کی سب مصنوعی (Blonde) بلونڈ بن گئیں۔ مشرقی لباس تو رضا شاہ پہلوی نے ہی ترک کروادیا تھا اور شادیوں میں بھی عیسائیوں والا سفید گون اور سفید ویل پہنتی ہیں۔ ایک قوم کی اجتماعی احساس کمتری کے یہ مناظر مجھے بہت ہی الم ناک معلوم ہوئے۔ میں نے شہ بانو فرح پہلوی سے کہا کہ آپ نے اس مغربی پوشاک کے بجائے کوئی قومی لباس کیوں نہیں رائج کیا۔ کہنے لگیں ہمارے یہاں آپ کی ہندستانی ساڑی جیسا خوش نما لباس نا پاپید ہے اور اسے پہن کر آپ لوگ سارے کام کاج بھی کرسکتی ہیں لیکن ہمارے روایتی ملبوسات اتنے بھاری اور بوجھل ہیں کہ ان کو پہن کر فقط دیوان پر بیٹھا ہی جا سکتا ہے۔

اس کلیات میں جو افسانے شامل کیے گئے ہیں وہ کسی نہ کسی طور پر گذشتہ ساٹھ ستر سال کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی نظارے کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ لفظ فکشن ایک خیالی یا

تخیلاتی دنیا کا نمایندہ ہے۔لیکن یہ خیالی دنیا دراصل ٹھوس حقائق کی بنیاد پر بسائی گئی ہے۔افسانے میں حقیقت کی عکاسی ہزاروں برس سے کی جارہی ہے۔دیو مالا میں بھی حقیقت کا پس منظر اور انسان سے مشابہ تخیلی کردار موجود تھے۔کوہ قاف کو پریوں کا دیس کہا گیا کیونکہ کوہستان قفقاز جس کی سیاحت میں بھی کرچکی ہوں واقعی ایک پرستانی علاقہ ہے۔جس کے مرد و زن اپنی شکل و صورت، ڈیل ڈول اور شاندار ملبوسات کی بدولت واقعی کسی طلسماتی داستان کے کردار معلوم ہوتے ہیں مجھے وہ پرشکوہ بزرگ کبھی نہیں بھولے گا جو عظیم الجثہ سموری ٹوپی، فرغل اور فل بوٹ پہنے سمرقند ایرپورٹ پر اپنے طیارے کا منتظر تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عمر عیار کی داستان میں سے نمودار ہوا ہے اور اپنے سیمرغ کا منتظر ہے جو اُسے اڑا کر صد سکندری کے اس پار لے جائے گا۔ میں اس وقت سے خائف ہوں جب ان سحر انگیز تاریخی عمارتوں اور محلوں کو منہدم کر کے یہاں چوبیس منزلہ عمارتیں بنادی جائیں گی اور یہ کام ایشیا کے پرانے شہروں میں ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔میں بار بار اپنے مضامین میں یہ لکھ چکی ہوں کہ انگلستان، جرمنی، فرانس اور دوسرے یورپین ملکوں میں انھوں نے اپنے قدیم محلوں اور گلی کوچوں کو بہت ہی احتیاط اور پیار کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔انگلستان میں آپ ڈاکٹر جانسن کے مکان کے اندر جاسکتے ہیں اور ان کے ذاتی سامان کا بغور مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ہم لوگ اتنے بے پرواہ، بے حس، جاہل کیوں رہے ہیں کہ اپنے مشاہیر اہل قلم کے مکانوں اور ان کے ذاتی سامان کو محفوظ نہ کرسکے آپس کے لڑائی جھگڑے، دنگے فساد، بدزبانی، بدکلامی، لعن طعن سے ہمیں اتنی فرصت کہاں ہے کہ ہم اپنے تہذیبی خزانوں کی حفاظت کرسکیں۔البتہ جنوبی ہند میں تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ رہتے ہیں انھوں نے اپنے اپنے شعرا کے مکانوں اور سامانوں کو بڑے پیار سے محفوظ کرلیا ہے۔ہم شالی ہندوالے جانے کن آفتوں میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کے معاملات پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ایک بات تو یہ کہ زیادہ تر تاریخی اہمیت کی ہستیاں کسی نہ کسی فرقہ وارانہ جھگڑے، بحث، مباحثے اور مارا ماری تک کا شکار ہوچکی ہیں۔پریم چند کو لیجیے وہ بنیادی طور پر اردو کے ادیب لیکن اب انھیں محض ہندی کا لیکھک کہا جارہا ہے اور ان کے ضمن میں اردو کا تذکرہ ہی غائب کردیا گیا ہے۔ادھر علامہ اقبال جو تقسیم سے نو

برس قبل رحلت فرما گئے ان کا اب ہندستان سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا۔ دنیا کے کسی ملک کی اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر جھگڑے فساد خون خرابے کی یہ نوبت نہیں آتی۔ اللہ یہ کیسا ملک ہے اُدھر نہایت جوش وخروش سے پاکستان بنا سو چند سال بعد ایک بھیانک خوں ریزی کے ذریعے اس کے بھی دو ملک بن گئے۔ مجھے پھر نانی اشرف جہاں بیگم کی بات یاد آتی ہے کہ "بٹیا دنیا کے کسی اور ملک میں ایسا پھل پیدا نہیں ہوتا جس کا نام ہی پھونٹ ہے۔"

ہندو مسلم، شیعہ سنی، برہمن دلت، نارتھ انڈین ساؤتھ انڈین وغیرہ وغیرہ ان تفرقوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انگلستان میں اہل ہندو پاک بڑی تعداد میں آباد ہو چکے ہیں۔ اہل اسلام نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں وہاں بھی الگ الگ بنالی ہیں مجھے تعجب یہ ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو یہ مذہبی جھگڑے فساد کرنے اور کرانے کی اتنی فرصت کیسے ملتی ہے اتنے وقت میں وہ وہاں جاکر کتب خانوں میں بیٹھیں کتابیں پڑھیں یا کسی فنون لطیفہ میں مہارت حاصل کریں۔ کلاسیکل موسیقی سیکھ لیں کہ ان میں دل چسپی لینے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ میں ذکر کر چکی ہوں کہ پچھلی مرتبہ لندن میں ایک روز جب میں چھتری اٹھا کر برٹش میوزیم لائبریری جانے کے ارادے سے گھر سے نکلنے لگی تو میری رشتے دار خاتون نے کہا ارے آپ کہاں جارہی ہیں ابھی منشی جی پاکستان سے آئے تھے۔ ہم نے ان کی قوالیاں ٹیپ کرلی ہیں وہ سنیے۔ میں نے جواب دیا بی بی ان کی قوالیاں تو میں کراچی یا دلی میں بھی سن سکتی ہوں لندن میں کبھی کبھی آتی ہوں اس لیے برٹش لائبریری میرے لیے زیادہ اہم ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں ایک اینٹی کلچر رویہ بھی نمودار ہو چکا ہے جو ایک بہت ہی ہولناک بات ہے۔

ادبی ماہنامے ایک کے بعد ایک بند ہو رہے ہیں۔ چند ادبی رسالے جو ہندستان سے شائع ہو رہے ہیں ان کی تعداد اشاعت اتنی قلیل ہے کہ اس کا تذکرہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ فلمی نہایت مقبول رسالہ شمع جس کی تعداد اشاعت ایک لاکھ تھی اس کا بند ہونا تعجب خیز ہے ادارہ شمع جس کی طرف سے متعدد ماہنامے شائع ہوتے تھے وہ خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ میں نے پہلے بھی کہیں لکھا تھا کہ خاندانی مناقشوں کی وجہ سے مسلمانوں نے بڑی بڑی سلطنتیں کھوئی ہیں

تو یہ رسالے کیا چیز تھے۔

لاہور میں ایک بہت ہی تاریخ ساز ادارہ دارالاشاعت پنجاب عرصے سے قائم تھا جس کے بانی دیوبند ضلع سہارنپور سے پنجاب گئے ہوئے ایک بزرگ مولوی سید ممتاز علی تھے۔ ممتاز علی ہندستانی نشاۃ ثانیہ کے ایک اہم رکن تھے۔ انھوں نے دو ہفتہ وار رسالے پھول اور ''تہذیب نسواں'' جاری کیے تھے۔ تہذیب نسواں غالباً 1898 سے چھپنا شروع ہوا اور مولوی ممتاز علی نے اس کے دوسرے اخبار ہفتہ وار پھول کا اعزازی ایڈیٹر مس نذر الباقر کو مقرر کیا۔ سارے مضامین ان کو لاہور سے کوہاٹ بھیجے جاتے۔ میرے نزدیک ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک کمسن لڑکی نے اپنے آپ کو مس کہلوایا جو لفظ اس وقت تک دیسی عیسائی اور پارسی خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ زیادہ تر مسلمانوں لڑکیوں تک کے نام کا پردہ تھا ہمشیرہ فلاں یا بنت فلاں کے نام سے مضمون لکھتی تھیں اکثر ناولوں کی ہیروئن ایک پارسی حسینہ ہوتی تھی۔ فسانۂ آزاد تو شاید 1875 میں چھپنا شروع ہوا۔ در اصل ہماری سماجی تاریخ ایک عظیم الشان داستان ہے۔ امیر زادیاں، نواب زادیاں، سب مسلمان ان کے علاوہ ڈومنیوں، میراثنوں اور کہارنوں کی ایک رنگا رنگ اور سحر انگیز لیکن حقیقی دنیا، پنڈت رتن ناتھ نے اپنے اس MAGNUM OPUS میں اپنے جادو نگار قلم سے آباد کر دیے۔ ایسا حیرت انگیز اجتماعی ناول میرا خیال ہے ہندستان یا ایشیا کی کسی اور زبان میں نہیں لکھا گیا۔ سرشار نے اردو فکشن کا ایک سربہ فلک قلعہ تعمیر کیا۔ اور اس کے اردگرد حسین ترین باغات سجائے۔ اردو فکشن میں اتنا معرکتہ الآرا شاہ کار کس طرح تصنیف کیا گیا۔ اس کی وجہ محض ایک تھی اردو اس وقت ہندستانی تہذیب کی ایک درخشاں ترین ترجمان اور نمایندہ زبان تھی۔

روسی ناول، زار شاہی روس کی وسیع و عریض اسٹیج کے نمایندے تھے۔ یہ گویا آج کی Revolving Stage تھی جس کے پردے ایک کے بعد ایک اٹھتے جاتے تھے۔ زار شاہی روس نے انحطاط پذیر اور پس ماندہ وسط ایشیا کو بڑی آسانی سے مغروب کیا۔ سمرقند و بخارا محض افسانوی نام رہ گئے۔

حاکم سینٹ پیٹر برگ کے مدبّغ روسی تھے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کی لڑکیوں کی

شادیاں زار روس کے خاندان میں کی جاتی تھیں۔ رموز مملکت خویش خسرواں دانند۔ برطانیہ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم اور روس کے زار الگزنڈر ایک دوسرے کے فرسٹ کزن بھی تھے اور ہم شکل بھی۔ لیکن دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے خلاف خوفناک لڑائیاں لڑیں۔ یعنی درایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ برطانیہ اور روس کے علاوہ یورپ کی تیسری بڑی طاقت آل عثمان کی سلطنت ترکیہ تھی وہ یورپ کا مرد بیمار کہلانے لگا اور اسے اس کی قدامت پرستی کی وجہ سے مسیحی یورپ کی نئی سامراجی طاقتیں کھا گئیں۔ عالم اسلام کی اس مجموعی تباہی پر جتنا گریہ نہ کیا جائے کم ہے۔ اس طرف آل عثمان کزن آل تیمور کو ہندستان میں ہاؤس آف ونسر والے ملوک نے نیست و نابود کیا۔ ایک وقت تھا جب سلاطین ترکی اپنے مراسلوں کے ذریعے انتہائی توہین آمیز الفاظ میں یورپ اور انگلستان کے بادشاہوں کو مخاطب کرتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ بھی آیا جب 1857 کے بعد انگریزوں نے مغل شہزادوں سے دلی کی سڑکوں پر جھاڑو دلوائی اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ہمارے بزرگوں نے انگریز حاکم کے سامنے جوتے اتار کر جانے کے حکم کو بخوشی قبول کیا۔ میں اکثر یہ سوچتی ہوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے یعنی اگر سرسید نہ آتے تو مسلمان قوم کا حشر کیا ہوتا۔ سینٹ پیٹر برگ کے حکام نے وسط ایشیا کے مسلمانوں کی کچھ کم ذلت و خواری کی تھی۔ لال قلعہ دہلی میں آل تیمور کا چراغ گل ہوتے تو ہمارے بزرگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے غدر کے بعد دلی میں ان گنت مسلمان باغیوں کو پھانسی دی گئی۔ خود راقم الحروف کے پردادا میر احمد علی کو بغاوت کے جرم میں پھانسی کا حکم دیا گیا مگر حسن اتفاق اس کے فوراً بعد ہی ملکہ وکٹوریہ کا عام معافی نامہ جاری ہوا اور وہ بچ گئے اور ان کے پوتے برطانیہ سے وفاداری کے گڑھ، علی گڑھ پڑھنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ پورا واقعہ اس وقت کے مسلمانوں کے المیہ کی ایک روشن مثال ہے۔ لیکن میں سوچتی ہوں۔ یہ کوئی دور دراز کے سینٹ پیٹر برگ کا واقعہ نہیں تھا

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل

مجھے اپنے بچپن کا ایک منظر یاد ہے۔ شہر غالباً تہران تھا ایک ایرانی عورت آب طاہر۔ آب طاہر کی آواز لگا کر پینے کا صاف پانی فروخت کرتی تھی یعنی اس وقت رضا شاہ پہلوی کے

تہران میں عام طور پر صاف پانی پینے کے لیے میسر نہیں تھا۔ تو اس ملک کی پس ماندگی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ ہم ہندی مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ وہ شرق اوسط کے ممالک پر جان دیتے تھے۔ اور ان کی پس ماندگی کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی۔ ہاں البتہ انھیں اس بات پر بڑا فخر تھا کہ ایران میں ایک بادشاہ کی حکومت ہے جو تخت طاؤس پر بیٹھا ہے۔

اور صاحب! اس بندی نے تخت طاؤس بھی دیکھ لیا جو ایک معمولی سی کرسی ہے۔ اصل کرسی تہران کے بنک ''ملی'' میں محفوظ ہے اور اس کی نقل ان کے کاخ گلستاں میں رکھی رہتی ہے۔ ان کے محل بھی ہمارے لال قلعے یا پرانے قلعے یا دکن کے محلات کے مقابلے میں ہمیں تو نہیں جچے لیکن گھر کی مرغی دال برابر۔ ہم نے اپنے اس بے مثال سرمایے کو کوئی خاص قابل توجہ نہیں سمجھا۔ میرا خیال ہے مسلمان بنیادی طور پر ایک شاہ پرست قوم ہے اور میرے نزدیک اس کی ایک بڑی الم ناک توجیہ بھی کی جاسکتی ہے۔ یعنی دلی میں سلطنت مغلیہ کا انہدام۔ ہمارے بزرگ جب اس خاتمے کی ٹریجڈی پر خون کے آنسو روئے۔ ہمیں اس زمانے کے مسلمان حکمرانوں کی سفاکیاں تو یاد رہیں لیکن اس دور کی تہذیب کے مثبت پہلو انگریزوں کی بنائی ہوئی درسی کتابوں کے ذریعے چھپا دیے گئے۔ ہندو مسلم مفاہمت اس دور کی روشن ترین خصوصیت تھی۔ لیکن انگریزوں نے بڑی چالاکی سے پوشیدہ رکھا۔ اس دور میں خود ہمارے والد نے بتلایا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو لالہ بھائی اور میاں بھائی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہندو اشرافیہ کی عورتیں بھی پردہ نشین تھیں۔ میں نے آخری پردہ نشین ہندو لڑکی جو دیکھی وہ ہمارے اسکول کی ایک کائستھ طالب علم تھی۔ اس کے تانگے پر پردہ بندھا ہوتا تھا۔

اُسی دور میں جہاں انگریزوں نے دیسی ریاستوں میں ان کے راجاؤں اور نوابوں کی شخصی حکومتوں کو ایک حد تک باقی رکھا وہاں کی پس ماندگی اور برطانوی ہند کی ترقی کا مقابلہ کیجیے تو یہ فرق واضح ہوسکے گا۔ اور انگریزوں نے بڑی چالاکی سے قدامت پرستی کے لیے حصار محفوظ

رکھے تھے تاکہ سارا ہندستان نئی قوم پرستی سے مغلوب نہ ہوسکے۔ میں آپ کو بہت ہی مختصر پیانے پر اُس دقیانوسی فیوڈل سماج کی ایک جھلک دکھاتی چلوں۔ جو میری یاد میں روزِ روشن کی طرح محفوظ ہے۔ میری والدہ کے خاندان کی ایک شاخ کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس میں ہندو رعایا اکثریت میں تھے لیکن وہ اپنے نواب پر جان دیتے تھے۔ ہولی کے روز ہماری بو بو کا دوپٹہ باہر بھیجا جاتا تھا جس پر ان کے ہندو رعایا کے نمایندے رنگ ڈالتے تھے۔ پھر وہ دوپٹہ اندر بھیج دیا جاتا تھا۔ مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ لیکن اسی خاندان میں محل سرا کے اندر یعنی زنان خانے میں انگریزی کتاب ناپید تھی۔ اور میری ایک نواب زادی کزن نے بچے کو بلا کر کہا دیکھو ایک پرچہ فلاں جگہ رکھا ہے وہ لے آؤ۔ وہ فوراً دہلی کی مشہور انگریزی دوکان شاید ''وائیٹ ویز لیڈلا'' کے اشتہار کا تراشا لے آیا اور انھوں نے مجھ سے کہا دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔ اور اُسی زمانے سے ذرا قبل کی بات ہے کہ ہمارے ایک عزیز نے وہیں آن کر ہماری والدہ کو بتلایا' باجی! اس سال میٹرک میں ایک مسلمان لڑکی بھی پاس ہوئی ہے اور پھر ذرا مسکرا کر اضافہ کیا قصائی کی لڑکی ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم معاف کیجیے گا ذات برادری پہ مبنی تھی۔ شادی بیاہ کے معاملے میں مجال ہے جو اہل حرفہ اونچی ذات والوں میں شادیاں کرسکیں۔ مجھے ایک اور کزن کا جملہ یاد ہے ایک مہمان خاتون نے اپنے نواسے کا نام صلاح الدین بتلایا تو میری کزن نے کہا اے ہے یہ کیا دھندیے جلاہوں والا نام رکھ لیا۔ ہمارے اس خاندان کی بیگمات سلام علیکم کو بھی دھندیے جلاہوں والا سلام کہتی تھیں۔ تو ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ کاسٹ سسٹم سے آزاد تھا۔

پاکستان کے اولین برسوں میں یہ شکایت عام طور پر سنی جاتی تھی کہ اے ہے یہاں تو انڈیا سے آئے ہوئے قصائی بھی اچھے خاندانوں میں شادیاں کر رہے ہیں۔ اس طرح کا تذکرہ جو میں کر رہی ہوں ہمارے بہت سے قارئین کو اب بھی شاید ناگوار معلوم ہوگا۔ کیونکہ ہم اکثر اپنی کمزوریوں کو انگریزی محاورے کے مطابق قالین کے نیچے چھپا دینے کے عادی ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے علی گڑھ میں انگریزی نہ پڑھی ہوتی اور کلکتے کے نئے ہندو بابو کلاس

کے مقابلے میں ایک مسلمان تعلیم یافتہ میڈل کلاس استوار نہ کی ہوتی تو کیا ان کا وہی حال نہ ہوتا جو آج تک افغانستان کا ہے۔

ہندستان میں برطانیہ اور روس میں زارشاہی خاندان کے تسلط کی وجہ سے ایک ہی زمانے میں فصیل ہمالیہ کے دونوں طرف ایک ہی نوع کے کولونیل مسلم معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ اس وقت تک وکٹورین تہذیب ایک عالم گیر تہذیب بن چکی تھی۔ نیوزی لینڈ سے لے کر شمالی کینڈا تک ایک ہی مدنیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ تقریباً ساری دنیا اہل مغرب کے تاجروں کے بازار میں تبدیل ہو چکی تھی چنانچہ کولونیل مشرق مغربی اہل دانش کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا اور یہ اس کے حق میں بہت اچھا ہوا۔ کیونکہ اس طرح ایک جست میں عہد وسطیٰ سے نکل کر دور جدید میں داخل ہو گیا۔ ہندستان ایک مثالی برطانوی نو آبادی بنا جس میں قانون کی بالادستی مسلم تھی تعلیم نسواں کے لیے راستے کھلے۔ صحافت اور ادب میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اگر آپ اُسی دور کے دوسرے ایشیائی ممالک کے سماجی حالات کا مطالعہ کریں تو آپ کو میرے اس بیان پر یقین آ جائے گا۔

زارشاہی روس کا بد دماغ گورا اُدھر اور وکٹورین انگلستان کا خر دماغ گورا ادھر۔ تو علامہ اقبال نے کافی عرصے کے بعد بھی جب حالات نہیں بدلے تھے تو روح محمدؐ سے یہی پوچھا

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

تو مسلمان علی گڑھ جا رہا تھا اور اس وقت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اگر سرسید نہ ہوتے تو برصغیر کا مسلمان بھی پانی بھرنے اور لکڑی چیرنے والے مفتوحین میں شامل ہوتا۔ جن کا تذکرہ انجیل مقدس میں کیا گیا ہے۔ عہد نامہ قدیم غالباً ولادت مسیح سے گیارہ بارہ سو سال قبل لکھا گیا۔ لیکن امن و جنگ، مفتوح اور فاتح کے معاملات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہندستان کا انگریز کلکٹر جب اپنے ضلع کے صدر مقام پر کرسمس کا دربار لگاتا تھا اور ہندو اور مسلمان، عمائدین شہر اس دربار میں حاضر ہوتے تھے تو ان لوگوں میں اور تین چار ہزار سال قبل کے فاتح اور مفتوح کے اعمال اور نفسیات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ برطانوی دور حکومت کے آخری زمانے کے نظارے میری یاد میں محفوظ ہیں۔ کلکٹر جو مشرقی اضلاع میں ڈپٹی کمشنر کہلاتا تھا اس کے بنگلے پر یونین جیک لہرا رہا ہے۔

گورے بچے اپنی بد دماغ آیاؤں کے ہم راہ ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے کے لیے جا رہے ہیں۔ سول لائنز کے نوکر چاکر جو انگریزوں کے یہاں ملازمت کر چکے ہیں ایک پچن انگلش بولنے پر قادر ہیں۔ مجھے وہ منظر بھی اچھی طرح یاد ہے۔ گیس کے ہنڈوں کی روشنی میں ہماری طویل ڈنر ٹیبل پر کھانا تناول کیا جا رہا ہے۔ مہمانوں میں انگریز سول سرجن میجر گیرڈ کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ عبدل جو جون کمپنی کی روایت کے ایک نہایت ثقہ اور نستعلیق بیرے تھے کھانا سرو کر رہے ہیں وہ میجر گیرڈ کے برابر میں آ کر ایک ڈش پیش کرتے ہیں۔ میجر صاحب نفی میں سر ہلاتے ہیں عبدل مودبانہ نیچی آواز میں کہتے ''پھینش''، یعنی فینش۔ یعنی یہ آخری کورس ہے۔ میجر صاحب یہ سن کر فوراً ڈش میں سے جو چیز بھی پیش کی گئی ہے نکال لیتے ہیں۔

میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ برطانیہ، فرانس، ہولینڈ اور بلجیم نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کر کے یہاں چار پانچ سو سال تک حکومت کی لیکن ان میں سب سے زیادہ روشن خیال اور اعتدال پسند حاکم انگریز ثابت ہوئے۔ کیونکہ یہ اٹھارھویں صدی برطانیہ کی آزاد خیالی اور اصول پرستی کے نمایندے تھے۔ چنانچہ برطانیہ کی نو آبادیوں میں بھی انگریز حکمرانوں نے اس بربریت اور درندگی کا مظاہرہ نہیں کیا جو دوسری نو آبادیوں میں اکثر رونما ہوا۔ سب سے افسوس ناک بات یہ تھی کہ دوسری یوروپین حکمراں ممالک نے اپنی نو آبادیوں کے عوام کو قصداً جاہل رکھا جب انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندستان میں انگریزی تعلیم حاصل کر کے وہاں کی خواص و عوام کہیں سے کہیں نکل گئے اور جوش و خروش سے آزادی کا مطالبہ کرنے لگے تو انھوں نے سوچا کہ ہم کتنے عقل مند تھے کہ ہم نے اپنی افریقی اور ایشیائی اقوام کو ان پڑھ رکھا۔

اس نوع آبادیاتی نظام کے تحت ایشیا اور شمالی افریقہ میں ایک نیا تعلیم یافتہ روشن خیال طبقہ پیدا ہوا۔ یورپ کا یہ نو آبادیاتی نظام کتنا مستحکم اور کتنا عالمگیر تھا۔ اس کا اندازہ مجھے امریکا میں نیو انگلینڈ کے چند پرانے امرا کے مکانات میں جا کر ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں اچانک غازی پور کی سول لائنز کی ایک کوٹھی میں پہنچ گئی ہوں۔ ایسی ہمہ گیر عالمی تہذیب قرون وسطیٰ میں سلطنت روم کے خاتمے کے بعد اندلس کے عربوں نے تخلیق کی تھی ان کا مذہب بدل گیا وہ السید سے Elcid

(السنڈ) بن گئے۔ واللہ کے نعرے کو انھوں نے اولے اُولے میں تبدیل کیا۔ مگر وہ عرب اسلامی تمدن اپنا شاندار اور ایسا دیرپا تھا کہ وہ ایک دوسرے چولے میں آج تک موجود ہے۔ اور ہم جیسوں کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ان کے مکانوں کے صحن مشرقی آنگن ہیں۔ دیہات میں عورتیں اپنا مینٹلا اس طرح اوڑھتی ہیں کہ نقاب یا دوپٹے کی طرح ان کا آدھا چہرہ اس میں چھپ جاتا ہے۔ تب میں نے سوچا کہ اللہ میاں اتنے بے نیاز کیوں ہیں کہ اتنی عظیم الشان مسلمان ملک کی انھوں نے کایا پلٹ کردی۔ توحید پر یقین رکھنے والوں کو ایک ہلّے میں تثلیث کا پجاری کیوں بنا دیا۔ مساجد میں گرجا گھر کیوں قائم ہوئے اور وہ بھی ایک بت پرست ملک، کیوں___ جدھر دیکھیے عیسیٰ و مریم کے مجسمے۔ تو معلوم یہ ہوا کہ اللہ میاں بے نیاز ہے۔ اسپین کو کھونے کا ذمہ دار مسلمان خود تھے۔ وہ آپس میں کیوں لڑے۔ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں اپنی تباہی و بربادی کے انتظام واہتمام انھوں نے خود کیے۔

ضلع بجنور میں عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مستقر تاج پور کہلاتا ہے۔ یہاں کے کنور سیام سنگھ وغیرہ کا تذکرہ میں پہلے کر چکی ہوں۔ جو 1857 میں راقم الحروف کے اجداد کے خلاف انگریزوں کے حلیف کے طور پر لڑے تھے اور بہ طور سزا ہمارے پردادا میر احمد علی کو پھانسی کی سزا کا حکم دیا گیا تھا اور دوسرے صاحبان کو راجا کا خطاب مع جاگیر عطا کیا گیا۔ یہ ڈراما ہندستان میں جگہ جگہ کھیلا گیا۔ ہر موقع پر مسلمان گھاٹے میں رہا۔ مارا گیا یا کالے پانی بھیجا گیا۔ لیکن تاریخ کی بوالعجبی یہ ہے کہ اسی مسلمان کو انگریز کا پرستار، وفادار اور حلیف سمجھا گیا۔ اس پر علی گڑھ تحریک نے جو ایک قطعی ناگزیر تحریک تھی من حیث القوم مسلمانوں کی نیا کو ڈوبنے سے بچایا۔ لہٰذا میں اس پیارے بوڑھے سر سید احمد خاں کو بے شک اس ڈگمگاتے ہوئے سفینے کا ناخدا مانتی ہوں۔

آپ اس فرتے کی قوم کی مایوسی، بے چارگی اور شکستہ دلی کا آج اندازہ ہی نہیں کر سکتے جو اس وقت 1857 میں ہارے ہوئے مسلمانوں کی حالت تھی۔ محض نوے سال ہندستان پر باضابطہ حکومت کرنے والے انگریزوں کو انگلستان میں دیکھا ہے جو اپنی آخری عمر میں وہاں چھوٹے موٹے کام کرتے تھے اور اپنی عظمت رفتہ کو یاد کر کے آہیں بھرتے تھے۔ میں یہ بھی تذکرہ

کر چکی ہوں کہ کیمبرج کے ایک مختصر پروگرام کے دوران ایک روز ایک بڑے میاں نے مجھے مخاطب کیا۔ وہ وہاں ایک معمولی اہل کار کی حیثیت سے مہمانوں کو چائے پیش کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ بمبئی پریسی ڈنسی کے گورنر رہ چکے تھے تب مجھے خیال آیا کہ بھئی تم تو یہاں چائے پلانے کی خدمت پر معمور ہو تمھارے بزرگوں نے تو ہمارے شہزادوں سے دلی کی سڑکوں پر جھاڑو دلوائی۔ لیکن یہ تاریخ کے ایسے فٹ نوٹ ہیں جنھیں کوئی یاد نہیں رکھتا۔ ہمارے ایک دوست جو امریکا میں رہتے ہیں اپنے جد امجد بہادر شاہ ظفر سے حیرت انگیز طور پر مشابہت رکھتے ہیں۔ لیکن Jeans کی اس بھول بھلیاں میں سیاسی طاقت کا ہم سفر رہنا ضروری ہے ورنہ درایں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ میں تاریخی تسلسل کو اہم سمجھتی ہوں۔ عام طور پر اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن جن افراد کے یہاں ایک سنس آف ہسٹری موجود ہے وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ کم تعداد والے فرقوں میں یہ احساس اس لیے موجود رہتا ہے کہ وہ ان کی اقلیتی حیثیت کی تلافی کرتا ہے چنانچہ سکھوں میں اور ان سے بھی زیادہ پارسیوں میں یہ احساس شدت سے موجود ہے۔ پارسیوں نے بالخصوص اپنے ناموں کے ذریعے یہ رشتہ ایران قدیم سے بخوبی استوار کر رکھا ہے اور اس رشتے کا احساس کتنا شدید ہے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب بمبئی میں وارڈن روڈ پر ایرانی اسٹور کے مالک رستم جی نے چندے کا ڈبہ میرے سامنے بچشم پرنم کھنکایا۔ ایران میں خوف ناک زلزلہ آیا تھا اور رستم جی جو گجراتی بولتا تھا اور اس کا کوئی تعلق ایران سے نہیں تھا وہ یہاں اپنی دوکان کے کاؤنٹر پہ بیٹھا رو رہا تھا۔ اہل ایران کی یہ وطن پرستی فردوسی تو خیر اجاگر کر ہی گئے مگر وہ آج تک ایسی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ میں نے پہلے کہیں ذکر کیا ہے کہ میں شہ بانو فرح پہلوی کے ہمراہ ان کے چھوٹے طیارے پر کہیں جا رہی تھی نیچے ایران کی خشک بے آب و گیاہ زمین، جابہ جا گڑھے اس میں موجود تھے۔ شہ بانو اس ویرانے کو بڑے ہی پیار سے تکتی رہیں پھر مجھ سے پوچھا ایسے حسین مناظر تمھارے یہاں بھی موجود ہیں۔ میں نے مختصراً ہاں کہنے پر اکتفا کیا۔

اس کلیات کا تذکرہ کرنے سے پہلے میں پھر دہرادوں کہ مجھے اپنے متعلق کچھ لکھنا بہت ہی مخجل کرتا ہے۔ میں اور میرا فن قسم کی کوئی طمطراق کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے بقراطی نقادوں

والی اور عالمانہ فصیح و بلیغ تحریر میرے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ جس کلچر میں میں نے جنم لیا وہ لکھنے پڑھنے کی کلچر تھی۔ تختی پر بچوں سے لکھوایا جاتا تھا۔ قلم گوید کہ من شاہِ جہانم۔ پرانے خاندانوں میں آتو جی اور مغلانی بی اندر اور منشی جی باہر مردانے میں کاغذ قلم سنبھالے بیٹھے رہتے تھے وہ ایک حیرت انگیز ادب پرست اور علم پرست معاشرہ تھا۔ اردو رسائل اور اخبارات کی ریل پیل، مشاعرے، ادبی محفلیں بچوں کے لیے بیت بازی کے مقابلے، ریڈیو کی آمد نے فنِ تحریر میں فنِ تقریر کا اضافہ کیا۔ ریڈیو کی زبان زیادہ تر اردو تھی۔ سبھا کے بجائے مجلس اور نمسکار کے بجائے آداب عرض مستعمل تھا۔ بچوں کے پروگرام میں آپا جان اور عورتوں کا پروگرام باجی پیش کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد اس میں سبھا اور دیدی کا اضافہ کیا گیا۔ بخاری برادران اے آئی آر کے کرتا دھرتا تھے۔ علاوہ ازیں اکثریتی فرقے کے افراد کی تہذیبی زبان بھی اردو تھی۔ ہمارے بچپن میں ریڈیو کے یہ صداکار ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ تقریر یا ٹاک کرنے والوں کو مدعو کرنے کے لیے خود اسٹیشن ڈائرکٹر گھر پر آتے تھے۔ چنانچہ میں جب بھی ریڈیو اسٹیشن کی کار برساتی میں کھڑی دیکھتی تو میں سمجھ جاتی کہ جگل کشور مہرہ صاحب ابا جان کو ٹاک کے لیے بلانے آئے ہیں۔ اگر بچوں کا پروگرام اُسی روز ہوتا تو میں بھی اکثر ساتھ جاتی اور والد مرحوم کی پذیرائی کے لیے مہرہ صاحب برآمدے میں پہلے سے موجود ہوتے۔ وہ ایک طویل القامت خوش پوش آدمی تھے اور لاہور کے امتیاز علی تاج، پطرس بخاری وغیرہ کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مہرہ صاحب کا معاملہ بھی عجیب رہا۔ اس زمانے میں بمبئی کی فلم انڈسٹری کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کا سلسلہ بھی ایک خاص رومانس اور گلیمر کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ ''انڈین لس نر'' اور ''آواز'' میں ان صداکاروں کی تصویریں چھپتیں مجھے اپنے بچپن کی ایک یاد یہ بھی ہے کہ ''انڈین لسنر'' کے ایک صفحے پر ''بے بی'' نور جہاں ناک میں بڑی سی نتھ پہنے طنبورہ لیے۔ (میرس کالج لکھنؤ میں طنبورہ، تان پورہ بھی کہلاتا تھا لیکن ماسٹر سورج بخش سری واستوا سے طنبورہ ہی کہتے تھے) بیٹھی ہیں۔ یہ ریڈیو سنگرز بھی اس زمانے کے لیے بڑی افسانوی ہستیاں تھیں۔ علاوہ ازیں مشہور فلم اسٹارز کو ریڈیائی ڈراما کے لیے بلایا جاتا۔ جہاں آرا کجن جو ایک صف اول کی اداکار اور گائیکا تھیں کلکتہ سے لکھنؤ بلائی گئی

تھیں۔ جہاں انھوں نے ایک ریڈیو اوپیرا شاید "لالہ رخ" میں گایا تھا۔ اعلا ادب پارے، اچھی میوزک، بہترین دل پذیر اردو اس زمانے کی نشریات کی خصوصیت تھی۔ ہم اطفال اور بچہ پارٹی کو ان معاملات کی کچھ خبر تھی نہ یہ ہماری سمجھ میں آسکتے تھے۔ لیکن یقیناً یہ بھی رومانٹک معاملات کا ایک دور رہا ہوگا۔ بہت بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ جگل کشور مہرہ صاحب کی کار ہر ہفتے لاہور سے امرت سر جاتی تھی جہاں سے انور بائی اپنے پروگرام کے لیے اس کار میں لاہور تشریف لاتی تھیں۔ آزادی کے فوراً بعد جگل کشور مہرہ نے مسلمان ہوکر انور بائی سے نکاح کیا اور ان کے ساتھ اسکاٹ لینڈ چلے گئے۔ میر صاحب نے تو قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھے کب کا ترک اسلام کیا۔ مہرہ صاحب نے چھاپ تلک سب چھوڑی اور شیخ احمد سلمان بن گئے۔ اسکاٹ لینڈ میں انور بائی کے ایک داماد نے قالین کا بڑا کاروبار شروع کیا اور ان کی ہی بیٹی نے فلم کی ہیروئن کی حیثیت سے چند روزہ مقبولیت حاصل کی۔ انور بائی کے داماد نے جو قالین فروش ہیں اسکاٹ لینڈ میں ایک خستہ حال لارڈ کی ریاست خرید لی اور اب وہ لیڈی آف دی مینور (Manor) کی حیثیت سے وہاں رہتی ہیں۔ چنانچہ کہاں امرت سر اور کہاں اسکاٹ لینڈ۔ جب انسانوں کی زندگی میں انقلابات آتے ہیں تو اسی طرح آتے ہیں۔ وہ جہاز جو سنہ 1947 میں آزادی کے کچھ عرصے بعد بمبئی سے انگلستان روانہ ہوا اس کے مسافروں کی فہرست میں چند نام یہ بھی شامل تھے۔ عطیہ حبیب اللہ، آل حسن، فیروز حبیب، گوہر سلطان، حفیظ جاوید یہ سب بی بی سی کے اردو سیکشن میں ملازم ہوکر عازم انگلستان تھے۔ اب دیکھیے ان کے مستقبل نے فرداً فرداً ان کے ساتھ کیا کیا۔ عطیہ جو ہندستان کی حسین ترین خواتین میں شامل تھیں عرصہ دراز تک لندن میں رہیں ان کے بچوں نے وہیں تعلیم حاصل کی وہ ریڈیو سے اردو پروگرام نشر کرتی رہیں۔ ان کے شوہر سمیع ہر دوسرے تیسرے مہینے لکھنؤ سے لندن آجاتے عطیہ نے لندن میں ایک انگریزی ناول لکھا جو وہاں سے شایع بھی ہوا۔ وہ لندن کے اعلیٰ ترین انگریز طبقے میں شامل رہیں۔ بی بی سی سے ہر ہفتے عورتوں کا پروگرام نشر کرتیں۔ وہ ایک بہت ہی غیر معمولی قسم کی خاتون تھیں حسن، ذہانت، مقبولیت اللہ میاں نے کسی معاملے میں ان کے ساتھ کنجوسی نہیں کی تھی۔ لیکن ان سارے اوصاف کے باوجود وہ ایک

بہت ہی سیدھی سادھی اور نارمل قسم کی خاتون تھیں۔ وہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھیں جو اپنے اوپر خاکساری کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں یعنی یہ کہ ہم تو ہیں بہت اعلیٰ و ارفع لیکن بہ وجہ کسر نفسی آپ سے بہت جھک کر مل رہے ہیں۔ عطیہ کے یہاں نہ تصنع تھا نہ غرور۔ ایک بہت طویل مدت لندن میں گذارنے کے بعد وہ انڈیا واپس آئیں اور وارڈن روڈ پر راقم الحروف کے پڑوس میں فلیٹ لیا۔ ان کے جواں سال بھائی کی موت نے ان کو بہت ہی غم زدہ کر دیا تھا میں نے ان کے متعلق ایک مضمون خدا حافظ عطیہ لکھا تھا جواب مجھے یاد نہیں یہاں کس رسالے میں شائع ہوا کچھ عرصے بعد جب لاہور میں اعجاز حسین بٹالوی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس مضمون کا تذکرہ کیا۔ میں نے تعجب سے پوچھا وہ مضمون تو انڈیا میں چھپا تھا تم نے کیسے پڑھا۔ اعجاز نے حسب معمول اپنی شان استغنا سے جواب دیا ہم سب خبریں رکھتے ہیں۔

اعجاز ایک نہایت کامیاب، مطمئن اور مسرور انسان تھے۔ ایسے افراد کے لیے ان کی نو عمری میں لکھا جاتا ہے ینگ مین موسٹ لائیکلی ٹو سکسیڈ۔ اعجاز باتوں کے بادشاہ تھے۔ فن گفتگو کے ماہر۔ یہی خصوصیت ان کے بڑے بھائی عاشق حسین بٹالوی میں بھی موجود تھی۔ جب میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' شائع ہوا اعجاز نے اس پر تبصرہ کیا۔ مجھے یاد نہیں وہ لاہور کے کس رسالے میں چھپا تھا۔ اعجاز نے اس مضمون میں لکھا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن جب انگلستان واپس گئیں اپنی زبان قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے لیے چھوڑ گئیں۔ اپنے اس تبصرے جس کی وجہ سے وہ ذرا جھینپے ہوئے سے تھے حالانکہ میں نے ان کے اس تبصرے کا قطعی برا نہیں مانا تھا۔ اعجاز سے میری ملاقات بی بی سی میں برابر ہوتی رہی۔ حس مزاح اعجاز کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ جب میں ہندستان واپس آئی تو کچھ عرصے بعد ان کا ایک مختصر سا خط مجھے ملا اس میں لکھا تھا 'قرۃ العین حیدر تم جہاں کہیں بھی ہو واپس آجاؤ۔ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔' مرحوم کی بیگم فلاحت اور ایک بیٹا لاہور میں ہے اور ایک بیٹا امریکا میں رہتا ہے۔

تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ آدمی کتنا ہی کامران، خوش باش، مطمئن اپنی زندگی سے رہا

ہو جانا اس کو بھی ہے۔ ہماری دوست کملانے بڑی پتے کی بات کہی تھی کہ جو بندہ بہت دکھی زندگی گزار کے جارہا ہوا سے کم سے کم یہ غم تو نہیں ہوتا کہ ہائے میں کیسی دلچسپ اور پرلطف دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔ لیکن بالکل آخری وقت میں انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ محض وہی جانتا ہے۔ اور پھر مر جاتا ہے۔ بی بی سی کا وہ گروہ کس قدر خوش باش اور بے فکرا گروپ تھا۔ اپنی دنیا ان کے قدموں میں بکھری ہوئی تھی اور وہ مزید فتح مندیوں کے لیے تیار تھے صدیق احمد صدیقی جو چچا کہلاتے تھے اس ٹکڑی کے گویا گرو تھے۔ کتنے ذہین کیسی پرلطف باتیں کرنے والے کیسے شفیق اور خلیق۔ تقی احمد سید جو راقم الحروف کے رشتے دار تھے بے حد سنجیدہ مفکر، دانش ور۔ یاور عباس جو خانوادہ میر انیس کے ایک فرد ہیں بہ یک وقت سنجیدہ اور بشاش، ایک صاحب نور محمد چوہان بھی تھے وہ اس ارادے سے انگلستان آئے تھے کہ ملکہ الزبتھ کو اردو پڑھائیں گے ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا لیکن بی بی سی میں جگہ مل گئی۔ ایک عیسائی خاتون سے شادی کرکے خود بھی یسوع مسیح کے دین میں شامل ہو گئے تھے لیکن ہمیشہ جناح کیپ پہنتے تھے۔ تقی سید، چچا صدیق اللہ کو پیارے ہوئے، عطیہ بھی گئیں۔ اب سوچئے پرانی قدیم یونان وروم کی روغنی تصاویر میں جو گروپ نظر آتے ہیں وہ بھی تو ہماری ہی طرح کے انسان رہے ہوں گے۔ اور جب وہ تصویریں پینٹ کرنے کے بعد مصور انھیں دکھاتا ہوگا تو وہ بھی اسی طرح باتیں کرتے ہوں گے۔ اوہو میری ناک کتنی خراب لگ رہی ہے۔ اوکسٹس بے وقوف معلوم ہو رہا ہے۔ فلورا بڑی شان سے بیٹھی ہے اور ذرا ان کو دیکھنا یہ کون صاحب ہیں اترونے وغیرہ وغیرہ۔ آخر پچھلی صدیوں کے لوگ بھی تو ہماری ہی طرح ہنستے بولتے، روتے گاتے، کھاتے پیتے ہوں گے، وہ سب غائب ہوتے چلے گئے۔ لندن کے ایک میوزیم میں ڈمی یعنی پتلے مختلف زمانوں کی پوشاک میں ملبوس دکھائے گئے ہیں ہمارے یہاں اس طرح کے میوزیم ناپید ہیں۔ کیوں نہیں بنائے گئے۔ جبکہ ہمارے ملک میں طرز حیات ملبوسات اور سامان آرائش کے تنوع کا شمار ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے میوزیم میں ایک بڑا کمرہ سترھویں صدی کے سامان سے سجایا گیا ہے۔ تماشائی اوپر جا کر چوگرد گیلری میں سے نیچے اس کمرے کو دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی میں نے امریکا کے ایک میوزیم میں ایک پرانے خاندان کا سامان سجا ہوا

دیکھا جس میں دادی اماں کی ٹینک بھی ایک بائبل کے اوپر رکھی تھی۔ اگر ہمارے یہاں ماضی کی بازیافت کی جائے تو اس میں بھی ہندو مسلم جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ یہ چیز مغلوں نے کہاں بنائی یہ تو ہمارے یہاں اشوک کے زمانے سے ہے۔ یہ دیکھیے اہل ہنود کہتے ہیں فلاں چیز مہاراجا اشوک کے یہاں بھی تھی۔ نہیں بھئی! یہ تو ہمارے بزرگ ایران سے لائے تھے۔ اس الواغو چن کے لیے کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کی تعلیم بھی گنجلک اور پریشان کن ہوتی جارہی ہے۔ نجی سامان میں زیادہ تر چیزیں کے نام ہمارے یہاں ترکی اور فارسی سے آئے ہیں مثلاً تکیہ، توشک، لحاف، چادر، کرسی، قلم، قالین، غالیچہ، گلدان، پیالہ، طشتری، طشت، دیگ، دیگچی، کتاب، ایلچی، دربان، دروازہ، فرش، نمک، نمک دان، روشن دان، روشنی، بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو ترکی فارسی اور عربی سے آئے ہیں اور جن میں متبادل الفاظ مفید ہیں، عدالت، وکیل، چپوراست کرنے والا یعنی لیفٹ رائٹ کرنے والا سپاہی چپراسی بن گیا۔

فراق صاحب نے ایک بار مجھ سے کہا تھا پریشانی کی بات یہ ہے کہ زبان کو گنوارو کر دیا گیا ہے۔ اور یہ بات بالکل درست ہے۔ کیا کوئی انگریز یہ برداشت کرے گا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے لہجے کو لندن کے کوکنی (Cockney) زبان میں ڈھال دیا جائے اور کہا جائے کہ جمہوریت کا تقاضا یہی ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ایک شام جو رسالہ ادیب دہلی میں شایع ہوا تھا جس کے متعلق میں لکھ چکی ہوں کہ جب میں نے اسے لکھ کر چچا مشتاق احمد زاہدی کو سنایا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم اس کو اپنے نام سے نہ چھپواؤ کوئی مانے گا نہیں کہ اتنی کم سن لڑکی نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ اس کے لیے کوئی فرضی نام سوچ لو۔ چنانچہ میں نے لالہ رخ رکھا۔ کیونکہ لکھنؤ ریڈیو سے ایک اُوپلا اسی عنوان کے ساتھ نشر کیا گیا تھا لیکن یہ افسانہ چھپنے کے بعد میری ہمت بندھی اور میں نے دوسرا افسانہ ''یہ باتیں'' اپنے نام سے لکھا اور ہمایوں میں بھیجا اور وہ بھی چھپ گیا۔ اس کے بعد میں نے

مزید کہانیاں لکھیں، کوئی بھی کسی ایڈیٹر نے واپس نہیں کیں اور سب چھپتی چلی گئیں۔ ہم لوگ اس زمانے میں یلدرم کے انتقال کے بعد لکھنؤ سے آکر قرول باغ دہلی میں چچا مشتاق احمد زاہدی کے یہاں پارک سائڈ نارتھ میں مقیم تھے وہاں ایک روز نیرنگ خیال کے ایڈیٹر حکیم یوسف حسن صاحب والدہ سے ملنے کے لیے تشریف لائے انھوں نے مجھ سے کہا۔ اب قلم تمھارے ہاتھ میں آیا ہے تم لکھو میں نے فرماں برداری سے جواب دیا۔ جی بہت اچھا۔ ضرور لکھیں گے۔ پھر میں نے ایک افسانہ بعنوان ''یہ لوگ'' حکیم صاحب کو لاہور بھیجا اس زمانے میں نیرنگ خیال کی حالت دیگر گوں تھی بعد میں معلوم ہوا کہ وہ رسالہ ہی نہیں چھپا اور میرا افسانہ یہ لوگ بھی اسی افراتفری میں غتر بود ہو گیا۔ میں نے اس وقت سے لے کر آج تک اپنی کسی تحریر کی نقل اپنے پاس نہیں رکھی لہٰذا وہ افسانہ کہاں ملتا۔ لیکن بعد ازاں مختلف رسالوں میں افسانے چھپتے رہے اور ان اولین زمانے میں بھی کوئی افسانہ واپس نہیں آیا۔

شاہد احمد دہلوی نے ایک افسانہ ''دیودار کے درخت'' شامل کر کے اپنے اداریے میں بہ طور خاص اس کا ذکر کیا۔ اور لکھا۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مختلف ماہ ناموں میں افسانے چھپنے لگے۔ عین اُسی زمانے میں لکھنؤ کی دو بہنیں ہاجرہ اور خدیجہ بھی لکھ رہی تھیں لیکن اُن کے افسانوں کا پس منظر بالکل مختلف تھا وہ دونوں بہنیں ترقی پسندوں کے زمرے میں شامل تھیں جبکہ میرے اوپر بہ طور ایک رجعت پسند، لعن طعن شروع ہو گئی، وہ زمانہ بائیں بازو کی شدت پسندی کا تھا لہٰذا ان سب نے مل کر مجھے نشانہ بنایا۔ لیکن یہ ساری لے دے بہ وجہ کم عقلی و بے پرواہی میرے اوپر سے گذر گئی۔ ''ستاروں سے آگے'' میں نے کس طرح لکھا وہ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں اپنی والدہ کے ہمراہ والدہ کے کزن کے قلعہ محمود پور سے سری ریلوے اسٹیشن آرہے تھے۔ تاروں کی چھاؤں میں بیل گاڑی کا یہ سفر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہندو گاڑی بان ان بیگمات کو بوبو کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ مجھے یہ بہت اچھا لگا۔ یہ ایک بڑی دلآویز

سہانی تہذیب تھی۔ اسی فیوڈل کلچر پر عین اسی زمانے میں ترقی پسند ادیب زور و شور سے تنقید کر رہے تھے۔ مگر مجھے یہ سارے انسان نواب زادے اور کسان اور میراثی اور گاڑی بان سب بہت اچھے لگے کیونکہ یہ سب رنگا رنگ انسان تھے۔ ابھی مجھ میں اس سماجی منظر کا مارکسی تجزیہ کرنے کی نہ صلاحیت تھی نہ فرصت۔ مجھے تو یہ سارا نظارہ ایک وسیع و عریض سطح پر برش اور پینٹ سے تیار کیا ہوا فرسکو لگا ___ بہلی (بیل گاڑی) کے اسی سفر کی یاد میں، میں نے افسانہ ''ستاروں سے آگے'' لکھا ___

''ارادے'' میں بھی کالج کا پس منظر شامل ہے۔ ''دیوار کے درخت'' المورڑہ اور نینی تال کے ماحول کا عکاس ہے۔ جاننا چاہیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندستان کے مختلف علاقوں میں اپنے زیر سایہ ایک انڈو یوروپین معاشرہ تخلیق کیا تھا۔ مشرق اور مغرب کے اس تصادم میں مغرب جیت گیا تھا اور اہل مشرق ہارے ہوئے پس ماندہ اور احساس محروی سے چور ___ فاتح مغرب کے بہت ہی غیر مساوی پارٹنر تھے ان کے اعلا طبقے نے گورے آقاؤں کی تہذیب اپنائی تھی۔ جس طرح شمالی افریقہ سے لے کر مغربی ایشیا تک کولونیل آقاؤں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ جب میں نے سابقہ سوویت یونین کی وسط ایشیائی جمہوریتوں کی سیر کی تو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دالگا سے گنگا تلک ایک سا کولونیل معاشرہ وجود میں آچکا تھا۔ اگر سمرقند و بخارا پر سینٹ پیٹرز برگ کے روسیوں کا تسلط تھا اور بے چارے وسط ایشیائی مسلمان گورے خردماغ، زارشاہی روسیوں کے زیرنگیں تھے تو ہندستان شرق اوسط، شمالی افریقہ ادھر اور انڈونیشیا اُدھر سب کے سب کالے، پیلے، سانولے بیٹو لوگ گورے آقاؤں کے غلام بن چکے تھے۔ اور ان گورے آقاؤں نے اپنی زیرنگیں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے اپنی گویا برتر اور طاقت ور تہذیب کی دھاک بٹھادی تھی۔ نیم مستور ترکی حوریں مسند پر نیم دراز پاشا، حبشی غلام اس نئے کولونیل منظرنامے کے خاص کردار تھے۔ استنبول کا ترک ہو یا کلکتے کا بنگالی بابو دونوں یورپین لباس پہن کر اور یورپین اسٹائل سے گھر سجا کر خوش ہوتے تھے لفظ ''ترک'' مغرب میں ظالم اور جابر کا نمائندہ بھی بن چکا تھا۔ اُسی زمانے میں یورپ کی رومانٹک تحریک نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے اس نظارے میں مزید

رنگ بھرے۔ اب مشرقی تہذیب ایک کمتر درجے کی حاشیہ بردار تہذیب سمجھی گئی۔ پاشا عیاشی اور ظلم وستم کا سمبل قرار پایا۔ وکٹورین تہذیب برطانوی سامراج کے بل بوتے پر ایک ایسی عالم گیر طرز زندگی کا وسیلہ بنی جس نے امریکا کی مغربی ریاستوں سے لے کر ہانگ کانگ اور انڈونیشیا تک آدھی دنیا کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا۔

نئی مسلم مڈل کلاس نے ہندستان میں انگلستان کے نچلے متوسط طبقے کے طرز رہائش کی تقلید کی۔ بنگالی بابو نے جو زیادہ خوشحال تھا چونکہ نئے برطانوی ہند میں ترقی کے لیے اُسے گوناگوں مواقع فراہم کر دیے تھے۔ شعبۂ تعلیم، قانون، نظم ونسق، ادب، صحافت، بنگالی بابو تاجر نہیں تھا۔ نوابین بنگالہ کے تین سو سالہ عہد حکومت میں اُسے بہت نستعلیق بنا دیا تھا اس کے برعکس بمبئی اور گجرات روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ جہاں نو کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ منفعت بخش زبان انگریزی، اہل بمبئی کی روزمرہ میں شامل ہو چکی تھی۔ اور واقعہ یہ تھا کہ اگر آپ نے انگریزی پڑھ لی تو سمجھیے دنیا جیت لی۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ کولونیل طاقتوں میں سب سے زیادہ روشن خیال ملک برطانیہ تھا۔ ابھی چند سال قبل ہی جب فرانس نے اپنا تسلط مغربی افریقہ کے چند ممالک سے ختم کیا تو وہاں فرانسیسی زبان جاننے والے محض چند مقامی افراد ہی موجود تھے۔ اس کے برعکس برطانیہ نے ہندستان میں انیسویں صدی ہی میں متعدد یونی ورسٹیاں اور ان گنت کالج قائم کیے۔ سرکاری ادارے مشنری کالج اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی اپنی اپنی درسگاہیں۔ سارے ملک میں تعلیم کا ایک نیٹ ورک پھیل گیا۔ ایسی جاگرتا اور علمی گہما گہمی آپ کو پرتگال ڈچ اور فرانسیسی نو آبادیوں میں نہیں ملے گی۔ انگریزوں کی اس روشن خیالی کی وجہ کیا تھی؟ غالباً ان کی اٹھارھویں صدی کی Age of Reason۔ بے شک انھوں نے آدھے مشرق کو اپنا غلام بنایا لیکن اٹھارھویں صدی سے ہندستان میں بے داری کی جو لہر آئی وہ ان ہی کے ذریعے آئی۔ ہمارے یہاں قوم پرستی کے جوش میں انگریزوں کے اس اہم ترین رول کو تقریباً فراموش کر دیا گیا۔ اور انگریزی راج کو گالیاں دینا قومی فریضہ جانا گیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شیر شاہ سوری اور مغل ایڈمنسٹریشن کے بعد اور ان ہی کی بنیادوں پر قائم کردہ انگریزی نظام حکومت نے ہمیں وہ انتظام وانصرام دیا جس کی

بنیاد پر آج کا ہندستان قائم ہے۔ لیکن تاریخ کی ایک بوالعجبی یا بے انصافی کہیے کہ ماضی کی چند اہم حقائق کو نظر انداز یا فراموش کر دیا جاتا ہے۔ کمپنی بہادر نے مغل انتظامیہ کی بنیاد پر اپنا ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ لیکن چند معاملات جنھیں اس زمانے میں پس پشت ڈال دیا گیا تھا یا شخصی حکومت کی وجہ سے انصاف کا وہ اسٹریم لائن نظام قائم نہ رہ سکا جسے انگریزوں نے اپنے سائنٹی فک طریقوں سے استوار کیا۔ یعنی فرد کی آزادی اور انصاف کے ترازو میں مکمل ہم آہنگی۔ چنانچہ مغل حکومت کو تو انگریزوں نے نہیں بلکہ خود ہمارے بزرگوں نے برباد کیا۔ وہ کیسا زمانہ تھا اور کیسی حکومت تھی کہ دلی میں بادشاہ سلامت موجود ہیں۔ لکھنؤ میں نوابین اور شاہان اودھ جلوہ افروز ہیں لیکن جب ایک عام آدمی کسی ظلم کا شکار ہوتا ہے تو وہ چلا چلا کر فریاد کرتا ہے۔ دہائی ہے کمپنی بہادر کی ___ یعنی سات سمندر پار سے آئے ہوئے تھوڑے سے انگریز اس وسیع و عریض ملک کے کروڑوں باشندوں پر آرام سے حکومت کر رہے ہیں۔ وہ اپنے قلعے بنا رہے ہیں کوٹھیاں تعمیر کر رہے ہیں۔ کالج کھول رہے ہیں اور ہمارا مسلمان بھائی طلسم ہوش ربا پڑھنے میں محو ہے یا مرغ لڑا رہا ہے۔

مسلمانوں کی تہذیب نو سے بے اعتنائی کی وجہ میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔ شاید ایک سبب یہ رہا ہو کہ رسمی مذہب کا تسلط خواص و عوام پر قائم تھا۔

اور آج اس میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے کمی نہیں آئی۔ ٹیلی ویژن نے مذہبی موضوعات پر مناظر گھر گھر پہنچا دیے ہیں۔ ایک ارب آبادی کے اذہان پر ٹیلی ویژن کے جنات مسلط ہیں۔ بچے تین چار سال کی عمر سے ٹیلی ویژن کے عادی ہو جاتے ہیں اب انھیں لکھنے پڑھنے اور کتابوں کی طرف مائل کرنے کی کسے فرصت ہے۔ ایسے مغربی ممالک جہاں کی سو فی صدی آبادی تعلیم یافتہ ہے وہاں ٹیلی ویژن اتنا نقصان دہ نہیں ہے لیکن اس جاہل اور مفلس ملک کے لیے ٹیلی وژن ایک خوف ناک جن کی طرح سایہ فگن ہے ___ ہمارے افلاس زدہ، اَن پڑھ ممالک کے لیے ٹی وی ایک وبا کی صورت میں نازل ہوا ___ یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین۔

___ اس مجموعے کے باقی افسانے چاند باغ یعنی ازابلا تھوبرن کالج، کیلاش ہاسٹل، اور بادشاہ باغ یعنی لکھنؤ یونی ورسٹی کے افسانوی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر فرد کو اپنا

زمانہ طالب علمی ایک سنہرا دور معلوم ہوتا ہے اور راقم الحروف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ قدیم نے تو اولڈ بوائز کی پوری تہذیب تشکیل کر لی۔ میرے خیال میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اور الٰہ آباد یونی ورسٹی اور چند اور درسگاہوں کے علاوہ ایسی منظم برادری سوائے علی گڑھ کے اور کہیں نہیں ملے گی۔ تو میں نے علی گڑھ میں پانچویں کلاس میں شاید پندرہ بیس روز سے زیادہ نہیں پڑھا ہے لیکن میرے خاندان کی ساری لڑکیوں نے وہیں سے اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں اور ان میں سے دو خواتین یعنی عذرا حیدر اور خالدہ حیدر اپنے امتحانات میں ساری یونی ورسٹی میں اول رہیں۔ وہ بھی ایک افسانوی دور تھا جب لڑکیوں کا گریجویٹ ہونا بڑی اہم بات سمجھی جاتی تھی۔ اب تعلیم نسواں اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

میری والدہ مرحومہ بتلایا کرتی تھیں کہ جس زمانے میں والد مرحوم یونی ورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ ایک حیدر آبادی خاتون جن کا نام پاشا صوفی بیگم تھا شاید پرائیوٹ طور پر بی اے کا امتحان دینے علی گڑھ تشریف لائی تھیں۔ اور ہمارے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پرچے کرتی تھیں۔ اور پورے تین گھنٹے تک والدہ مرحومہ بہ طور نگراں اس کمرے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ یعنی ضابطے اور اصول کی پابندی کا کیا عالم تھا کہ نقد دم ایک خاتون پرچہ کر رہی ہے ڈرائنگ روم کے دروازے ہر طرف سے بند ہیں اور نگراں کے طور پر رجسٹرار صاحب کی بیگم اُسی کمرے میں بیٹھی ہیں۔ یہ اصول اور ضابطے کی پابندی اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں کار فرما تھی۔ اضلاع میں ڈالی بھیجنا بھی ایک خاص سوشل فریضہ تھا یعنی ہندستانی اشرافیہ کے اراکین صاحب لوگوں کے بنگلوں پر ڈالی بھیجتے تھے یا لے کر جاتے تھے۔ ڈالی کرسمس دیوالی، ہولی، دسہرے اور عیدین کے زمانے میں ہمارے یہاں بھی آتی تھیں جنھیں باہر سے ہی واپس کر دیا جاتا تھا۔ ان ڈالیوں کے اوپر مصری کے کھلونے بھی رکھے ہوتے تھے۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ چند کھلونے میں بھی چن لوں لیکن ان کو ہاتھ لگانے کا بھی حکم نہیں تھا۔ یہ ڈالیاں رشوت نہیں بلکہ ایک قسم کے تحائف سمجھے جاسکتے تھے۔ لیکن ہم ان سے کبھی مستفید نہ ہوئے۔ اصول پرستی اور راست بازی زندگی کا عام چلن تھا۔ آج کل اس کا اُلٹ ہے۔ اس کی وجوہات بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ معاشرے میں دولت کی فراوانی۔

اصول پرستی اور راست بازی پر اب شاید اتنا زور نہیں دیا جاتا جو پہلے ایک عام طرزِ زندگی میں شامل تھا۔ نام ونمود اور دولت کی نمائش یہ پہلے مفقود تھی۔ تقسیمِ ہند نے جہاں معاشرے کو تہ و بالا کر دیا وہاں مختلف صوبہ جات سے آئے ہوئے لوگ اپنے اپنے رسم ورواج ساتھ لے کر آئے اور مختلف علاقائی تمدن خلط ملط ہو گئے۔ لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم عام ہوئی دفتروں میں عورتیں چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی ملازمت پر معمور ہو گئیں۔ کاروبار اور صنعتوں میں ترقی کے ساتھ ساتھ خواص وعوام کا معیارِ زندگی اونچا ہوتا گیا۔ اور محنت کش طبقے کے افراد کا رہن سہن پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو چکا ہے۔ لڑکیوں میں تعلیم عام ہو گئی۔ لیکن اب لوگ روز بہ روز ایک Consumerist یعنی صارفیت پسند سوسائٹی میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

لیکن اس دور کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ حالانکہ کہ پردے کا رواج ختم ہو چکا تھا۔ اور چند لڑکیاں یونی ورسٹیوں میں مخلوط تعلیم بھی حاصل کر رہی تھیں لیکن اپنے ہم جماعت لڑکوں سے بات نہ کرنا اس دور کا ایک ان کہا قانون تھا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کے لیڈیز روم میں چقیں پڑی رہتی تھیں اور لڑکیاں اپنی اپنی کلاس میں جا کر جس خاموشی سے شرکت کرتی تھیں اُسی طرح واپس آ جاتی تھیں اور ریکارڈ یہ تھا کہ ان لڑکیوں نے اپنے ہم جماعت لڑکوں سے پورے دو سال تک ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ آج کل یہ واقعہ نا قابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔ میری انگلش کلاس میں میرے علاوہ پریم لتا گرو ور بھی شامل تھیں۔ پروفیسروں کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ حاضری لگاتے وقت وہ لڑکیوں کا نام نہیں پکارتے تھے بلکہ ہم دو طالبات کی طرف نظر ڈال کے حاضری لگا دیتے تھے۔

آزادی کے فوراً بعد ماحول بدل گیا۔ لاہور کی شرنارتھی لڑکیاں جن یونی ورسٹی میں شامل ہوئیں ان کی وجہ سے ایک مختلف آزاد خیال کلچر سے اہلِ لکھنؤ متعارف ہوئے۔ معاشرے میں یہ تبدیلیاں بعض مرتبہ اچانک نمودار ہوتی ہیں اور بعض دفعہ رفتہ رفتہ ان کی وجہ سے ماحول میں تبدیلی آتی ہے۔

میرے خیال میں ہندستانی سنیما نے ہمارے معاشرے پر جتنا گہرا، دوررس اثر ڈالا ہے ہم اس کا پوری طرح ابھی تک اندازہ ہی نہیں کر سکے۔ نیو تھیٹر اور بمبئی ٹاکیز کے زنانہ نئے فیشن

کے ملبوسات نے زنانہ پوشاک کو متاثر کیا۔ لیکن لاہور کا خزانچی جو 1941 میں سارے ہندستان میں ریلیز ہوا ایک انقلاب آفریں فلم ثابت ہوا۔ سائیکل سوار لڑکیوں اور لڑکوں کے پرے "ساون کے نظارے ہیں" گاتے ہوئے سارے برصغیر کے تماشائیوں کے ذہنوں پر چھا گئے۔ اب تک سینما کے کلچر پر نیو تھیٹرز کلکتہ یعنی بنگال حاوی تھا۔ یہ ایک مدھم سریلی نہایت مہذب اور محتاط کلچر تھی۔ لاہور کی بے تکلف چاق و چوبند پنجابی طرز زندگی نے اس کلچر کو برطرف کیا یعنی آب آمد تیمم برخاست اب مدھم سروں میں بنگالی دھنوں والے آرکسٹرا کے بجائے ڈھولک کی تھاپ پر پنجابی لوک دھنوں کی بارش شروع ہوئی۔ ماسٹر غلام حیدر اس نئے اسکول کے قائد تھے۔ بنگالی جوتھیکا رائے کے بجائے امراؤ ضیا بیگم اور شمشاد بیگم کے پنجابی لہجے سے معمور گیت سارے ہندستان کی فضاؤں میں گونجنے لگے۔ موسیقی کی اس نئی دولت مشترکہ نے ہندستانی کلچر کو ایک لڑی میں پرودیا مگر اُسی زمانے میں ملک تقسیم ہوا اور یہ لڑی ٹوٹ کر بکھر گئی۔ پاکستانی کلچر کے نئے معماروں نے موسیقی کو بھی تقسیم کرنا چاہا___ پاکستانی موسیقی کے عنوان سے ریڈیو پر نئے پروگرام شروع کیے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ سوویت یونین اور امریکا کے مابین باپ مارے کا بیر ہے۔ لیکن انھوں نے اپنا کلاسیکل موسیقی کا ورثہ جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ بخاری صاحب کہنے لگے جی نہیں ہمیں ہندستان اور پاکستان کے درمیان کلچرل تقسیم کی ایک دیوار کھڑی کرنی ہے۔

بہر حال یہ سب ہوتا رہا اور گانے والے گاتے رہے اور وہی ساز بجا کیے۔ دراصل کلچر کے معاملے میں سیاست کا دخل بڑے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن بقول شخصے چلیں جی ہمیں اس سے کیا لینا دینا جو ہوتا ہے ہونے دو شہر کے اندیشے میں دبلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں___

اس جلد میں 35 افسانے شامل ہیں۔ جن میں بہت سے افسانے ایسے ہیں جو اس سے قبل کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ البتہ رسائل میں شایع ہو چکے تھے۔ اس کتاب کے مرتب جناب ڈاکٹر جمیل اختر صاحب نے انھیں تلاش بسیار کے بعد مختلف رسائل سے حاصل کیا ہے۔ بہت سے رسالے ایسے ہیں جو کب کے بند ہو چکے ہیں۔ اور ہندستان کے چند کتب خانوں میں ہی ان کے فائل موجود ہیں۔ چنانچہ میں سمجھتی ہوں کہ فاضل مرتب نے یہ کام بڑی محنت اور

جستجو کے ساتھ کیا ہے جس کے لیے وہ لائق تحسین ہیں۔ ایسے افسانے تعداد میں تقریباً ستائس (۲۷) ہیں اور ان کی تلاش میں جمیل اختر صاحب نے پاکستان کا سفر بھی کیا۔ وہاں جن اداروں اور افراد نے ان کی اعانت کی میں ان کی بھی ممنون ہوں۔

میں نے اپنے بارے میں مضمون نہ خود لکھے نہ لکھوائے جس نے جو لکھ دیا لکھ دیا۔ یہاں میں یہ بھی کہتی چلوں کہ ہمارے فکشن کے ناقدین ناچیز کے ناولوں کے بارے میں تو لکھ لیتے ہیں لیکن افسانوں کو انھوں نے تقریباً نظر انداز کر رکھا ہے۔ میرے افسانوں پر غالباً پہلا اور بہت بالتفصیل مضمون ممتاز شیریں مرحومہ نے لکھا تھا۔ اس کے بعد احمد ندیم قاسمی نے شاید میرے بھی صنم خانے پر اپنا گرانقدر مضمون تحریر فرمایا ان کے علاوہ شمیم حنفی، محمود فاروقی، ابوالکلام قاسمی، دیوندر اسر، عقیل رضوی، محمود ہاشمی، انتظار حسین، رضی عابدی، نثار عزیز بٹ، سہیل احمد خاں، ڈاکٹر عبد المغنی سراج منیر مرحوم وغیرہ۔ سارے نام سر دست یاد نہیں اور ان کو لکھنا مشکل ہے لیکن وہ سب اہل قلم اس ناچیز کے دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے لیے جمیل اختر صاحب بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے بڑی کاوش سے مختلف کتب خانوں میں جا کر افسانے جمع کیے اور انھیں ترتیب دیا۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بھی نا مناسب نہیں ہوگا کہ فی الوقت اردو کے سلسلے میں جتنا کام جانفشانی اور دلسوزی کے ساتھ بہار میں کیا جا رہا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے اور اس کے پھلنے پھولنے کے بیشتر مواقع وہاں موجود ہیں۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے میری کلیات مرتب کرنے کا پراجیکٹ جناب جمیل اختر صاحب کو مرحمت فرمایا۔ اس سلسلے میں جمیل اختر کا انتخاب بے حد مناسب تھا۔ انھوں نے مجھ پر اپنی پی ایچ ڈی کا کام بھی کیا ہے۔ اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نے انھیں "قرۃ العین حیدر کے فکشن کا تنقیدی مطالعہ" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند بھی تفویض کی ہے۔ چونکہ انھوں نے تحقیقی کام کیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو ریسرچ کی

اس سے بہت سی نئی چیزیں بھی دریافت کیں۔ میرے بہت سے گم شدہ افسانے، انٹرویوز، خاکے، مضامین، بچوں کی کہانیاں اور مجھ پر لکھے گئے سیکڑوں تنقیدی مضامین خود میرے علم میں بھی یہ سب چیزیں نہیں تھیں۔ انھوں نے 2002 میں میرے انٹرویوز کا ایک مجموعہ بھی "نوائے سروش" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ اور خود بھی مجھ سے طویل ترین گفتگو کی ہے جو کتابی صورت میں "انداز بیاں اور" کے نام سے 2005 میں شائع ہوئی ہے اور اب یہ کلیات۔ لہٰذا ان کی دریافت نے کلیات کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ نئے دریافت شدہ افسانوں کو شامل کر کے۔ دیگر صورتوں میں شاید یہ ممکن نہ ہوسکتا۔

قرۃ العین حیدر

20 مئی 2005
ای 55 سیکٹر 21
نوئیڈا۔ یوپی

(پیش لفظ 'آئینۂ جہاں' مرتبہ جمیل اختر جو قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولٹ کی کلیات ہے، میں شامل ہے۔)

گذشتہ برسوں کی برف

نذر سجاد حیدر کے تعارف سے پہلے میں ان کے معاشرتی پس منظر کا تذکرہ ضروری سمجھتی ہوں۔ دورِ حاضر میں ہمارے مشہور و معروف ناقدین کی ادبی بصیرت اور علمیت پر ان کا اپنا احساسِ برتری اِس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ہمارے ایک جید نقاد نے اُردو میں خواتین کے لکھے ہوئے ادب کو ادنیٰ درجہ کا ادب بتایا۔ دوسرے ناقد نے جو بے حد بائیں بازو کے ترقی پسند بھی ہیں، نذر سجاد حیدر کے ادب کے لیے محض ایک جملہ تحریر کیا اور وہ بھی نامکمل کہ موصوفہ نے لکھنے کی کوششیں...... اور یہ انھوں نے ایک ایسی مصنفہ کے متعلق لکھا جس نے سب سے پہلے اُردو میں بچوں کے طبع زاد کہانیاں تحریر کیں جو دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے 1910 عیسوی سے قبل شایع ہو کر بے حد مقبول ہوئیں۔ سلیم کی کہانی، دکھ بھری کہانی، پھولوں کا ہار، ننھی رضیہ اور اس کی بکری وغیرہ۔ 1910 عیسوی میں سال بھر تک ہفتہ وار اخبار پھول کی باقاعدہ ایڈیٹر رہیں جس وقت ان کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن وہ زمانہ پبلی سٹی اور پبلک ریلیشنز کا نہیں تھا۔ چنانچہ مس نذر الباقر کی اس صحافتی پیش قدمی کا کوئی تذکرہ کبھی کیا ہی نہیں گیا مگر بیش تر اُردو مصنفین، ناقدین اور قارئین اُردو میں لکھنے والی نثر نگار خواتین کے وجود ہی سے ناآشنا ہیں۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اچانک مس حجاب اسماعیل کی دھوم مچی لیکن اُن سے قبل نذر سجاد حیدر اُردو کے بیش تر اہم ترین رسالوں میں بھی خوب خوب لکھ رہی تھیں۔ افسانوں کے علاوہ اُن کے ناول بھی بہت مقبول تھے۔ نذر سجاد حیدر سے زیادہ مشہور و مقبول ان کی پھوپی اکبری بیگم (والدۂ افضل علی) تھیں۔ اُن کے ناول ''گودڑ کا لال'' نے ایک اسطوری حیثیت اختیار کر لی تھی اور یہ ناول غالباً 1910 عیسوی سے پہلے لاہور سے شایع ہوا تھا لیکن ہمارے یہاں اُردو فکشن پر ریسرچ بھی بہت ہی رواداری میں کی جاتی ہے۔ لہٰذا اِس ناول کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا۔ نذر سجاد حیدر نے سودیشی تحریک کے زمانے میں ایک سیاسی ناول ''مذہب اور عشق'' لکھا۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ ''مذہب اور عشق'' کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ یہ سید انعام اللہ شاہ نے دورِ جدید پریس لاہور سے غالباً 1935 عیسوی میں شایع کیا تھا اور جو ایک مشہور و معروف ہندو مسلم شادی کی داستان ہے۔ یہ ناول بھی نذر سجاد حیدر نے لکھا تھا اور اپنی پھوپی کے نام سے چھپوایا تھا کیونکہ وہ خود اِس خاندان سے ذاتی طور پر واقف تھیں اور بہ طور مصنفہ اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن ناول کے کرداروں کے نام سر مشیر حسن وغیرہ اس طرح لکھے گئے تھے کہ پڑھنے والے بخوبی ان کو پہچان سکتے تھے۔ ہندو ہیروئن اور مسلم ہیرو کے لیے آخر میں دکھایا گیا تھا کہ ان کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ ہنی مون کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ نذر سجاد حیدر کا ایک اور ناول ''جاں باز'' بھی کانگریس کی تحریک آزادی کے متعلق تھا جو انھوں نے علی گڑھ کی بیگم خواجہ عبدالمجید کی فرمائش پر قلم بند کیا تھا۔

''مذہب اور عشق'' 20-1930 عیسوی کی دہائی کے بالائی طبقے کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی طرزِ معاشرت مغربی تعلیم اور خیالات وغیرہ ہندستان میں کس حد تک رائج اور مقبول ہو چکے تھے۔ لڑکیاں کیننگ کالج اور ازابیلا تھوبرن کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ انگریزی کلبوں میں اعلیٰ طبقے کے ہندستانی بھی شامل تھے۔ مسوری، نینی تال، شملہ، کلکتہ، لاہور، بمبئی، دہلی، حیدرآباد اور لکھنؤ ہندستانی سوسائٹی کے اہم مرکز تھے۔ چند مسلمان خاندان اور ان کی بے پردہ خواتین اس سوسائٹی میں شامل تھیں۔

ذاتی طور پر راقم الحروف کو سوشل ہسٹری کی ایک طالب علم کی حیثیت سے اس سوسائٹی کی ابتدا اور ارتقا سے بے حد دلچسپی ہے کیونکہ آج ہم ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں جس طرح کی دوغلی زندگی گزار رہے ہیں لیکن اُسے اپنی قومی کلچر کہنے پر نازاں ہیں، وہ دراصل ایک انڈو اینگلین کلچر ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے ہمارے یہاں رائج ہوئی۔ ورنہ ہمارے ہندو چوکے میں بیٹھ کر کیلے کے پتوں پر بھوجن کرتے اور ہمارے مسلمان تخت پر یا فرش پر دستر خوان بچھا کر ماحضر تناول فرماتے اور عورتیں گھر کی چہار دیواری میں محبوس رہتیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس طرح سات آٹھ سو سال تک ایشیا اور شمالی افریقہ کے بیش تر ممالک پر اسلامی طرز حیات حاوی رہا۔ مغرب کی ذہنی اور معاشرتی کلچر نے بتدریج اُس کی جگہ لے لی۔ مشرق میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت بند ہوئی تو امریکہ حبشی غلاموں کی بڑی منڈی بن گیا۔ عرب، ایرانی، ترک اور مغل ان چار مسلم اقوام کے بین الاقوامی تسلط کے ادوار کو ان کی اپنی جہالت اور کوتاہ نظری نے ختم کیا۔ ورنہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ انگلستان اور یورپ کے طالب علم بہ غرض اعلیٰ تعلیم لاہور، دہلی، لکھنؤ اور ڈھاکہ آتے یا جنوبی ہند کا رخ کرتے۔ اہلِ مشرق کند ذہن کیوں ہو گئے۔ میری سمجھ میں اِس کی وجہ نہیں آتی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہم کاسٹ سسٹم کے مارے ہوئے لوگوں نے گوروں کو دیوتا سمجھا۔ آپ آج تک دیکھیے ایک عام ہندستانی چاہے وہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو ایک گورے سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں لجاجت آ جاتی ہے اور گورے اہل ہند کی اِس کمزوری سے بخوبی واقف ہیں۔ گورے رنگ کی اہمیت، میرج مارکیٹ میں جتنی زیادہ ہے اُس سے ہم سب واقف ہیں۔ رنگت کا سانولا پن کم کرنے کے لیے انواع و اقسام کے کریم اور پاؤڈر بازار میں موجود ہیں۔

چنانچہ یہ کہنا غلط ہے کہ کلر بار انگریزوں نے کھڑی کی۔ یہ ہمارے یہاں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا ''گودڑ کا لال'' کی ہیروئن ثریا اپنے سرخ و سفید چہرے پر سیاہ روغن پوت کر مخلوط کالج میں پڑھنے جاتی ہے تاکہ بدشکل نظر آئے۔ آج ہم کو ناول کی مصنفہ کا یہ عمل مضحکہ خیز اور غیر حقیقی معلوم ہوگا کہ انھوں نے ثریا کے چہرے کو اس طرح بدنما بنایا مگر مصنفہ کے دل میں اصلاحِ معاشرہ

اور ترقی نسواں کی تمنا اتنی شدید تھی کہ انھوں نے اپنی ہیروئن کو ایسا مسخرہ پن کرنے پر مجبور کیا۔

ہمارے جید ناقدین نے خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کو نظر انداز کر کے اپنی بصیرت کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔[1]

ایام گذشتہ کیوں لکھا گیا۔ اس کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ جس زمانے میں ایک حیدرآبادی نوعمر خاتون مس حجاب اسماعیل مدراس میں رہتی تھیں جہاں ان کے والد محمد اسماعیل صاحب مقیم تھے۔ تبھی انھوں نے نہایت غیر معمولی قسم کے شاعرانہ طرز بیان کے ساتھ جذباتی افسانے لکھے۔ اُس وقت تک اُردو فکشن میں خالص ہندستانی طرز معاشرت کی تصویر کشی کی جاتی تھی اور اس کے بھی مختلف پہلو تھے۔ اِس کے علاوہ نذر سجاد حیدر نے نئی کولونیل طرز معاشرت کے متعلق ناول لکھے جس میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ بچوں کے لیے ان کی تصانیف- پھولوں کا ہار، سلیم کی کہانی، دکھ بھری کہانی اور ننھی رضیہ اور اُس کی بکری، میں لاہور کے آرٹسٹ سے جو تصویریں بنوائی گئی تھیں اُن میں نوعمر مسلمان لڑکیوں نے ایڈورڈین لباس یعنی سایہ یا گاؤن وغیرہ پہن رکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی طرز معاشرت ہندستانی سوسائٹی میں کس حد تک رائج ہو چکی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے سوسائٹی میں جو تبدیلی آئی تھی اور ہند ایرانی مغلیہ کلچر پر ایک ہمہ گیر عنصر برطانوی کولونیل تہذیب کا بھی شامل ہو گیا تھا۔

شاعری میں اس کی عکاسی میر انشا نے کی۔ ایک مغربی صنفِ ادب یعنی ناول بھی اسی طرح شامل ہوا کہ کتابوں کی دکانوں میں ہر نوع اور ہر معیار کے ناولوں کے انبار لگ گئے۔ جاسوسی ناول بھی خوب خوب لکھے گئے جو زیادہ تر انگریزی ناولوں سے اخذ کیے گئے تھے۔ طبع زاد ناول بھی بڑی تعداد میں لکھے گئے۔ پریم چند ایک علاحدہ موضوع ہے، اس کے تذکرے کی یہاں ضرورت نہیں۔ خواتین نے بھی بڑی تعداد میں ناول لکھے۔ گو میرا خیال ہے۔ گو مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہندستان کی کسی اور موڈرن زبان میں عورتوں نے اتنا متنوع اور جان دار فکشن رقم کیا ہو اور یہ فکشن زنانہ رسائل تک محدود نہیں تھا۔ نذر سجاد حیدر اور حجاب اسماعیل کے افسانے ادبی

رسائل اور اُردو روز ناموں کے سنڈے ایڈیشن میں بڑی طمطراق سے شائع کیے جاتے تھے۔

1935 عیسوی کے بعد ترقی پسند تحریک کے رہبروں نے اعلان کیا کہ وہ عوام کے دکھ درد کی ترجمانی کریں گے اور بے شک انھوں نے ایسا کیا لیکن اِس سارے معاملے میں ایک بوالعجبی یہ ہے کہ اس نئے ترقی پسند ادب کو عوامی ادب کہا گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ادب عوام نے لکھا اور عوام ہی اسے پڑھتے ہیں لیکن یہ ایک عظیم الشان غلط بیانی رہی ہے۔ یہ ادب دو عالمی جنگوں کے درمیانی زمانے میں تخلیق کیا گیا اور اس کے خالق نئے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے افراد تھے اور ان کے قارئین بھی اُسی طبقے میں شامل تھے۔ کاری گر، دکان دار، عام مزدور اور کسان زیادہ تر اَن پڑھ تھے۔ چنانچہ یہ نیا ادب اُن تک پہنچا ہی نہیں۔ نہ وہ اِسے پڑھ سکتے تھے۔ ہماری یہ ساری ترقی پسند تحریک پڑھے لکھے متوسط اور نچلے متوسط شہری طبقے تک محدود رہی اور ایسے رسالوں میں اُن کے متعلق لکھا گیا جن کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ لاہور سے بے شک ایسے ماہنامے اور ہفتہ وار پرچے شائع ہوئے جنھیں پڑھے لکھے عوام ذوق وشوق سے جن کا مطالعہ کرتے تھے۔ مثلاً رسالہ ''مست قلندر''، ''چتراویکلی''، ''شمع دہلی'' اور ''بیسویں صدی'' وغیرہ۔ یہ رسالے ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹال پر ملتے تھے۔ معیاری ادبی رسائل کی تعداد اشاعت بہت محدود تھی۔ اُردو کیونکہ عام پڑھے لکھے ہندستانی کی پسندیدہ زبان تھی اور اس کے زیادہ تر ادیب پنجابی، ہندو اور سکھ تھے۔ ہمارے عوام جو اُردو پڑھ سکتے تھے اُن کے لیے شمع، بیسویں صدی وغیرہ رسالوں کے انبار لگ گئے اور یہ بے شک عوامی رسالے تھے لیکن نقوش، نیرنگ خیال، عالمگیر، ادب لطیف، سویرا (لاہور)، ساقی (دہلی اور لاہور)، زمانہ (کانپور) اور نیا ادب (لکھنؤ) وغیرہ اس نئی پڑھی لکھی آسودہ حال مڈل کلاس کے ترجمان بنے جو بیسویں صدی کے نصف اوّل میں نئے ہندستانی ذہن کی ترجمانی تھی۔

نہ جانے کیوں نیرنگ خیال اور عالم گیر جیسے عظیم الشان رسالوں پر زوال آ گیا۔ ان رسالوں میں یورپین تصاویر کی رنگین پرنٹ بھی شائع ہوتے تھے۔ بہ لحاظ جسامت یہ ضخیم رسالے تھے اور نہایت پابندی سے ہر ماہ سے شائع ہوتے تھے۔ دہلی سے 'ساقی' نہایت آب وتاب سے

اپنی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔

ایک مسلسل افسانہ بہ عنوان ''فسانہ محبت'' از قلم جادو رقم ل احمد شایع ہو رہا تھا۔ منشی پریم چند اور دو تین اور افسانہ نگاروں کے علاوہ مجموعی طور پر فکشن خاصا کمزور تھا۔ لکھنؤ البتہ نہ جانے کیوں رسالوں کے معاملے میں پھسڈی رہا۔ نیاز صاحب کا رسالہ 'نگار' کافی ثقیل تھا۔ 1935 عیسوی کے بعد لکھنؤ کے چند لیفٹ ونگ نوجوانوں نے ایک ماہنامہ 'اضطراب' نکالنا شروع کیا لیکن وہ جلد ہی بند ہو گیا۔ 'نیا ادب' غالباً سہ ماہی رہا پھر وہ بھی غائب۔ پارٹیشن کی آندھی میں شمالی ہند کے رہے سہے اوراق بھی منتشر ہو گئے۔ غیر منقسم پنجاب میں ہندو، سکھ اور مسلمان تینوں فرقوں کے اہل قلم نے دور جدید کی اُردو کو مالا مال کر دیا تھا۔ اِس پر یاد آیا کہ ہمارے انعام اللہ ماموں نے رسالہ 'دور جدید' شایع کرنا شروع کیا تھا۔ وہ مرحوم ایک بہت ہی غیر معمولی اور دلآویز ہستی رہے ہوں گے۔ علامہ اقبال کے استاد میر حسن سیالکوٹی کے حقیقی بھتیجے اپنی عمر زیادہ لکھا کر نہیں لائے تھے۔ وہ ہماری والدہ کے خاندان کے ایک جانثار دوست تھے۔

برطانوی سرمایہ کاروں کے کافی اور چائے کے پلانٹیشن، یونیورسٹیوں کے طلبا کے لیے من و سلویٰ ثابت ہوئے۔ بڑے شہروں کے کافی ہاؤس گویا بیسویں صدی کے چنڈو خانے تھے جہاں جمع ہو کر ہمارے نوجوان دور کی کوڑی لاتے۔ ایک نئی کافی ہاؤس کلچر ذہنی نشوونما کی معاون ثابت ہوئی۔ ہماری پرانی تہذیب میں شرفا کا گھر سے باہر بازار میں نان بائی کی دکان پر کھانا انتہائی معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ خود شہر لکھنؤ میں کارلٹن اور برلنٹن جیسے اعلیٰ درجے کے انگلش ہوٹلوں کے علاوہ کوئی طعام خانے موجود نہیں تھے لیکن دوسری جنگ عظیم نے ہندستان کی اقتصادیات اور طرز معاشرت کو بھی وسیع پیانے پر متاثر کیا۔ ہر طبقے کے ہندستانی نوجوان فوج میں شامل ہو کر ساری دنیا میں بکھر گئے۔ قومی تحریک نے بھی نوجوان طبقے کی زندگیوں میں ردو بدل پیدا کیا۔ عورتیں بھی اس نئی آزادی سے بہرہ ور ہوئیں۔ بہت سی لڑکیوں نے زنانہ امدادی فوج کی وردیاں پہنیں۔ کچھ لڑکیاں ریڈ کراس کے امدادی دستے میں شامل ہوئیں۔ غرض یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے دوررس نتائج سامنے آئے۔

زنانہ امدادی فوج کی بیش تر لڑکیاں ہندستانی عیسائی فرقے سے تعلق رکھتی تھیں لیکن چند مسلمان اور ہندو لڑکیوں نے بھی یہ نیا کیریئر اپنے لیے منتخب کیا۔ اودھ کے ایک نامی گرامی مسلم تعلقہ دار خاندان کی دو بہنوں نے زنانہ فوج میں عہدے حاصل کیے۔ دوسری جنگ عظیم نے اس طرح ہندستانی سماج کی قدامت پسندی پر کاری ضرب لگائی۔ اس کے ساتھ ہی تحریک آزادی اور مطالبۂ پاکستان کے پُرزور ایجیٹیشن نے سارے ملک میں ہل چل مچادی۔ لکھنؤ بہرحال اس سیاسی اضطراب سے پوری طرح محفوظ رہا۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ مسز سروجنی نائیڈو گورنر ہوکر آگئیں۔ وہ ایک بہت ہی غیر معمولی خاتون تھیں اور اپنے حسِ مزاح کے لیے منفرد سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ سروجنی دیوی کی سرپرستی میں گورنر ہاؤس کے اندر آئے دن مشاعرے ہونے لگے۔ اس سے ذرا ہی قبل ایک روز کا ذکر ہے۔ یوپی کے آخری انگریز گورنر صاحب بے فیئر سنیما ہال حضرت گنج میں ایک انگلش پکچر دیکھنے کے لیے آئے۔ فلم کا نام شاید بلیک نارسیسس تھا یعنی سیاہ نرگس۔ جب وہ پکچر دیکھ کر باہر نکلے یونیورسٹی کی دو تین لڑکیاں مع راقم الحروف بھی پہلے سے باہر آچکی تھیں۔ میں حسب عادت تیز تیز قدم اٹھائے آگے آگے جارہی تھی۔ بے چارے گورنر صاحب سر جھکائے عقب میں چلتے رہے تو ہماری کزن شکیلہ نے کہا۔

سرکشی چال میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں (اکبرالہ آبادی)

یہ راج کا بالکل آخری زمانہ تھا۔ چند روز بعد ہی آزادی کا پرچم لہرانے والا تھا۔ ورنہ برطانوی دور میں بھلا کسی کی کیا مجال تھی کہ وہ گورنر کے آگے آگے چلے لیکن وقت نے اچانک پلٹا کھالیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی معمولی واقعہ ہے مگر یاد رہ گیا۔

والدہ مرحومہ کی سماجی اور خاندانی پس منظر کے متعلق کئی مضامین میں لکھا جاچکا ہے لیکن یہاں مختصر طور پر نئے پڑھنے والوں کے لیے اِسے دہرانا ضروری ہے۔ اِس خاندان کے بزرگ اودھ کے اضلاع میں ناظم اور چکلہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ 1856 عیسوی سے ذرا قبل وہ کمپنی کی ملازمت میں شامل ہوئے اور پنجاب میں برطانوی انتظامیہ قائم کرنے کے لیے کمپنی کے جن تجربہ کار افسروں کو وہاں بھیجا گیا ان میں میر قائم علی بھی شامل تھے۔ انھوں نے مسٹر پرنسپ

کے ساتھ مل کر ایسے قوانین وضع کیے جن کے ذریعے پنجاب کے کسانوں کو مہاجن کے دائمی قرضے سے نجات مل گئی۔ اس وجہ سے پنجاب کے پیر پرست معاشرے میں ان کو ایک بزرگ کا درجہ حاصل ہو گیا اور وہ پیر قائم علی شاہ کہلانے لگے اور انتقال کے بعد گرداس پور میں ان کے مزار پر عرس شروع ہو گیا جو 1947 عیسوی تک جاری رہا۔ مزار کے سرہانے بیری کا درخت موجز نما کہلایا۔ عورتیں اُس کے پتے کالی کھانسی کے علاج کے لیے اپنے بچّوں کو کھلاتیں اور عقیدہ یہ بھی تھا کہ اس مزار کی مٹی یا گرد چکھنے سے چوتھیا بخار بھی چلا جاتا ہے۔

خان بہادر پیر قائم علی سی آئی ای کی اولاد نے یہ پیری مریدی کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ان کے فرزند میر مظہر علی علامہ اقبالؔ کے والد کے گہرے دوست تھے۔ میر مظہر علی کے بیٹے میر نذر الباقر برٹش انڈین آرمی کے سپلائی ایجنٹ رہے اور چار برس فرانس میں قیام کیا۔ ان کی بہن اکبری بیگم مشہور ناول ''گودڑ کا لال'' کی مصنفہ تھیں۔ اکبری بیگم کے صاحب زادے میر افضل علی بھی اُردو کے صاحبِ طرز ادیب، مصنف ''تخیلات'' پنجاب کے پہلے انڈین افسر تھے جنھیں اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس مقرر کیا گیا۔ جنوری 1937 عیسوی میں بہ عمر 39 سال ان کا انتقال ہو گیا۔ افسوس یہ ہے کہ ''تخیلات'' جیسی نادر الوجود کتاب کو ناقدین نے نظر انداز کیا اور کسی کو اس کا نیا ایڈیشن شایع کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ ہمارے ادبی ناقدین، مفسرین و مورخین کی یہ عدم توجہی حیرت انگیز ہے۔ اس صورتِ حال کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ دراصل آج کل سارا معاملہ پبلی سٹی اور پبلک ریلیشنز کا ہے۔ آپ کتنا ہی اچھا لکھیں اگر اس کی رسالوں کے ذریعے شہرت نہ ہو تو آپ گم نام رہیں گے۔ آج کل پبلی سٹی کا کام عالمی پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور بین الاقوامی مذاکرے وغیرہ وغیرہ۔ اُس وقت یہ وسائل موجود ہی نہیں تھے۔ لاہور ادبی سرگرمیوں کا عظیم الشان مرکز تھا۔ افضل خالو اپنی سرکاری مصروفیات میں منہمک رہے اور بہت بے وقت انھوں نے رحلت کی۔ ان کے عزیز دوست انعام اللہ شاہ جنھوں نے یہ کتاب شایع کی تھی وہ بھی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہے۔ ان کا اخبار دورِ جدید بھی بند ہو گیا۔ انعام اللہ ماموں مجھے یاد ہیں۔ وہ بہت ہی پر مذاق اور شگفتہ مزاج انسان تھے۔ میں ان کا تذکرہ پہلے بھی کر چکی ہوں کہ

وائسرائے اپنی اسپیشل ٹرین پر دہرہ دون آئے۔ وائسرائے کی اکزیکیوٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے ظفر اللہ ماموں بھی ہم راہ تھے اور انھوں نے اپنے دوست انعام اللہ شاہ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ چنانچہ جب اسپیشل ٹرین دہرہ دون پہنچی تو ظفر اللہ ماموں اور انعام اللہ ماموں ہمارے یہاں تشریف لائے۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ ہم لوگ ایک سبز بھورے پتھروں والی کوٹھی حسنین منزل میں مقیم تھے۔ انعام اللہ ماموں کا ایک بازو کسی حادثے میں ضائع ہو چکا تھا اور وہ کوٹ کی آستین کو ایک جیب میں چھپائے رکھتے تھے۔ مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے۔ کوٹھی کے باہر رنگ برنگے سنگ ریزوں پر کرسیاں بچھی تھیں۔ انعام اللہ ماموں والد مرحوم سے باتیں کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا "ایک پیالی گرم پانی منگوا دو۔" نوکر پیالی لے کر آیا۔ انعام اللہ ماموں چائے کی طرح وہ گرم پانی پیتے رہے۔ انھوں نے اُردو ٹائپ رائٹر ایجاد کروایا تھا۔ وہ اسے لے کر حیدر آباد جا رہے تھے تا کہ اسے حضور نظام کے ہاتھ فروخت کریں۔ وہیں حیدر آباد میں چند روز بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ ایک غیر معمولی شخصیت کے انسان تھے اور نہایت پُر لطف باتیں کرتے تھے لیکن پاکستان میں بھی بہت کم لوگوں نے ان کو یاد رکھا۔

انعام اللہ ماموں کے حقیقی چچا علامہ میر حسن سیالکوٹی علامہ اقبال کے استاد تھے۔ انعام اللہ ماموں ہماری والدہ کے خاندان کے ایک جاں نثار دوست تھے۔ جب ہماری بنو خالہ یعنی ثروت آرا بیگم کا سولن میں انتقال ہوا، انعام اللہ ماموں نے دن دن بھر دھوپ میں کھڑے ہو کر ان کا مزار بنوایا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کی دوستیاں اتنی پائیدار اور بے لوث کیوں تھیں۔ اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی اتنی پیچیدہ نہیں ہوئی تھی۔ فارغ البالی کی وجہ سے ذاتی دوستیاں نبھانے کی فرصت بھی موجود تھی۔ خط و کتابت کے ذریعے یہ تعلقات استوار رکھے جاتے تھے۔ ہندستان کے تعلیم یافتہ مسلمان طبقے کی خواتین پیشاور میں رہنے والی بیگمات مدراس اور بنگلور، کلکتہ اور بمبئی کی خواتین سے خط و کتابت کرتی تھیں اور یہ سلسلے تہذیب نسواں لاہور اور عصمت دہلی جیسے رسالوں کے ذریعے قائم ہوئے تھے۔ اگر آپ ان رسالوں کی بہت پرانی

جلدیں اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو تعجب ہوگا کہ ان قلم کار خواتین نے جو زیادہ تر پردہ نشین تھیں کیسے مختلف النوع موضوعات پر نہایت مبسوط مضامین لکھے۔ مجھے چند کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ سردار محمدی بیگم آف وائی۔ یہ غالباً مہاراشٹر کی ایک چھوٹی سی مسلمان ریاست تھی جس کی مالکن کا سرکاری خطاب سردار تھا۔ خواتین کی اُردو صحافت نہایت جان دار اور ہوش مند صحافت تھی۔ اس وسیع اور متنوع ادبی روایت کے متعلق آج تک کچھ لکھا ہی نہیں گیا ہے اور نہ اس پر ریسرچ کی گئی ہے۔ اواخر انیسویں صدی سے لے کر 1947 عیسوی تک سارے برصغیر میں کتنی اَن گنت خواتین نے رسالوں میں مضمون نویسی کی لیکن اس کے باوجود مسلمان عورتوں کے لیے عام تصویر یہی ہے کہ وہ اَن پڑھ اور پس ماندہ تھیں اور جو کچھ ترقی انھیں ملی وہ آزادی کے بعد ملی۔ علم دوستی مسلم معاشرے کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ بچوں کو تختی پر یہ لکھنا سکھایا جاتا تھا ۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

پرانے گھرانوں میں ایک آتو جی لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ پردہ نشین ہونے سے قبل مولوی صاحب بھی پڑھانے کے لیے آتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ السٹریٹیڈ ویکلی میں ایک مغل مینا تور شائع کیا تھا جس میں ایک مولوی صاحب لڑکیوں کو پڑھا رہے ہیں۔ ایک ہندو لڑکی بھی شاگردوں میں موجود ہے۔ ماتھے پر بندی، لہنگے میں ملبوس۔ اگر ہم مغل تصاویر کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں عہد رفتہ کے کتنے معاملات کی بالکل صحیح جان کاری حاصل ہوسکتی ہے اور ان مغل تصاویر کے وافر ذخیرے برٹش میوزیم لندن، یورپ اور سینٹ پیٹرس برگ وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں لیکن ہمارا کوئی محقق ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہر تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ یا رئیس اپنے مصاحبوں کے ساتھ مسند نشین ہے اور چند گانے والیاں اس کے سامنے استادہ نغمہ سرا ہیں اور مختلف ساز بجا رہی ہیں۔ پھر میں نے کہیں پر یہ پڑھا کہ نرگس کی والدہ جدّن بائی نے گانے والیوں کو کھڑے رہ کر گانے کی اس رسم کو ان باکمال فن کاروں کی توہین سمجھا اور محفل میں بیٹھ کر گانا شروع کیا۔

اب تو ہمارے بھانڈ، بہروپیے، بھگتیے اور گویئے ہمارے سماج سے غائب ہوتے جارہے ہیں۔ شہر قنوج میں راجہ جے چند کا محل اب ایک مٹی کے ٹیلے کی صورت میں باقی ہے۔ اس کے نزدیک نٹوں کا ایک محلہ ابھی موجود ہے۔ یہ سب خستہ حال ہندو ہیں۔ شادیوں میں جا کر گاتے بجاتے ہیں۔ رام پور اور مرادآباد وغیرہ کے مسلمان بھانڈ اپنی تماشہ گری کے لیے مشہور ہیں۔

گزشتہ صدیوں کے انگلستان میں اپنی ڈائری لکھنا امیر زادیوں کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ پریس، اخبار، رسالے ابھی اتنے مقبول نہیں ہوئے تھے۔ صنعتی انقلاب کے بعد مغرب کی ذہنی کایاپلٹ بھی ہوئی اور عورتوں نے اپنی آزادی کی جدوجہد شروع کی۔ انھوں نے ناول بھی خوب خوب لکھے۔ عورتیں انسانی رشتوں کی باریکیوں کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ گہرائی سے سمجھ سکتی ہیں کیونکہ قدرت نے افزائشِ نسل کی ذمہ داری انھی کو سونپی ہے۔ خواتین کے لکھے ہوئے ناول جذبات نگاری اور سوسائٹی کی مرقع کشی میں زیادہ باریک بینی کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ لہٰذا ناول نویسی کے فن میں خواتین نے جین آسٹن سے لے کر ورجینیا وولف تک زندگی کے ہر رنگ کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا۔ چلیے وہ تو مغرب تھا جو سماجی زندگی کے ہر شعبے میں مشرق سے بہت آگے نکل چکا تھا لیکن ہمارے پسماندہ مشرق میں بھی خواتین ہی نے اپنی تمام سماجی پابندیوں کے باوجود حریت نسواں کا ڈنکا بجایا۔ مضمون نگاری بھی کی اور ناول بھی لکھے۔ شاعری ہمارے یہاں اس طرح کا نستعلیق گھریلو فن تھا جیسا جاپان میں پھول سجانا ایک باضابطہ آرٹ اور نسوانی ہنرمندی سمجھا گیا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اواخر انیسویں صدی سے ہندستان میں پردہ نشین عورتوں نے بھی مضمون نویسی، افسانہ نگاری اور شاعری تینوں میدانوں پر دھاوا بولا اور اپنا لوہا منوا ہی لیا۔ اُردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک بے حد اہم باب ہے لیکن اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے اور زیادہ تر لکھنے والیوں کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا گیا ہے۔ کبھی خواتین قلم کاروں کے سماجی سیاق و سباق کا مطالعہ نہیں کیا گیا کہ انھوں نے زیادہ تر اپنی پابندیوں کے باوجود اور کسی کالج یا یونیورسٹی کی تعلیم کے بغیر اتنے متنوع موضوعات پر کیسے لکھ لیا۔ اتنے ناول کیوں کر قلم بند کیے۔ رسالوں کی

ادارت کی۔ انھوں نے اپنے سماج اور اپنی زندگی کی پوری عکاسی کیسے کر ڈالی؟ اکبری بیگم جنھوں نے بطور والدۂ افضل علی اپنا مشہور ناول ''گودڑ کالال'' لکھا۔ نہ اپنا نام ظاہر کیا اور نہ اپنے شوہر کا۔ ''گودڑ کالال' تو ان کا مشہور ناول تھا مگر ان کے دوسرے ناول ''شعلۂ پنہاں'' اور ''گلدستۂ محبت'' تھے۔ اپنے زمانے میں پڑھے گئے لیکن اب ناپید ہیں۔ ادبی فیشن متواتر بدلتے رہتے ہیں۔ ہم بھی آج اس صدی کی اولین دہائیوں میں لکھے ہوئے ناول نہیں پڑھیں گے۔ پہلے ناول کا مکالمہ ڈرامے کے انداز میں لکھا جاتا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے ذرا قبل یہ انداز تحریر بدل گیا لیکن منشی پریم چند کے ناولوں کے مکالمے اسی انداز کے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ حجاب اسامیل فرانسیسی ادیب پیئر لوئی سے متاثر ہوئیں۔ پیئر لوئی نے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں شمالی افریقہ کی فرنچ مقبوضات کے نیم الف لیلوی ماحول کی تصویر کشی کی۔ چنانچہ حجاب کے یہاں بھی وہی انتہائی رومنٹک نیم مغربی ماحول ملتا ہے۔ مادام زبیدہ، کاونٹ لوث، بوڑھی حبشن زوناش جو عربی نغمے گنگناتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ شمس العلما مولوی ممتاز علی، مس نذر الباقر کے منہ بولے بھائی تھے کیونکہ جب مس نذر الباقر کے ایک بھائی کا کم سنی میں انتقال ہوگیا تو مولوی صاحب نے مس صاحبہ موصوفہ کو لکھا کہ آج سے تم مجھے اپنا حقیقی بھائی سمجھو۔ چنانچہ میں بچپن میں مولوی صاحب کو ممتاز ماموں پکارتی تھی اور ان کے دونوں صاحب زادے میرے لیے حمید بھائی اور امتیاز بھائی تھے۔ سونے پہ سہاگا یہ ہوا کہ مس حجاب اسامیل نے ہماری والدہ سے خط و کتابت شروع کیا اور ان کے خط بھی بالکل ان کے افسانوں کی قسم کے ہوتے تھے۔ اس وقت آسمان کا رنگ گہرا کاسنی ہے۔ جعفر طوطا خوب ناچ رہا ہے۔ میری ایک بدشکل بلی جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے، ایک گلہری کا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے نیلے رنگ کا فراک پہن رکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

والد مرحوم بہ طور رجسٹرار مسلم یونیورسٹی انتہائی رازداری سے پرچے چھپوانے کے لیے دور دراز مدراس جایا کرتے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات محمد اسامیل صاحب اور ان کی بیٹی حجاب سے ہوئی اور انھوں نے علی گڑھ واپس آکر والدہ سے ذکر کیا کہ تاج کے لیے ایک بہت مناسب لڑکی

سمجھ میں آئی ہے۔ یعنی حجاب اسماعیل۔ قصہ مختصر یہ کہ 1935 عیسوی میں حجاب بطور مسز امتیاز علی تاج لاہور آ گئیں۔ وہ ایک بڑا دلچسپ زمانہ رہا ہوگا۔ مسلم سوسائٹی بھی کافی موڈرن ہو چکی تھی۔ اس موڈرنزم کی ایک قائد ہماری والدہ تھیں جنھوں نے اپنی پردہ نشین سہیلیوں کو پردے سے نکالنے کی مہم شروع کی۔ لاہور اور لکھنؤ اس زمانے میں موڈرن مسلم طبقے کے دو اہم مرکز تھے اور ہماری والدہ ان دونوں شہروں میں ایک اہم سماجی اور ادبی شخصیت تصور کی جاتی تھیں۔ ان کا ناول ''مذہب اور عشق'' جس کا میں پہلے بھی تذکرہ کر چکی ہوں جو انھوں نے اپنی پھوپی والدۂ افضل علی کے نام سے چھپوایا تھا کیونکہ وہ ہندستان کے اہم ترین ہندو سیاسی خاندان کی صاحب زادی اور ان صاحب زادی کے والد کے مسلم سکریٹری کے رومان کے متعلق تھا۔ اس وقت سیاسی حالات بہت ہی نازک دور سے گزر رہے تھے اور اس ہندو مسلم شادی سے فسادات بھڑک اٹھنے کا قبیح اندیشہ تھا۔ چنانچہ ان صاحبزادے کو امریکہ بھیج دیا گیا اور ہیروئن کی شادی انھیں کے اعلیٰ طبقے کے ایک پنڈت نوجوان سے کر دی گئی۔ آزادی کے فوراً بعد ہیروئن نے ہیرو کو امریکہ سے واپس بلوا لیا۔

حجاب امتیاز علی نے جب اپنا روزنامچہ ''لیل و نہار'' کے عنوان سے شائع کیا۔ آج آسمان کا رنگ ہلکا گلابی تھا اور جعفر طوطا بہت خوش تھا اور میری بدصورت بلی خفا بیٹھی تھی۔ شام کو میں لیڈی ذ 2 کے یہاں گئی۔ یہ ''لیل و نہار''، ''تہذیب نسواں'' میں ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا۔

تہذیب نسواں کی کہانی یہ ہے کہ دیو بند ضلع سہارن پور کے رہنے والے مولوی سید ممتاز علی محکمہ تعلیم میں ملازم ہو کر لاہور تشریف لے گئے جو اس وقت شمالی ہند کا ایلڈورےڈو بنا ہوا تھا۔ فرنگی حاکم نے آنے کے ساتھ ہی تاڑ لیا تھا کہ خوابیدہ، عیش پرست گنگا گھاٹی کے لوگوں کے برعکس پنجابی پھرتیلا اور محنتی بندہ ہے۔ اس کے سامنے پدرم سلطان بود کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ہزاروں برس بیرونی حملہ آوروں کی زد میں رہا ہے اور لباس اور زبان کے ذریعہ ان کا رشتہ وسط ایشیا اور ایران سے قریب تر ہو چکا ہے۔ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، افغانستان اور ایران سے لے کر ترکی اور آگے بلقان کی ریاستوں تک ایک وسیع تر کلچر کے مناظر گویا ایک پکچر گیلری میں موجود

ہیں۔ کہاں ڈھاکہ اور کہاں بخاریسٹ گویا ایک ہی بائسکوپ کے مختلف مناظر ہیں۔ یہ نئے صنعتی یورپ کے عروج اور عالم گیر تسلط سے پہلے کا نظارہ تھا مگر چند صدیوں تک تماشا دکھا کر مداری گیا۔

یہ وقت کا مداری بڑا ہنر مند اور چالاک تماشہ گر ہے۔ بڑے سے بڑا سائنس داں بھی ابھی تک اس سے جیت نہیں سکا ہے۔ سابق سوویت یونین کی ریاست آذر بائیجان کے شہر باکو[3] میں راقمہ نے ایک محلّہ ایسا دیکھا کہ مجھے لگا کہ میں اچانک پرانی دلّی یا شہر لکھنؤ کے کسی گلی کوچے میں پہنچ گئی ہوں۔

یہ اس عالمی تہذیب کی ایک جھلک تھی جسے یورپ کی بالادستی نے گویا آن کی آن میں زیر کیا۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ کے اسی نظارے میں مغربی کلچر جابجا نمایاں تھی تو خالص قدیم مشرق تو میرے خیال میں شاید اب تبت میں بھی نہ ملے۔ جاپان میں البتہ جدید ترین ٹکنالوجی کے ذریعہ انھوں نے اپنی قدیم تہذیب کو قائم رکھا ہے۔

اب میں پھر مقامی معاملات کی طرف آجاؤں تو کیا مضائقہ۔ سر سید احمد خان جب بجنور تشریف لائے تو انھوں نے مقامی باشندوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا۔ رؤسائے چاند پور، شرفائے نگینہ اور دانش مندانِ نہٹور۔

یہاں پر مجھے ایک بالکل غیر متعلق بات یاد آگئی۔ وہ بھی سناتی چلوں تو کیا حرج ہے۔ نہ کوئی نقصان میرا اور نہ آپ کا۔ ذکر ہوا کا ہے کہ یہ کہاں سے چلتی ہیں اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہیں اور کہیں کہیں اپنے راستے میں بگولے بھی بناتی جاتی ہیں یعنی زرد پتے ایک حلقے میں تیز تیز چکر کاٹتے اچانک کہیں سے اٹھتے ہیں اور کہیں جا کر اچانک معدوم ہو جاتے ہیں۔ اَن گنت مناظر آپ سے آپ تخلیق ہوتے ہیں اور پھر ایک بارگی غائب۔ اب وہ منظر بھی دیکھ لیجیے کہ کیلاش ہوسٹل مسز بان چو کی کوٹھی کے برآمدے میں ای نڈ کھڑی مسز بان چو سے باتیں کر رہی ہے۔ اس نے نہایت معتبر شکل بنا رکھی ہے اور وہ سنجیدگی سے کہہ رہی ہے "جی ہاں! مسز بان چو کل بھی یہ لوگ اسی طرح یہاں چل رہی تھیں۔" "کون لوگ؟" میں پوچھتی۔ "یہی، ہوائیں۔" وہ جواب دیتی ہے۔

ای نڈ خود بھی ہوا کے ایک جھونکے کی طرح باغ ہستی میں گزر گئی۔ کہاں سے آئی تھی اور

کہاں معدوم ہوئی اور ہم سب ایک وایک جان دار، ذی ہوش، بولتے، ناچتے، گاتے بندے بھی کہاں جائیں گے اور کب اور کیسے؟ جب بائسکوپ کی مشین اچانک ٹوٹ جائے گی تو اس کی تصویر معدوم ہونے کے بعد کہاں موجود رہے گی؟

وہ بھری دوپہر جب کیلاش ہوسٹل کے باغ میں تتلیاں رقصاں تھیں اور پرندے گا رہے تھے اور انجینئر حامد حسین کی یہ کوٹھی ہمارے لیے گویا مرکزِ کائنات تھی۔ انجینئر صاحب موصوف بھی اپنے وقت کے ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ لکھنؤ کی اکثر عمارات کی طرف اشارہ کر کے کہا جاتا تھا یہ انجینئر حامد حسین نے بنوائی تھی۔ موصوف میری تحقیق کے مطابق ہندستان کے پہلے ناول ''نشتر'' کے مصنف سید حسن شاہ کے پڑپوتے تھے اور میں نے اِسی تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ ہندستان کا پہلا ناول بنگالی میں نہیں لکھا گیا بلکہ اِسے سید حسن شاہ نے بہ زبانِ فارسی 1799 عیسوی میں تصنیف کیا تھا۔ میرے اس انکشاف کے متعلق بھی اُردو دنیا میں آج تک تمام ناقدین وادبی مورخین نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ یہ ایک بہت ہی الم ناک اور عبرت ناک ادبی صورتِ حال ہے۔ میں نے اس ناول کا ترجمہ انگریزی میں بہ عنوان ''دی ناچ گرل'' کیا تھا جو ہندستان میں بھی چھپا اور کسی امریکن ناشر نے اسے بعنوان ''دی ڈانسنگ گرل'' نیویارک سے بھی شایع کیا۔ لیکن جب ساری دنیا کے ادبی Establishment نے یہ طے کر لیا ہو کہ انڈیا کا پہلا ناول بنکم چندر چٹرجی نے لکھا ہے تو مجھ بے چاری کی کیا بساط ہے کہ میں اپنی تحقیق کے ذریعہ اس بات کو چیلنج کروں۔ ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اُردو کے سارے بقراط ناقدین و محققین نے میرے اِس انکشاف کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

اس رویے سے یہ ظاہر ہوا کہ اُردو کی علمی اور تحقیقی معاملات میں ہمارے نقاد کسی کی دخل اندازی ناپسند کرتے ہیں۔ یہ بھی کاسٹ سسٹم کا ایک پہلو ہے۔ نقادوں کی کاسٹ الگ، فکشن لکھنے والوں کی الگ۔ میں نے سالہا سال پہلے امپرنٹ اور پھر السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں تحقیقی مضامین، نئی کتابوں اور نئی فلموں پر ریویو آرٹیکل لکھے جن کی ایک پوری ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔ ایک عزیز دوست خالد حسن نے پاکستان میں اپنے تمام مضامین اور تبصروں وغیرہ کا مجموعہ

شایع کرلیا ہے لیکن میں نے بہ وجہ لاپرواہی ایسا کچھ نہیں کیا۔ ہاجرہ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں ''سب افسانے میرے'' کے زیرِ عنوان شایع ہوا ہے۔ میرے اوّلین افسانے اور بعد کے بھی اکثر ناپید ہیں۔ اُردو پی ایچ ڈی کے لیے گنتی کے چند موضوعات کو بار بار دہرایا جا رہا ہے لیکن بہت سے موضوع ایسے ہیں اور متعدد پرانے افسانہ نگار جنھوں نے بہت اچھے افسانے لکھے انھیں فراموش کردیا گیا ہے۔ آج کل ہو یہ رہا ہے کہ جس موضوع پر پہلے سے بہت سا مسالا موجود ہے اسی کو لوٹ پھیر کر اور اس میں تھوڑے سے پیراگراف اپنی طرف سے شامل کرکے ایک نیا مضمون تیار ہو جاتا ہے۔ پریم چند، کرشن چندر اور منٹو پر بہت زیادہ خامہ فرسائی ہوئی ہے۔ اُردو کے متعدد قلم کار جو اپنی گمنامی کے مستحق نہیں تھے، ان پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ چند نہایت قابلِ ذکر ناول نگار خواتین کو زنانہ کمپارٹمنٹ میں ڈال کر نظر انداز کردیا ہے۔ ''مذہب اور عشق'' جیسے غیر معمولی سیاسی ناول جس کا میں ابھی ذکر کر چکی ہوں آج کسی نے اس کا نام بھی نہیں سنا۔ چنانچہ ثابت یہ ہوا کہ سارا معاملہ میڈیا کی پبلی سٹی کا ہے۔ خواتین کے ناولوں کا مسئلہ جداگانہ ہے۔ ان کی گریپ وائن یعنی انگور کی بیل اپنے آنگن میں منڈھے چڑھتی ہے۔ ٹیلی ویژن کی آمد سے پہلے اُردو میں زنانہ رسائل اور زنانہ ادب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہر تعلیم یافتہ گھرانے میں عصمت، تہذیبِ نسواں اور زیب النساء وغیرہ رسائل پڑھے جاتے تھے۔ پشاور سے لے کر مدراس اور کلکتے سے کراچی تک خواتین کی ایک بڑی مستحکم بزمِ خواہراں موجود تھی جس میں اِکا دُکا نام ہندو خواتین کے بھی نظر آجاتے تھے۔ مثلاً برج کماری نہرو اور مس شیاما زتشی کے نام مجھے اب تک یاد رہ گئے ہیں لیکن سیاسی انقلابات نے زنانہ رسائل پر بھی کاری چوٹ لگائی۔ تہذیبِ نسواں جیسا تاریخ ساز ہفتہ وار اخبار بند ہوگیا۔ عصمت وغیرہ کی وہ پہلی سی آب و تاب نہیں رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عورتوں کے اپنے سماجی حالات بدل گئے تھے۔ ان کی پردے کی رسم تقریباً ختم ہوچکی تھی اور بیرونی دنیا سے اُن کا رابطہ محض زنانہ رسائل کے ذریعے قائم نہیں رہا تھا۔ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ان کا انگلستان اور امریکہ جانا اب ایک عام بات ہوگئی تھی۔ ہندستان میں بھی تقریباً یہی عالم تھا۔ علی گڑھ گرلس کالج اور کرامت حسین گرلس کالج لکھنؤ

میں طالبات کی تعداد کا کوئی حد وحساب نہیں رہا تھا۔ بیرونی دنیا کے حالات جاننے کے لیے اب عورتوں کو زنانہ رسائل کی حاجت نہیں تھی اور جو زنانہ رسائل اب شایع ہو رہے تھے، ان کا اسٹائل بدل چکا تھا۔ اس تبدیلی کا اندازہ رسالہ "بانو" کے پرچوں سے ہوسکتا ہے جو شمع گروپ کا ایک پرچہ تھا اور جو حال ہی میں بند ہوا ہے۔

فلمی صحافت اب مقبول ترین صحافت تھی۔ مڈل کلاس کا طرزِ رہائش بھی بدل چکا تھا۔ گھریلو ملازمین اب فیکٹریوں میں زیادہ کما رہے تھے۔ لہٰذا اب ایک ہاؤس وائف کو گھر کے کام کاج زیادہ تر خود کرنے پڑ رہے تھے۔ محنت کش طبقے میں عزتِ نفس کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔ انگلستان میں لفظ Servant متروک ہو چکا تھا اور اس کے بجائے Domestic help کہا جا رہا تھا۔ یہاں پر بھی سمجھ دار لوگ اپنے گھر میں کام کرنے والی عورتوں کو نوکرانی یا ملازمہ نہیں پکارتے۔ یہ ایک خاموش اور قابلِ تعریف انقلاب ہے۔ کم آمدنی والے طبقات میں بھی لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم عام ہو چکی ہے۔ پردے کی شدت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایک پریشان کن تبدیلی البتہ یہ پیدا ہوئی ہے کہ شمالی ہند میں اُردو رسم الخط تقریباً غائب ہو چکا ہے یا غلط سلط لکھا جا رہا ہے۔ میں نے ایک باغ کے راستے پر اُردو میں مندرجہ ذیل نوٹس پڑھا۔ "یہ آم راستہ نہیں ہے۔" بول چال میں بھی ہندی کا اثر آ گیا ہے۔ ہماری ایک مسلمان دوست کھانا پکانے کو کھانا بنانا کہہ رہی ہیں۔ پہلے اَن پڑھ لوگوں کا بھی شین قاف درست تھا، اب ان میں بھی فرق آ چلا ہے۔ بول چال کی زبان میں یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ ہمارے اجداد آج سے سوڈیڑھ سو سال قبل جس طرح کی گفتگو کرتے تھے، وہ آج مستعمل نہیں۔

آزادی سے چند ماہ قبل لکھنؤ میں اہلِ لاہور کی یلغار شروع ہوئی۔ پاکستان بننے والا تھا اور ہندو اور سکھ وہاں سے ہجرت کر رہے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد شرنارتھیوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا مگر بہت جلد ان پر لکھنوی رنگ حاوی آ گیا اور لکھنؤ شہر پر پنجابی رنگ نہیں چڑھ سکا۔ گو دہلی لاہور کی توسیع بن گئی۔ سیاسی حالات اور مختلف تہذیبیں اسی طرح ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہی ہیں اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا رہے گا۔

ایام گزشتہ میں 1947 عیسوی سے قبل کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے جو دورِ حاضر کی نسل کے افراد بہ طور تمدنی تاریخ دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں۔ یہ سلسلۂ مضامین 8 راگست 1942 عیسوی سے لے کر 14 جولائی 1943 عیسوی تک ہفتہ وار تہذیبِ نسواں لاہور میں شائع ہوتا رہا یعنی اس کی اولین قسطیں نمبر-21، فیض آباد روڈ لکھنؤ میں لکھی گئیں۔ اس وقت لاہور اور لکھنؤ ایک ہی ملک کے دو شہر تھے۔ تقسیم ہند کے بعد مئی 1950 عیسوی سے اگست 1963 عیسوی تک یہ سلسلۂ مضامین وقتاً فوقتاً کراچی میں لکھا گیا اور عصمت میں شائع ہوا۔ ایک بوالعجبی یہ ہے کہ تہذیبِ نسواں لاہور جو 1898 عیسوی میں جاری ہوا تھا، آزادی کے بعد خاندانی جھگڑوں کی بنا پر اسے بند کر دیا گیا۔ دارالاشاعت پنجاب بھی غالباً اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ یہ ایک بہت ہی المناک واقعہ ہے۔ تہذیبِ نسواں اور پھول جیسے ہفتہ وار پرچوں نے اُردو تہذیب و صحافت کی زبردست خدمت انجام دی تھی۔ پھول اخبار میں ہندو اور سکھ نونہالانِ چمن بھی مضمون لکھتے تھے۔ کیونکہ اُردو اس وقت بلاتفریقِ مذہب وملت اِس برصغیر کی تہذیبی زبان تھی۔ تقسیم ہند نے منظر یکسر تبدیل کر دیا۔ حالانکہ اس تقسیم کا اثر پھول اور تہذیب پر نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ پاکستان بہرحال اُردو پڑھنے اور بولنے والوں کا ملک رہا۔ مقامی آبادیاں اور مہاجرین سب اُردو والے تھے۔ اِس کے باوجود تہذیب اور پھول غائب ہو گئے اور اس کی وجہ وہی تھی جس نے مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتوں کو تباہ کیا یعنی وارثوں کی آپسی رنجش اور کشمکش۔

چونکہ والدہ مرحومہ کا مولوی ممتاز علی اور اُن کی اولاد سے بہت گہرا جذباتی رشتہ تھا۔ جیسا پہلے میں نے کہیں لکھا ہے کہ جب بنت نذرالباقر کی شادی ہوئی تو مولوی صاحب نے اپنی نا کت خدا بیٹی وحیدہ بیگم کو اپنی منہ بولی بہن کے ساتھ مسوری بھیجا۔ وحیدہ بیگم جو بعد میں لیڈی یعقوب بنیں، جواں مرگ رہیں۔ لیکن ان کے دونوں بھائیوں نے ہماری والدہ کے ساتھ حقیقی بھتیجوں کی طرح کے تعلقات قائم رکھے۔ مزید برآں یہ کہ مس حجاب اسماعیل بھی والدہ مرحومہ کی بھانجی بنی ہوئی تھیں اور ان کی شادی سر یعقوب اور والدہ مرحومہ کی بساط کے ذریعہ ہی طے ہوئی تھی اور جیسا کہ میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ والد مرحوم مسلم یونیورسٹی کے پرچے چھپوانے مدراس

جاتے تھے، وہیں وہ حجاب اسماعیل سے ملے تھے۔

ایامِ گزشتہ کی جو قسطیں دستیاب ہوسکیں، اُن کو یکجا کر کے اس مجموعے کا نام میں نے "پچھلے برسوں کی برف" رکھا ہے جو ایک پرانے فرانسیسی گیت کا ٹیپ کا مصرعہ ہے جس میں مختلف ادوار کی حسیناؤں کے نام لے کر مغنی پوچھتا ہے کہ وہ بھی گئیں – وہ بھی گئیں – کہاں ہے گزشتہ برسوں کی برف۔

Les neiges d'antan

دراصل بات یہ ہے کہ ساری تحریریں سارا ادب جو پچھلے زمانوں سے لے کر آج تک لکھا گیا۔ وہ کچھ بہت عرصے تک موجود رہتا ہے اور کچھ بہت جلد غائب ہو جاتا ہے۔ ادبی فیشن بھی بہ سرعت بدلتے رہتے ہیں لیکن "گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را" بھی ایک اچھی نصیحت ہے اور اس پر عمل کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ گزشتہ ادوار کی خواتین نے مغرب اور مشرق میں ایک دوسرے سے خط و کتابت نہ کی ہوتی اور روزنامچے نہ لکھے ہوتے تو آج ہم سماجی تاریخ کے زیریں ابواب سے نا آشنا رہتے۔ اس کتاب کے معاون مرتب ڈاکٹر مجیب احمد خان کی ممنون ہوں۔ میں امید کرتی ہوں کہ "گزشتہ برسوں کی برف" دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

(قرۃ العین حیدر نے اپنی والدہ کے 'روزنامچہ' کو مرتب کیا ہے۔ اور اس کتاب کا نام 'گزشتہ برسوں کی برف' رکھا ہے۔ یہ پیش لفظ اس میں شامل ہے۔)

حواشی:

1 ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی بھی ان دونوں خواتین کے متعلق لکھتی رہی ہیں اور نئی نسل کے ایک نقاد ڈاکٹر مجیب احمد خان نے بھی اپنی کتاب "کارگہ شیشہ گری" میں والدۂ افضل علی اور نذر سجاد حیدر کی ناول نگاری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ (ق ح)

2 جن کے شوہر کے لیے علامہ اقبال نے لکھا تھا "موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش۔" (ق ح)

3 لفظ با کو دراصل باد کو ہے یعنی کوچۂ باد یعنی ہواؤں کی رہ گزر۔ چنانچہ ہم سب کے مکانات، محلات، جھونپڑے دراصل ہواؤں کی رہ گزر ہیں اور ہم سب، ہماری آبادیاں، نسلیں، پیڑھیاں، خاندان اس رہ گزر میں سے ہواؤں کے مسلسل جھونکوں کی طرح گزرتے رہتے ہیں۔ (ق ح)

اردو ادب اور طنز و مزاح

ہر تہذیب کی ترجمان اس کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ برطانیہ کی انگلش، فرانس کی فرنچ، اٹلی کی اٹالین، افریقہ ہوٹن ٹوٹ قبیلے کی زبان ہوٹن ٹو دی ہوگی لیکن ہندستان کی ترجمان کون سی زبان ہے۔ اس ملک کے مسائل خیز سماج نے زبان کا یہ مسئلہ دو ڈھائی سو سال قبل پیدا کیا ورنہ سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے مقامی بولی ٹھولی کے علاوہ اپنی کلچر کی فارسی اور سنسکرت پڑھ لیتے تھے۔ عیسائی مشنریوں نے ایک چھوٹی مجلد کتاب سے متعارف کرایا۔ ایسی کتاب جس کے مختلف جز ایک بستے میں باندھنے کے بجائے ایک چھوٹی سی جلد میں سما جاتے تھے۔ ہندستان کی مختلف زبانوں میں انگلش بائبل کے تراجم شائع کیے گئے۔ اردو پریس کے بابا آدم منشی نول کشور نے بیل گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنی کتاب گاؤں گاؤں پہنچائیں۔ ہندستان کی مختلف زبانیں سیاست دانوں کا آلۂ کار بھی بنیں اور اسی لسانی ہنگامے میں اردو نے ایک Persona non grata کی حیثیت بھی اختیار کرلی۔ زبان وہی رہی لیکن اس کا نام بدل دیا۔ گویا اصل جڑ اس کے نام سے تھی، اگر آپ کہیں کہ گلاب تو گلاب ہی رہے گا نام کی تبدیلی سے کیا ہوتا ہے یہ غلط ہے رفتہ رفتہ گلاب کی جگہ گوبھی کا پھول آ سکتا ہے۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ تقریروں میں وزن سے خارج اشعار پڑھے جاتے ہیں، تلفظ غلط ہو گئے

ہیں، معنی بھی بدل دیے گئے ہیں مثلاً اب عام طور پر محاوروں کا استعمال غلط ہورہا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ جمہوریت کا دور ہے۔ زبان پر محض رئیسوں اور نوابوں کی اجارہ داری نہیں رہی۔ اسی منطق کو استعمال کرتے ہوئے اگر آکسفرڈ اور کیمبرج کی انگریزی کو خارج کرکے وہاں کوئی استعمال کی جائے تو کیسا رہے گا۔ بنیادی طور پر یہ ایک اینٹی کلچر رویہ ہے اور آج کل اسی رویئے کا بول بالا ہے۔

طنز و مزاح کے عناصر یا اس کی روایات کسی تہذیبی زبان کے رچاؤ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب کسی قوم یا فرقے کے افراد اپنے آپ پر ہنسنا سیکھ لیں تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں بالغ نظری آ گئی ہے اور وہ اپنے متعلق ضرورت سے زیادہ حساس نہیں رہے۔ اردو والے تین سو سال سے ہنسنا ہنسانا سیکھ چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز و مزاح کی جتنی کثیر الجہت اصناف موجود ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو کے ایک ایک لفظ کو جس طرح سجایا اور سنوارا گیا اب اسی بے دردی سے اس کا قتلِ عام ہورہا ہے۔

چنانچہ موجودہ نسل کے بچے بھی اب غلط الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور ان کی تصحیح کرنے والا کوئی نہیں۔ سبزی کو سبجی، دروازہ کو دروجا اب عام طور پر بولا جاتا ہے۔ ایک روز بمبئی میں سردار جعفری کے یہاں فراقؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت دیر تک اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ کا تذکرہ کرتے رہے جن کا حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے، لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک تہذیبی زبان کو بگاڑنے کے عمل پر فخر و مسرت کا اظہار کیا جائے۔ پڑوسی ملک میں بھی عمل ایک اور طریقے سے کیا جارہا ہے یعنی ایک علاقائی زبان کے لب و لہجے کو ٹکسالی اردو پر ترجیح دی جاتی ہے اور بعض اوقات دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے۔ اس طرح کے چند مناظر میں نے ٹیلی ویژن فلموں میں دیکھے۔ ایک منظر میں ایک دو پلی ٹوپی والے انگرکھے میں ملبوس منحنی سے آدمی نے کہا آداب۔ یعنی اس نے آداب عرض کیا تو دوسرے آدمی نے اسے مار گرایا۔ جب اس نے فریاد کی تو قوی الجثہ آدمی نے کہا تم ہی نے تو کہا تھا آداب۔

یہ گویا بہت بڑا لطیفہ تھا۔ علاقائی، لسانی، مذہبی یا فرقہ وارانہ عصبیت کے مظاہرے کے لیے زبان سے زیادہ آسان اور کارگر اور کوئی طریقہ نہیں۔

لیکن اردو کی ایک انفرادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انتہائی لطیف اور مہذب پیرائے میں طنز و مزاح کے ذریعہ ادب عالیہ تخلیق کیا جاسکتا ہے اور اردو میں ایسے ادب کی کمی نہیں ہے اور میں نہیں سمجھتی کہ اکبراللہ آبادی کسی اور زبان میں نمودار ہو سکتے تھے۔ نثر میں سرشار جن کا مزاحیہ کردار خوجی ایک ضرب المثل بن گیا ہے کے بعد یلدرم کا مضمون ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' 1900 عیسوی میں شایع ہوا۔ اسی زمانے میں ان کی مزاحیہ نظم ''مرزا بھوبا'' علی گڑھ شایع ہوئی۔ بیسویں صدی میں اے۔ ایس بخاری کی تصنیف بہ عنوان ''پطرس کے مضامین'' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پھر ایک فرضی مزاحیہ کردار کے متعلق مضامین کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں امتیاز علی تاج کے چچا چھکن سرفہرست ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں شاید ان ہی کے ایک مضمون کے لیے کہتے ہیں کہ جیوروم کے مضمون "Five Men in a boat" سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ جاننا چاہیے کہ گزشتہ صدی کی اولین دہائیوں میں ہمارے ادبا اپنے مضامین کے شروع یا آخر میں بڑی صاف گوئی سے لکھ دیا کرتے تھے آسکر وائلڈ سے متاثر ہو کر لکھا گیا یا پیری لوئی سے ماخوذ۔ لیکن پیری لوئی کو رسالے کا کاتب پیرلوئی بنا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر مضامین کے آخر میں لکھا جاتا تھا کہ ماخوذ از پیرلوئی۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل تک کا یہ زمانہ بہت ہی دلچسپ رہا ہوگا۔ بالکل اوریجنل (Origioanl) افسانے لکھنے والے تعداد میں بہت کم تھے اور خود ترقی پسند گورکی وغیرہ سے بہت متاثر ہوئے۔ جب ہم گزشتہ ادوار کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو اکثر یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ فلاں فلاں روسی ادیب سے متاثر ہوا۔ یا فلاں مغربی ادیب کا حلقہ بگوش رہا تو کیا ہمارے یہاں بالکل اوریجنل لکھنے والوں کی بہت کمی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ منٹو یا عصمت آپا کے لیے بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اوریجنل نہیں تھے۔

ہمارے اس افسانوی ادب میں طنز و مزاح ان سارے اکابرین کی تخلیقات میں شامل رہا ہے کیونکہ اردو زبان کی چاشنی ہی ایسی ہے کہ اگر آپ چاہیں بھی تو اس میں بوریت کے دریا نہیں بہا سکتے۔

لیکن چند شہ پارے ایسے ہیں جو کسی طرح بھلائے نہیں بھولتے یعنی ''پطرس کے مضامین''، ''تاج کے'' چچا چھکن''، شوکت تھانوی کے ''سودیسی ریل'' اس شاہکار کے لیے یہ بھی کہا گیا کہ کانگریس کی صوبائی حکومت کے انعقاد کے بعد انگریزوں نے یہ مضمون شوکت تھانوی سے بہ طور خاص لکھوایا تھا۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آتا۔ شوکت صاحب لکھنؤ کے ایک میاں بھائی آدمی انگریز ان کے پاس کہاں پہنچ گئے تھے کہ ایسا مضمون لکھو۔

بعض اہلِ قلم محض One book author ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے شاید پطرس نے کوئی اور مجموعہ شایع نہیں کیا۔ وہ افسر شاہی کے ایک بڑے رکن رہے۔ پیرس اور نیویارک وغیرہ ان کی جولان گاہ بنی۔ اگر وہ چاہتے تو ان نئی دنیاؤں کے متعلق کیا کچھ نہ لکھتے مگر نہ جانے کیوں انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آل انڈیا ریڈیو، اقوام متحدہ، ریڈیو پاکستان میں دونوں بھائی اسد اللہ بخاری اور احمد شاہ تفریحاً صحیح بخاری اور غلط بخاری بھی کہلاتے تھے اور دونوں بہترین براڈ کاسٹر بھی تھے یعنی گفتار کے غازی بھی بنے۔

ایک افواہ یہ بھی اڑادی گئی تھی کہ خواتین نہ شاعری کرسکتی ہیں نہ مزاح نگاری۔ یہ دونوں باتیں صریحاً غلط تھیں۔ مجھے ان کا سچ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ناقدین نے ر۔خ۔ش جیسی شاعرہ کو قطعاً نظر انداز کیا گو آج کے دور میں عزیز بانو وفا، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید جیسی دبنگ خواتین کی اہمیت سے منکر ہونے کی کس میں ہمت ہے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔ اب خواتین کو اپنے وجود ہی کے لیے معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔

اردو ادب کی وسعت اور رنگا رنگی اتنی حیرت انگیز ہے لیکن ہم اس کی اس خصوصیت کو عموماً یاد ہی نہیں رکھتے۔ اس سمینار میں طنز و مزاح کے مختلف پہلو اُجاگر کیے جائیں گے، جس سے ظاہر ہو سکے گا کہ اردو کا طلسماتی خزانہ بادشاہ سلیمان کے خزانے سے کم نہیں۔ محض اس کی جستجو اور حفاظت کی ضرورت ہے۔

(یہ اردو اکاڈمی دلّی کی طرف سے طنز و مزاح پر منعقد سمینار کا افتتاحی خطبہ ہے۔)

یہ خلد بریں ارمانوں کی — نہٹور

قصبہ نہٹور ضلع بجنور بھی شمالی ہند کے ان قصبوں میں شامل ہے جہاں صدیوں تک اردو زبان وادب کی آبیاری ہوتی رہی۔ قائم چاند پوری بھی نہٹور کے ایک پڑوسی قصبے کے باشندے تھے۔ عہد مغلیہ میں نہٹور اپنے سنسکرت پاٹھ شالہ اور عربی فارسی درس گاہ کے لیے خاصہ مشہور تھا۔ 1857 میں اس ضلع کے معرکوں کی داستان سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب 'سرکشی ضلع بجنور' میں اپنے زاویہ نگاہ سے بالتفصیل تحریر کی ہے۔ یہ فوج کشی ایک بڑے سماجی انقلاب کا پیش خیمہ تھی کیونکہ اس کے بعد انگریزوں کے خلاف لڑنے والوں کو احساس ہوا کہ جدید تعلیم کس قدر ضروری ہے اور وہ لوگ ابھی ذہنی طور پر قرونِ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کے پیغام کو گرم جوشی سے قبول کیا گیا۔ اس ضلع کے مختلف قصبہ جات کے افراد کو سرسید نے 'روٴسائے چاند پور، شرفائے نگینہ اور دانش مندان نہٹور' کے القاب سے یاد کیا۔

شمالی ہند کے زیادہ تر قصبات کے مانند نہٹور کی آبادی بھی مختلف طبقات میں منقسم تھی— زمین دار، کاری گر اور کسان۔ یہاں کے بنکروں کا تیار کردہ ریشمی اور سوتی کپڑا بھی بہت مشہور تھا۔ علاوہ ازیں ترائی کے جنگل کی لکڑی سے نہایت اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنایا جاتا تھا۔ اسی طرح اس

ضلع کی متعدد گھریلو صنعتیں بہت ترقی یافتہ اور مقبولِ خواص و عوام تھیں۔

1857 کے بعد جدید انگریزی تعلیم کو بھی یہاں لبیک کہا گیا۔ دیگر قصبہ جات اور دیہات کی مانند یہاں بھی فرقہ وارانہ کشمکش ابھی مفقود تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کی آبادی مختلف طبقات میں بٹی ہوئی تھی جو اشراف، کاری گر اور کسان کہلاتے تھے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی مذہبی روایات اور سماجی آداب کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ گاؤں کی کسی لڑکی کی شادی ہوتی تھی تو گاؤں والے باہر سے آنے والے براتیوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہو جاتے تھے۔ عموماً گاؤں والے لڑکی کے باپ کی دی ہوئی دعوت میں شریک نہیں ہوتے تھے تاکہ باپ پر مصارف کا بوجھ زیادہ نہ ہو۔ خود جب لڑکی کے گاؤں کا کوئی شخص اس کی سسرال کے گاؤں جاتا تھا تو وہاں ایک گلاس پانی بھی ناروا سمجھتا تھا کیونکہ قدیم روایات کے مطابق بیاہی بیٹی کے گھر کھانا پینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ قدیم رسوم دورِ حاضر میں رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ طرزِ معاشرت میں تبدیلی آگئی۔ صنعتی انقلاب نے بہت سے قدیم نظریات کو رد کر دیا ہے لیکن چند رواج جن میں پرانی شائستگی موجود ہے، اب بھی باقی ہے۔ پرانی روایات میں مذہبی رواداری اہم ترین خصوصیت تھی۔ کسی نے بہت صحیح کہا ہے کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھانے الگ الگ تھے لیکن دل ایک تھے۔ اب کھانے ایک ہو گئے ہیں اور دل الگ۔

قصبہ نہٹور میں شعر و شاعری کا چرچہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ مدرسوں کے نظامِ تعلیم میں فارسی لازماً شامل تھی۔ 1857 کے بعد انگریزی کا چرچہ ہوا۔ اس قصبے میں بھی نونہالانِ چمن علی گڑھ بھیجے گئے۔ سید احمد جو بعد میں سرسید کہلائے، ضلع بجنور میں بطور صدر امین تعینات تھے جو ایک جونیر سرکاری عہدہ تھا۔ یہیں ان کی ملاقات میر بندے علی سے ہوئی جو نہٹور کے زمین دار تھے اور تحصیل داری کے عہدے پر بھی فائز تھے لیکن اس زمانے میں یہ ایک بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔

ایامِ غدر میں میر صاحب جھانسی صدر میں تعینات تھے۔ عین اسی زمانے میں ایک ڈرامائی صورتِ حال پیدا ہوئی جس کا میں پہلے کئی بار تذکرہ کر چکی ہوں۔ یعنی ان کے چھوٹے بھائی میر احمد علی باغیوں میں شامل ہو گئے اور انگریزی فوج پر ہلّا بول دیا۔ موصوف نے چند ایک انگریزوں

کو دست بہ دست لڑائی میں تلوار کے گھاٹ بھی اتارا۔ شکست ہوئی۔ پکڑے گئے۔ بذریعے پھانسی سزائے موت کا حکم جاری کیا گیا۔ ان دنوں کیا وحشت ناک، خوف ناک، لرزہ خیز، بھیانک منظر رہا ہوگا۔ ہر طرف پھانسی کے کھمبے گڑے تھے اور ان کے تختے کھڑ کھڑا رہے تھے اور ہر طرف ان رسیوں کے پھندوں میں باغیوں کی لاشیں لرزاں تھیں۔ ہم اس دہشت ناک نظارے کا تصور بھی کس طرح کر سکتے ہیں لیکن یہ اس زمانے میں ایک روزمرہ کا سین تھا اور ان پھانسیوں کے آس پاس سے لال وردی والے گورے فوجی شہسوار دندناتے ہوئے نکل جاتے تھے اور عورتوں کی آہ وبکا کی جگر پاش آوازیں ہندستانی محلوں سے بلند ہوتی تھیں اور عین اسی وقت کچھ فاصلے پر سرسبز سول لائنز کی حسین خوش نما کوٹھیوں کے ڈرائنگ روم پیانو کے نغموں اور میموں اور گوروں کے قہقہوں سے معمور ہوتے تھے اور ان کوٹھیوں میں نیٹو بیرے، خانساماں اور چپراسی نہایت ادب سے اپنے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔ باہر دفتر میں نیٹو کرسچین اور بنگالی ہندو کلرک اپنا روزمرہ کا کام ختم کر کے اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔

ان پھانسی پانے والوں میں ہمارے آج کے خاندانوں کے بہت سے اجداد بھی شامل تھے۔ جب وہ تختہ دار پر لے جائے گئے تو وہ تو خیر شاید درجہ شہادت پر فائز ہونے کی وجہ سے مسرور رہے ہوں لیکن ان کے گھر والوں پر کیا گزری ہوگی۔

گو ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ رومن لایا انگریزی قانون کے نفاذ سے قبل شخصی حکومتوں کے زمانے میں بادشاہِ وقت کے حکم سے بھی ملزم کی گردن اڑا دی جاتی تھی۔ لکھنؤ میں ایک سر کٹا نالا آج بھی موجود ہے جہاں عہد رفتہ میں ملزم یا مجرم کا گلا کاٹ کر سر پانی میں بہا دیا جاتا تھا۔

ہمارے ننیہال میں ایک چھوٹی سی ریاست بھی شامل تھی۔ اس کی مالکن جنھیں ہم لوگ بوبو پکارتے تھے، کہا کرتی تھیں... ''بیٹا ملکہ نے ہمیں ایک خون معاف کر رکھا تھا۔'' (ملکہ مطلب کوئن وکٹوریہ) قاتل کو پھانسی دی جاتی تھی۔ میں نے بوبو کے قلعے میں وہ کنواں بچپن میں بہ چشم خود دیکھا ہے۔ اس میں لٹکا کر جلاد گردن کی رسی کھینچ لیتا تھا۔ وہ سزا تو کب کی موقوف ہو چکی تھی اور اس کنوئیں میں چونا بھر دیا گیا تھا۔

1857 میں شیکسپیئر اور ملٹن اور بائرن اور کیٹس پڑھنے والے انگریزوں نے ستائیس ہزار مسلمانوں کو پھانسی پر لٹکایا اور یہی قوم بعد میں ان کی نہایت وفادار مداح رعایا بنی۔ یہ تو بہت قریبی واقعہ ہے۔ محض ڈیڑھ سو سال پہلے کی بات ہے۔ متمدن تاریخ کے چھ سات ہزار سال کے دوران کیا کچھ ظلم و ستم آدمی نے آدمی پر روا رکھے، ان کا اندازہ لگانا ناممکن ہے کیونکہ انسان بھیڑیے سے زیادہ خطرناک جانور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علاقہ بجنور عہد قدیم میں راجہ بین نے آباد کیا جو ایک چکرورتی راجہ تھا اور اس کے نام کی ٹھکریاں ابھی تک بجنور، بدایوں، مراد آباد اور چمپارن اور شاہ آباد میں پائی گئی ہیں۔ یہ راجہ رام چندر جی والی ایودھیا کا ہم عصر اور نسلاً آدی واسی تھا۔ آج تک بین بنسی آبادیوں میں مغربی اضلاع کے کئی قبیلے شامل ہیں جو اہیر اور بانس پھوڑ وغیرہ کہلاتے ہیں۔ اس سرسبز علاقے میں کئی ندیاں بہتی ہیں۔ اس علاقے کے جنگلوں میں شیر کثرت سے پائے جاتے تھے اور یہاں کئی شکارگاہیں بھی بہت مشہور تھیں۔ گاگن اور مالن اس علاقے کی دو خوش منظر ندیاں ہیں جن میں سے ایک ندی مالن مہاکوی کالیداس کے شکنتلا ناٹک میں بہتی ہے۔ منڈاور میں عہد مہابھارت کے قدیم آشرم بھی موجود تھے۔ یہ قصبہ منڈاور شکنتلا ناٹک کی جائے وقوع ہے۔

منگول قبیلہ ماسکو پر حملہ کرنے کے ارادے سے منگولیہ سے نکلا تھا۔ راستے میں اس کے سردار نے سوچا اب اتنی دور ماسکو وغیرہ کون جاتا پھرے۔ وہ اپنے پیسے دار نمدے کے مخملوں کا کاروان لے کر بجنور آ پہنچے۔ عجیب لوگ تھے۔ کہاں ماسکو دریا، کہاں گاگن ندی۔ مگر وقت کا جلاہا اپنے کرگھے کے سامنے بیٹھا رنگ برنگے گل بوٹوں والے مشجر کے تھان یوں ہی بنتا چلا جاتا ہے۔ زمانے کے بنکر نے فارسی کارگاہ کو کرگھا بنا دیا اور وہ خود ایک محنت کش اور مظلوم کاریگر بن گیا جس نے امیروں کو زربفت اور کمخواب بن کر پہنائے اور خود موٹے جھوٹے گزری گاڑھے کے کپڑے پر گزر کرتا رہا۔

نہٹور عہد مغلیہ میں ایک مثالی خود کفیل قصبہ تھا جس کے مختلف محلے ان کے باسیوں کے پیشوں کی مناسبت سے مشہور تھے۔ مثلاً محلّہ تیرگراں کے لوگ اب آتش بازی کا سامان بناتے ہیں۔ اسی طرح محلّہ حکیماں، شیخاں، خواجگان، میاں صاحبان، کلالاں، انصاریاں، ماہی گیراں

وغیرہ آج تک اسی طرح آباد رہے ہیں۔ ہر محلے کی اپنی مسجد تھی اور ہندو محلوں میں ہنومان جی اور مہادیو جی کے مندر ایستادہ تھے۔ آئین اکبری میں علامہ ابوالفضل فرماتے ہیں کہ عہد مغلیہ میں جب مرکزی حکومت جنگ و جدال میں مصروف ہوتی تو علاقے کے جاگیردار چھ سواسی شہسوار اور پانچ ہزار چار سو پیادے فراہم کرتے ہیں۔ جزاک اللہ۔

اٹھارھویں صدی میں ایک روہیلا سردار نجیب الدولہ نے نجیب آباد بسایا۔ عہد جان کمپنی میں برطانوی کلچر نمایاں ہوئی۔ انگریزی اسکول اور کالج، دھوئیں کی گاڑی، ڈاک خانے، نوآبادیاتی نظام نے کنیڈا سے لے کر نیوزی لینڈ تک مختلف النوع نسلوں اور آبادیوں کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا۔ ہندستان کے جو مختلف اضلاع میں منقسم تھے ان میں بنیادی طور پر عہد مغلیہ کی انتظامی چھاپ برقرار رہی لیکن برطانوی حکومت نے اعلیٰ ترین مغلیہ عہدوں کی وقعت گھٹانے کے لیے ان کی موجودہ حیثیت کم ترین کر دی۔ مثلاً صوبے دار جو عہد مغلیہ میں صوبے کا گورنر تھا اب صوبے دار فوج کا ایک بہت ہی ادنیٰ درجے کا اہل کار کا عہدہ بنایا گیا۔ ملک کی آبادی اجتماعی طور پر احساسِ کم تری میں مبتلا ہو گئی۔ ضلع بجنور بھی برطانوی عہد کا ایک نمائندہ ضلع بنا جس کا اعلیٰ ترین افسر کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر کہلایا۔ اسی کے ماتحت متعدد ڈپٹی کلکٹر، تحصیل دار اور نائب تحصیل دار وغیرہ ہوتے تھے۔

اہلیانِ بجنور نے 1857 کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا تھا لیکن آپس کے نفاق کی وجہ سے بری طرح ناکام رہے تھے۔ حالت یہ تھی کہ نواب صاحب بریلی پورے زیورات اور زرق برق پوشاک پہن کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں پہنچے تھے۔ چنانچہ سرسید نے طے کر لیا تھا کہ جدید مغربی تعلیم کے بغیر ہندستان کی ترقی اور نجات ممکن نہیں۔ اہل نہٹور نے بھی اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ بھی ناکام رہے۔ چنانچہ اس قصبے کے مسلمان اور ہندو زمین داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی تعلیم وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر بھی جدید تعلیم کا چرچہ شروع ہوا اور سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قصبے کے نوجوان اور بزرگوں نے یہ طے کیا کہ لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

زنانہ ہفتہ وار اخبار 'تہذیب نسواں' 1898 سے لاہور میں شایع ہو رہا تھا اور پردہ نشین

خواتین بھی اس میں خوب خوب لکھ رہی تھیں۔ 1904 میں نہٹور کی ایک پردہ نشین لڑکی نے تہذیب نسواں میں ایک چھوٹی سی نظم شایع کی لیکن نام کا پردہ رکھا گیا اور ن ف از نہٹور کے نام سے نظم چھپی جن کا اصل نام نثار فاطمہ تھا اور یہ راقم الحروف کی والد کی فرسٹ کزن یعنی چچازاد بہن تھیں۔ بعد میں ہماری تائی بھی بنیں۔ یہ بات اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک مسلم اشرافیہ کی قدامت پرستی میں اتنی کمی آ چکی تھی کہ ان کے یہاں زنانہ رسالے آ رہے تھے اور ان کی لڑکیاں اس میں مضمون بھی لکھ رہی تھیں۔ لیکن اسی معاشرے کے ہندو اور عیسائی فرقوں میں لڑکیاں کافی عرصے سے اسکول اور کالج میں پڑھ رہی تھیں۔

مسلمانوں کی اتنی شدید قدامت پرستی کی وجہ محض 1857 میں ان کی شکست کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے وہ بے حد دل شکستہ تھے اور ان کی اس مایوسی اور غم و غصے میں اس وجہ سے اضافہ ہوا تھا کہ عیسائی مبلغین نے پسماندہ فرقوں کی چند لڑکیوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا اور اس گروہ میں چند غریب مسلمان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ عام مسلمانوں نے انگریزی تعلیم اور 'کرسٹان' بننے کو ہم معنی سمجھا۔ ہماری والدہ بتاتی تھیں کہ ان کی بچپن کی دوست مس زہرہ اور مس اختر قیصر کرسچین لڑکیاں تھیں جن کے والد مسلمان تھے لیکن انھوں نے اپنی عیسائی والدہ کا مذہب قبول کیا تھا۔

مسلم اشرافیہ کی پردہ نشین لڑکیوں کو یہی نیٹو کرسچین خواتین گھر پر انگریزی پڑھانے چلی آتی تھیں۔ انگریزی کے علاوہ مغربی خواتین کی گھریلو دست کاریاں کروشیا اور اون اور سلائیوں وغیرہ کا کام بھی یہی کرسچین استانیاں سکھا لیتی تھیں۔ مسلمان نوجوان جو زیادہ تر علی گڑھ اور دوسری درس گاہوں میں مغربی علوم سے فیض یاب ہو رہے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ان کی شادی بھی انگریزی جاننے والی لڑکی سے ہو۔ لہٰذا اواخر انیسویں صدی کے آغاز میں ہندستانی معاشرت میں رفتہ رفتہ تبدیلی آنے لگی۔ بنگالی، مرہٹے اور جنوبی ہند کے باشندے سیاسی اور سماجی وجوہ کی بنا پر بہت آگے نکل گئے۔ شمالی ہند میں آریہ سماج نے عورتوں کی ترقی کا بگل بجایا لیکن اس ساری تعمیر میں ایک صورت خرابی کی مضمر رہی۔ یعنی ترقی پا کر سرکاری اور غیر سرکاری مفادات کا حصول ایک واضح نصب العین بن گیا اور اس دور میں مختلف فرقوں کا آپس میں ٹکراؤ بھی ناگزیر تھا۔ سرکاری اسکولوں اور

کالجوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان ادارے قائم ہوئے جن کے ذریعے ہندو مسلم کشمکش کو فروغ حاصل ہوا۔ اکثریت اور اقلیت کے مابین ٹکراؤ بھی انیسویں صدی کی دین ہے۔ جب ساری متمدن دنیا کی آبادیوں میں نئی مغربی تعلیم کا چرچا شروع ہوا۔ جب ہم یورپ کے صنعتی اور ذہنی انقلاب کا تذکرہ کرتے ہیں اس وقت ہمیں شاید یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اہل مشرق خود اس انقلاب کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ مغربی علوم کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی صورت میں عیسائی مبلغین اور فاتحین کے ذریعے ہم تک پہنچے اور انھوں نے ہماری سوچ کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ ورنہ حالت یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ایک قانون کے ذریعے 'ستی' کی خوف ناک رسم کو بند کروانا پڑا۔

انگریز جب ہندستان آئے اور انھوں نے یہاں کے یہ حالات دیکھے کہ عورتوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے تو وہ ہندستانیوں کو وحشی نہ سمجھتے تو کیا سمجھتے۔ اگر آپ پرانی وکٹورین کتابیں پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ انگریز مصنفین کا عام ہندستانیوں کے متعلق ردعمل کیسا تھا۔ مشنری عورتوں کے ملفوظات آج پڑھیے تو ہمیں ان عورتوں پر بے انتہا غصہ آتا ہے۔ لیکن انھوں نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہی لکھا اور انگریزوں کے اس عام عقیدوں کو تقویت پہنچائی کہ اہل ہند پر راج کرنا اور انگریزی حکومت ان لوگوں کے لیے ایک عطیہ خداوندی ہے۔ ایک عام ہندستانی جس پر کوئی زمین دار یا صاحب ثروت آدمی ظلم کرتا تھا تو وہ شخص چلاتا ــــ "دہائی ہے کمپنی بہادر کی۔" لہٰذا کمپنی بہادر نے ایک عام نیٹو کے لیے بہ طور نجات دہندہ طاقت پکڑی اور سارے ملک پر اپنی حکومت بڑی آسانی سے قائم کر لی۔

نوجوان انگریزی تعلیم کے ذریعے دورِ حاضر سے متعارف ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ گوری چمڑی والوں کا رعب بھی ان پر غالب آیا۔ یہ بھی ایک فطری چیز تھی۔ اتنے عرصے اور اتنی ترقی کے بعد ہم آج بھی اہل مغرب بالخصوص انگریزوں اور امریکنوں سے مرعوب ہیں۔ کوئی نوجوان لندن یا امریکہ میں تعلیم حاصل کر کے واپس آتا ہے تو آج بھی اس کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ بہر حال ہم مجموعی طور پر مغرب سے دو تین سو سال پیچھے ہیں لیکن اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے اور اگر کوئی یہ اعتراف کرے تو اس پر ہمیں بہت غصہ آتا ہے لیکن کسی گورے سے بات کرتے

وقت ایک عام ہندستانی کے چہرے پر ایک نوع کی لجاجت آ جاتی ہے۔ یہ غیر شعوری احساسِ کم تری تین سو سال کی سیاسی اور ذہنی غلامی کی دین ہے۔ ایک عام ہندستانی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اسے برطانوی پاسپورٹ مل جائے۔ یہ ایک بہت ہی تکلیف دہ اور المناک صورت حال ہے۔ دو سال قبل کا واقعہ ہے۔ لندن کی ایک محفل میں برصغیر کی ایک خاتون اپنے انگشت شہادت میں اپنی کار کی کنجی زور زور سے گھما رہی تھیں تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے پاس ایک کار بھی ہے بلکہ وہ اسے خود ہی چلاتی ہیں اور لندن میں کار چلاتی ہیں۔ یہ کتنی عظیم الشان بات ہے۔

ہماری پوری نو آبادیاتی تاریخ نے یہ بچکانی ذہنیت پیدا کی ہے۔ انگلستان یا امریکہ میں رہنا ہمارے لیے بہت ہی قابل فخر بات ہے۔ روس یا مشرقی یورپ کو ہم اتنا اہم نہیں سمجھتے۔ ماسکو میں رہنے والا ہندستانی بندہ نیو یارک یا لندن والے ہندستانی کے مقابلے میں کوئی سرخاب کا پر نہیں لگاتا اور یہ واقعہ بھی ہے کہ برطانیہ اور امریکہ وغیرہ کے مقابلے میں مشرقی یورپ اور روس کے سابقہ کیمونسٹ دیس خاصے پسماندہ ہیں۔ تو سوچنے والوں نے پوچھا کہ کیمونزم خود روس وغیرہ میں کیوں فیل ہوئی۔ میں شاید پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ اگر فیض صاحب یا علی سردار جعفری وغیرہ آج زندہ ہوتے تو وہ کیا سوچتے اور کیا کہتے لیکن اس بات کا ایک جواب ہماری چند برگزیدہ سابق کیمونسٹ دوستوں کے پاس موجود ہے۔ وہ کہتی ہیں:

> ''ہم تو اس وقت بھی ان کی بہت سی باتوں سے متفق نہیں تھے۔''

حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ سابقہ اشتمالی یا ہم سفر خواتین و حضرات اس زمانے میں ماسکو سے سو فیصدی ہم نوا تھے۔ نور جہاں کا ایک گیت ایک زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا:

جہاں بدلا وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

اگلا مصرعہ مجھے یاد نہیں لیکن اس کے آخری الفاظ تھے:

یوں ہی دنیا بدلتی ہے اسی کا نام دنیا ہے
کبھی سکھ ہے کبھی دکھ ہے ابھی کیا تھا ابھی کیا ہے

میں نام نہیں لوں گی مگر ایک ہمارے بہت عزیز اور بہت سینئر دوست بلکہ بزرگ تھے جو پارٹی کے اعلیٰ ترین قائدین میں شامل تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ابھی روس جا کے آئی ہوں، تو وہاں مجھے اندازہ ہوا کہ بہت سی چیزوں کے متعلق غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا "مغرب والے جھوٹ بولتے ہیں تو ہم بھی جوٹ بولتے ہیں۔"

قصبہ نہٹور سے بہر حال گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں متعدد نسلیں اعلیٰ تعلیم یافتہ نکلیں اور سو سال قبل سے وہاں تعلیم نسواں کا چرچہ شروع ہوا جو اس وقت کے لحاظ سے خاصی غیر معمولی بات تھی۔ دوسری اہم بات یہ رہی ہے کہ بیش تر قصبہ جات اور دیہات کی طرح یہاں بھی ہندو مسلم کشیدگی کبھی نہیں رہی جو شہری سیاست کی دین ہے۔ دیہات اور قصبہ جات میں پرانی بھائی چارے کی روایات کا آج بھی احترام کیا جاتا ہے۔ نہٹور بہر حال اس اعتبار سے بھی ایک مثالی قصبہ ہے۔ اس قصبے کے بہت سے افراد مغربی ممالک میں بھی جا بسے ہیں اور پاس پڑوس کے ملکوں میں بھی آباد ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے آبائی قصبے کی تہذیبی روایات کو فراموش نہیں کیا اور جن لوگوں کو موقع ملتا ہے وہ یہاں آ بھی جاتے ہیں۔

ایک بار میں نے اس وقت کے سوویت آذر بائیجان کے دیہات میں دیکھا تھا کہ دو بوڑھے میاں بیوی جو امریکن لہجے میں بات کر رہے تھے، ایک بنچ پر بیٹھے کوہ ارارات کا نظارہ کرنے میں محو تھے جو کچھ فاصلے پر ترکی کی سرزمین میں ایستادہ تھا۔ انھوں نے بتلایا کہ وہ نوعمری میں روس سے ہجرت کر کے امریکہ چلے گئے تھے اور اب اپنے وطن کی سیر کے لیے آئے ہیں اور کوہ ارارات کی زیارت بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر تھا کہ یہ پہاڑ ان کے لیے اب بھی اتنا ہی مقدس تھا جتنا ان کے پرکھوں کے لیے مقدس رہا ہوگا۔ وقت کے دھارے دنیا کے نقشے بدل دیتے ہیں لیکن مقامات کی اہمیت اور ان کے ساتھ انسانوں کے جذباتی رشتے اکثر باقی رہ جاتے ہیں۔

('گل صد برگ' مرتبہ مجیب الرحمان)

سید سجاد حیدر

ہمارے موجودہ شور رستا خیز میں سجاد حیدر کی رحلت کا سانحہ کچھ دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس کیا تو صرف انھی لوگوں نے جن کے لیے ان کی موت ایک ذاتی صدمہ تھی۔ یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس پر کوئی نعرہ چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ واقعہ کہ ان کی موت پر اتنی خاموشی رہی المناک ضرور ہے۔ اردو ادب پر ان کا اثر بہت عظیم تھا۔ بڑی شوخی اور بڑے لطف کے ساتھ انھوں نے اردو زبان و ادب کے بوڑھے چہرے کو جوانی اور تر و تازگی بخشی اور گو ان کے تجربے کی جسارت کو اب تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے لیکن رنگ روپ کی بہت سی لطافتیں جو انھوں نے پیدا کیں، ابھی باقی ہیں۔

انھوں نے بہت زیادہ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تخلیقات جو کتابوں کی صورت میں شائع ہوئیں، سال گرہ کے ایک کم قیمت تحفے کے طور پر ایک چھوٹے سے ستھرے پیکٹ میں سما سکتی ہیں۔ چند افسانے اور مختصر ناول، چند ڈرامے، کچھ مضامین تنقیدی یا محض مقالات، کچھ ہلکے پھلکے خاکے، شاید کچھ نظمیں اور بس۔ اس کے علاوہ جو کچھ انھوں نے لکھا... اور وہ بھی زیادہ نہ تھا... وہ اس دور کے مقتدر ماہناموں، مخزن، علی گڑھ میگزین اور معارف کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے اور

ان کے مسودات میں چند ایک کبھی کبھار لکھی ہوئی نظمیں بھی ضرور موجود ہوں گی جو شایع کبھی نہ ہوئیں۔

وہ بھاری بھر کم نہیں بلکہ رواں و جواں ادیب تھے لیکن معمولی ہرگز نہ تھے اور اتنا ہمیں بھی معلوم ہے کہ ان کے ادب کی زندگی چند روزہ نہیں۔

'خیالستان' ان کی سب سے مشہور تصنیف ہے۔ اس کی ترتیب اور عنوان دونوں کا خیال انھیں ان کے ادبی دوست اور مداح میر غلام بھیک نیرنگ نے دلایا تھا اور یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اردو کی ایسی مقبول تصنیف بن گیا جو بڑی رغبت سے بار بار پڑھی گئی۔ آج ہم اس سے ایک سنگ میل کی حیثیت سے واقف ہیں اور جب ادبی فیشن بدلے گا اور شاید لوگ 'خیالستان' کے شستہ اور شائستہ حسن کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اس وقت بھی ہمیں ادبی مطالعے کی خاطر اسی کتاب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور یہیں ان خصوصیات کا سراغ ملے گا جنھوں نے بڑی حد تک اردو کو اس کا دم خم اور لوچ بخشا ہے۔

سجاد حیدر نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصے تک زندہ رہے۔ جوان ہو کر انھوں نے خود کو ہندستانی مسلمانوں کے تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے تموج میں رواں دواں پایا اور اگر آپ اس سے کم جوشیلے الفاظ برتنا چاہیں تو یہ کہیے کہ وہ مسلمانوں کی نئی خود آگاہی کے دھارے میں شامل تھے اور اختتام صدی کے اس عہد انقلاب میں ان کا دم قدم بھی شریک تھا جس میں اس ملک کے مسلمان داخل ہو رہے تھے۔ وہ اس دور کی پیداوار بھی تھے اور سمبل بھی۔ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور ساری زندگی ان کو نہایت فخر کے ساتھ اس دل پذیر گروہ میں شامل سمجھا گیا جس نے اس مرکز سے باہر آ کر ایک نئے مسلم طرز فکر اور طرز زندگی کی تحریک کی تزئین کی۔ ابھی ہم اس عہد سے اتنے قریب ہیں کہ غالباً آسانی سے یہ نہیں جان سکتے کہ اس تحریک و تزئین کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل کے مورخ کو اس اولین دور میں اس قوی وجاہت اور امید کو دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا ضرور کارفرما نظر آئے گی جو سلطنت مغلیہ کے آخری نام لیواؤں کے بعد ہندستانی مسلمان اپنی زندگیوں میں کھو چکے تھے۔

اقتدار کی خواہش بعد کے عہد میں پیدا ہوئی اور اس میں سجاد حیدر اور ان کے ہم عصر شریک نہ تھے لہٰذا عمرانیات کے لحاظ سے اقبال کے برعکس سجاد حیدر موجودہ دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ اقبال دونوں ادوار میں شامل تھے چنانچہ وہ عظیم ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ لوگوں کی زبانوں پر رہے لیکن سجاد حیدر کی ادبی اہمیت بہر صورت قائم ہے۔

وہ اس نسل کے فرد تھے جس نے مسلمانوں کی زندگی میں ایک ترکیب نو پیدا کرنا چاہی۔ اس کے اجزائے ترکیبی قدیم و جدید، مغرب اور مشرق، سائنس اور مذہب، عربی اور انگریزی پر مشتمل تھے۔ یہی نظریہ تھا جس نے علی گڑھ اکیڈمی کے لیے 'اینگلو اورینٹل' کا نام اختراع کیا۔ اس نظریے کے چند مظاہر نے اکبرالٰہ آبادی کے ایسے لوگوں کو بہت ملول کیا مگر وقت آگے بڑھتا گیا اور جدید مدنیت کے پیغمبر اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

اس جدید مدنیت و شائستگی کے لیے سجاد حیدر نے ایک متناسب اور مناسب طور پر ترقی پسندانہ نگارشِ جمیل سے اردو زبان کو روشناس کیا۔ ترکی ٹوپی، مغل شیروانی اور انگریزی پتلون میں ملبوس نوجوان ادیبوں کی ایک پوری نسل اس طرزِ تحریر کی طرف جوش وخروش سے لپکی گویا صرف یہی چیز تھی جس کا وہ اب تک انتظار کر رہے تھے اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اس میں وہ سب کچھ موجود تھا جس کی انھیں آرزو تھی۔ یہ اردو تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں ایک واضح مغربی رنگ بھی موجود تھا۔ الفاظ عربی اور فارسی کے تھے لیکن...اے لیجیے...! پل کی پل میں الفاظ کی سختی اور بھاری پن غائب ہو گیا...!! گویا کسی نے ملٹن کے زورِ بیان میں آسکر وائلڈ کے رنگ کی آمیزش کر دی ہو!

قومی نو جیون کے ساتھ تجدیدِ ماضی کے خواہش مند نوجوانوں نے اس نئے اندازِ تحریر کو بڑے غرور اور بڑے پیار سے اپنایا...ان کو مسرت اس بات کی تھی کہ یہ طرزِ تحریر نفیس، ترقی پسند، نرم و نازک اور آزاد خیال تھا۔ مغرور اس وجہ سے تھے کہ یہ طرزِ تحریر قوم کے شاندار ماضی سے بھی وابستہ تھا، مشرقی تھا۔

ترکی نئے امتزاج کا سمبل تھا۔ ترکی جو مشرق اور مغرب کا تہذیبی سنگم واقع تھا! یا کم از کم لوگ یہی تصور کرتے تھے۔ لہٰذا یہ بات معنی خیز ہے کہ سجاد حیدر نے اتنی لگن کے ساتھ ترکی یا کم از کم

ہندی مسلمانوں کے اس آدرش کی اپنی تحریروں میں جھلک دکھلائی۔

ان کی بیش تر کہانیاں اور ڈرامے 'تراجم' ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اصل تصانیف سے ان 'تراجم' کا مقابلہ کیا گیا ہے یا نہیں۔ اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سجاد حیدر نے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مترجم ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے یا یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ یہ 'تراجم' دراصل تقریباً طبع زاد تخلیقات ہیں اور جتنا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں۔ ان کی ترغیب سجاد حیدر کو ترکی کے معاشرتی پس منظر نے دلائی کیونکہ جدید مدنیت یورپین کے بجائے ترکی لیبل کے ساتھ کہیں زیادہ دل آویز نظر آ سکتی تھی، گویا مسلمان نوجوان اپنے تصورات کو ایسے انداز میں پیش کرنا چاہتا تھا جنھیں اجنبی نہ کہا جا سکے۔ اس دور سے پورم پور تعلق رکھنے کی وجہ سے سجاد حیدر نے خود اس کشش کو محسوس کیا اور اسے ایک ادبی روپ میں ڈھال کر اپنی نسل کے نثر نگاروں کے سامنے ایک ایسے دلنشیں سمجھوتے کی شکل میں پیش کر دیا جسے نہایت جوش و خروش کے ساتھ قبول کیا گیا۔ انھوں نے ایک ترکی قلمی نام یلدرم اختیار کیا جس نے قلمی نام اختیار کرنے کے نئے فیشن کی بنا ڈالی۔ یہ تفصیل گو غیر اہم ہے لیکن اپنی جگہ پر ایک علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس عہد میں الفاظ کے نت نئے روپ دریافت کیے جا رہے تھے۔ نئے سمبل تلاش کیے گئے جنھیں تصورات اور نئے آدرشوں کے اظہار کے لیے تراشا اور سنوارا گیا۔ نئے رجحان، نئے جذبات و احساسات نئی پرمسرت تخلیقی طرز زندگی کے حصول کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ پرانے لکھنے والوں نے ادب عالیہ اور قدیم کلاسیک کھود نکالے اور وطن پرست سیاحوں اور محققوں کی مانند ہمیشہ نئے نئے خزانے لے کر اپنے دیس کو لوٹے۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، اقبال... اور ان سے زیادہ واقعیت پسند مصنف... شبلی، نثر نگار حالی اور سرسید احمد خاں... سب کے سب کسی نہ کسی طور پر زبان کو مالا مال کرنے کی خاطر دور دور کی سیاحتوں پر نکلے۔ سجاد حیدر کا میدان ان کے مقابلے میں زیادہ بے تکلف اور ذاتی ہے۔ شائستہ، خوش ذوق اور پرتکلف طرز معاشرت، شستہ

مذاق، رعنائی خیال، نزاکت جذبات اور رومانی حسن کے اظہار کے لیے سجاد حیدر نے ایک نئی زبان کا تار و پود جمع کیا اور اسے پروان چڑھایا اور اردو نثر کو ایک ایسی مدھر تاعطا کی جو اب تک محض شاعری سے ہی منسوب کی جاتی تھی۔ انھوں نے زبان کو ایک نیا ترنم اور آہنگ اور وزن بخشا جس نے بہت سے خوابیدہ جملوں کو جگایا اور اس بے کیفی اور مجہولی کو دور کیا جو نثر پر چھا چکی تھی۔

یہ ایک ایسا دل آویز موضوع ہے کہ بری طرح جی چاہتا ہے اس پر تفصیل سے گفتگو کیجیے مگر یہ سطور ایک ایسے دلکش اور جوان طبیعت ادیب کے لیے نذر عقیدت کے طور پر لکھی گئی ہیں جو اب دنیا میں موجود نہیں رہا۔ یہ تنقیدی جائزہ نہیں ہے اور میں اس کی کوتاہیوں کا معترف ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میرے پڑھنے والے بھی ان کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں گے۔

('نقوش' لاہور، شخصیات نمبر، شمارہ 47-48، جنوری 1955
پطرس بخاری کے انگریزی مضمون کا ترجمہ قرۃ العین حیدر نے کیا ہے۔)

تین جاپانی کھیل

جاپان کا نوہ ڈرامہ ساری دنیا کے ڈرامیٹک آرٹ سے مختلف اور منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اسے اکثر قدیم یونانی ٹریجڈی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مگر نوہ اور یونانی ٹریجڈی میں بھی بہت فرق ہے وہ جاپانی جنھوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں 'چار کی رسم' کی اس لیے بنا ڈالی کہ چپ چاپ بیٹھ کر لوبان کی خاموش آواز کو سنیں اور حضور قلب حاصل کریں۔ اس عجیب، وغریب آرٹ فارم کے خالق ہیں۔ آرٹ اہل جاپان کے نزدیک مجمد زین ہے اور بدھ مت کا وہ مدرسۂ فکر ہے جس میں دھیان ہی سب کچھ ہے (یہ زین یعنی دھیان کا مذہب ہند قدیم میں ظہور میں آیا ۔ چین میں اس کی مزید نشو ونما ہوئی اور جاپان میں اسے ایک باضابطہ نظام زندگی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ زین کے نزدیک جہاں کہیں شعریت ہے۔ خدا کے قرب کا احساس ہے۔ اعلیٰ جذبہ ہے فطرت اور انسان کا اتحاد ہے وہاں زین موجود ہے اس لحاظ سے ساری جاپانی اور چینی مصوری زین ہے۔ یسوع مسیح میں زین موجود تھا۔ اور ایک ہارٹ میں، اور باخ کی موسیقی میں اور ہومر اور چاسر شیکسپیر، اور ورڈز ورتھ میں۔ ڈون کی خوٹ کے کردار اور ملٹن کے شیطان میں بھی زین مل جاتا ہے۔ "کتے کے خوف سے بھاگتا ہوا چور بھی زین ہے چاند کو تکتا ہوا شاعر بھی زین ہے کھانا

کھانا پانی پینا ہر شے میں زین ہے۔ زین کے نزدیک قصائی کی دوکان اور کوڑے کے ڈھیر میں بھی حسن موجود ہے گھوڑے کے زنگ آلود نعل میں بھی بدھ کی فطرت موجود ہے ہر چیز کی قدر و قیمت یکساں ہے کیونکہ ہر چیز کی قدر و قیمت بے حد و حساب ہے۔ اگر آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے اگر نہیں سمجھ سکتے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جاپانی شاعری کی خصوصیت دیکھیے خزاں کا موسم، چاندنی، پھولوں کا کھلنا، جگنو کا پر، جھینگر کی آواز، کیچڑ میں پڑے ہوئے خربوزے، پتے پر رینگتا کیچوا، ہر شے میں معنی ہیں، ہر شے کی قیمت ہے، یہ سب چیزیں ذات مطلق کی مظہر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ بذات خود اہم ہیں۔ زین کی روشنی میں ہم فطرت کے متعلق جاپان کے رویے، کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

جھینگر، جو گاتے گاتے

ختم ہو گیا۔

یہ باشو کی مکمل نظم ہے اس طرح شیکسپئر پانی میں، ویبسٹر مٹی میں، سز کیمپ اچار میں، بدھ پھول میں اور باشو مینڈک میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوئی کی تفریق مٹانا زین ہے اس فلسفے کو HIGELIAN ABBSOLUTE بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ عملیت پرستی بھی مسئلہ جبریت بھی۔ یہ جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ زین تصوف اور وحدت الوجود سے جداگانہ ہے صوفی حقیقت کو دیکھنے کے لیے مجاز کو بطور دوربین استعمال کرتے ہیں زین محض دوربین سے لولگاتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ حقیقت اور عینیت کی تفریق زین کے نقطۂ نظر سے سارے شر کی بنیاد ہے۔ زین نے لفظ کا بھی بہت بڑا فلسفہ تیار کیا ہے۔ بدھ ازم کے خیال میں انسانی جسم ایک ایسا مکان ہے جس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم باتیں کرتے رہتے ہیں اور مکان جلتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر ایک روز جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ''میں پہاڑوں، درختوں، مکانوں اور انسانوں کی سنگت میں بے حد سکھی تھا۔ پھر میں نے بولنا شروع کیا اور سارا سحر زائل ہو گیا۔'' مہاتما بدھ خاموش تھے۔ لیکن انھوں نے سب کچھ سمجھا دیا، کاشو نے کچھ نہیں سنا، لیکن سب کچھ سمجھ گیا۔ تشبیہ و استعارے جب PASSION-INSPIRED ہوں تب ان چیزوں کی یکسانیت کا اظہار کرتے ہیں جنھیں منطقی

ذہن نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ زین ذہن وروح کی مکمل آزادی ہے تناقض اس فلسفے کی ایک اور خصوصیت ہے۔ زبان دو مختلف معنیٰ بیک وقت بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس لحاظ سے موسیقی میں الفاظ سے زیادہ شکتی ہے۔ کیونکہ دو مختلف نغمے بیک وقت ہارمنی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ زین حیاتِ انسانی کے تناقض حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مختلف معانی، اور تشریحات میں الجھ کر حقیقت سے دور جا پڑنے کے بجائے زین کے ذریعے ساری منطق ساری ظاہری استقامت کی فصلیں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتی ہیں اور اس طرح ہم اس نقطے تک پہنچ جاتے ہیں جو الفاظ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تناقض ذہن کی اس آزادی کا علمبردار ہے کہ آپ جس چیز کو جو قیمت چاہے عطا کیجیے یا نہ کیجیے۔ استغنا اور بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اہل زین کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر کہیں راہ میں مہاتما بدھ یا دردما (دھرم) سے ملاقات ہو تو انھیں فوراً مار ڈالو۔ اس کے باوجود زین روحانی انارکی نہیں۔ یہ محض خیر وشر سے بالاتر اور اضافیت سے ماورا ہے۔ احمق، بوڑھے اور بچے زین کے لاڈلے ہیں کیونکہ فطرت سے قریب تر ہیں۔ اس مذہب کے نزدیک زندگی نہ فانی ہے نہ لازوال زندگی محض زندگی ہے۔ جس طرح بھادوں کی بجلی محض بھادوں کی بجلی ہے۔ مکمل طور پر مفلس، بچوں کی طرح بھولے اور احمقانہ دل ودماغ کا مالک انسان کا جو زین تصور ہے۔ قرون وسطیٰ کے کیتھولک صوفیوں کے ذہنی اور روحانی عجز سے نزدیک تر ہے۔ زین اخلاقی فیصلے بھی صادر نہیں کرتا۔ اندرونی ارتقا کی اس اسٹیج پر پہنچ کر خدا اور حیاتِ جاوید دونوں غیر ضروری ہو جاتے ہیں (اسی وجہ سے ایک زین پجاری نے ایک جگہ سوال کیا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہاتھ میں کنول کا پھول کیوں اٹھایا۔ کوئی پرانا جوتا کیوں نہیں اٹھایا؟)

قصہ مختصر، نوہ اسی جاپانی ذہن کی تخلیق ہے جس نے زین کو قبول کیا۔ اس کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی مگر چودھویں صدی عیسوی میں نوہ ڈرامہ پہلی مرتبہ پروہتوں نے تصنیف کیا۔ اور شروع شروع میں ہم عصر مغربی MIRACLE اور MYSTERY تمثیلوں کی طرح یہ کھیل بھی مندروں میں اسٹیج کیے جاتے رہے شنتو مندروں کے مذہبی رقص، درباری رزمیہ رقص اور بدھ مندروں کے متبرک پنٹو مائم نے مل جل کر اس فن کو آگے بڑھایا اس وقت بدھ مت کے مندروں

میں ہندو مذہب اور چینی اثرات کی عمل داری تھی۔ اس لیے شروع شروع میں نوہ ڈرامہ شنتو حلقوں ہی میں محدود رہا۔ شوگن عہد میں (جس میں فیوڈل وار لارڈز شہنشاہ سے سیاسی اور فوجی طاقت چھین کر ملک کے اصل حکمران بن بیٹھے تھے اور محض برائے نام بادشاہت کرتا تھا) نوہ کو عروج ملا۔
''یہ بے حد رومینٹک دور تھا۔ سارا ملک طرح طرح کی دلآویز حکایتوں، دلاوری کے قصوں اور افسانوں سے گونج رہا تھا۔ پندرھویں صدی میں نئی بدھ تہذیب نے جو دھیان اور فطرت کے شاعرانہ ادراک پر مبنی تھی، یعنی زین تھی، شنتو مندروں میں پرورش پانے والے نوہ ڈرامے کو ایک اخلاقی مقصد اور ایک نفسیاتی وسعت بخشی اور اسے 'ڈرامہ آف کیریکٹر' بنایا۔ شنتو الوہی رقص، درباری غنائیہ شاعری، دیہاتی نوٹنکی، رزمیہ شان وشوکت سبھی چیزیں اس میں شامل ہو گئیں۔''

نوہ کی ساری خوبصورتی اس کے مرتکز ہونے میں ہے۔ بے ملبوسات حرکات وسکنات، اشعار، موسیقی، رقص، سب مل جل کر دیکھنے والے پر ایک مجموعی تاثیر پیدا کرتی ہیں۔ یہ بھی ایک مشرقی خصوصیت ہے۔ مشرق میں آرٹ فارم کو بقول شخصے CONDENSE کر دیا گیا ہے۔ (ایرانی اور مغل مصوری، جاپانی ہیکو نظمیں)

نوہ مصنفوں کا خیال ہے کہ جذبات خیال سے وابستہ ہیں شخصیت سے نہیں، انسان کی اندر کی آتما نوہ کا خاص کردار ہے یہ ڈرامے ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے اور آج تک اسی روائتی انداز سے اسٹیج کیے جاتے ہیں۔ ان کے مصنف بھی، جو زیادہ تر راہب او، پروہت تھے، خالص مشرقی شان سے گمنان مر گئے، ''لیکن ان کی یہ تصانیف پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنے بڑے ماہر نفسیات تھے۔ رفعت کردار جو ٹریجڈی کی خصوصیت ہے، نوہ تمثیل میں بے حد ماورائی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ بودھی ستوا، دیو، اہل عناصر، جن، پریاں، جانوروں کی روحیں، ارواح خبیثہ، سمندر اور دریاؤں میں رہنے والے اژدہے دیوت، چاندنی اور پھولوں اور درختوں کی روحیں، شراب اور آگ میں رہنے والی آتمائیں خیال کے نصف ہیولے، خواب کی پرچھائیاں، یہ سب نوہ کے کردار ہیں۔''

نوہ کے شروع میں چیف ایکٹر اپنا شجرہ نسب سناتا ہے اور عہد رفتہ کے ان شہنشاہوں کی

قصیدہ خوانی کرتا ہے۔ جن کے درباروں میں اس کے پرکھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے یہاں کے گائیکوں کے گھرانوں کی طرح نوہ ایکٹر بھی خاندانی اداکار ہوتا ہے، ایک غیر ملکی کے لیے ان تمثیلوں کی روح میں اترنا خاصا مشکل ہے۔ جس طرح ہمارے راگ راگنیوں کو سمجھنا ہر غیر ملکی کے بس کی بات نہیں۔

نوہ اسٹیج کرنا اور دیکھنا بڑا رئیسانہ مشغلہ تھا۔ کیونکہ شوگن دربار اس فن کا سرپرست تھا۔ اسی وجہ سے اس کی زبان بھی بے حد پر تکلف اور نفیس ہے۔ شوگن دور میں ان کی گدی نشینی اور شادی بیاہ کے موقع پر اور بدھ تہواروں کے زمانے میں نوہ چار چار دن تک مسلسل اسٹیج کیے جاتے تھے۔ پانچویں دن عوام کے لیے اس کے دروازے وا کردیے جاتے تھے اور یدو (موجودہ ٹوکیو) کی آٹھ سو آٹھ سڑکوں کے افسر ایک ایک کاغذی قندیل اٹھائے (جس پر اس سڑک کا نام لکھا ہوتا تھا) اپنے محلوں والوں کو ساتھ لے کر جلوس کی شکل میں کھیل دیکھنے آتے تھے[1]۔ حقیقت پسند نقالی یا زندگی کی عکاسی کرنے والے تھیٹر کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اسے ''عام تھیٹر'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علامتی اور رمزیہ اسٹیج اداکار اور آڈینس دونوں کے لیے قابل تکریم تھی۔

نوہ شاستر کے لحاظ سے ایک تمثیل پانچ حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔

(1) شوگین۔ یعنی دیوتاؤں کا نوہ۔

(2) رزمیہ نوہ۔ کیونکہ دیوتاؤں اور شہنشاہوں نے اپنے تیر و کمان کے ذریعے وطن مقدس کو بچایا اور شیاطین کو زیر کر کے امن قائم کیا۔

(3) عورتوں کا یا رومانی نوہ۔ کیونکہ امن کے زمانے میں محبت کی جاسکتی ہے۔

(4) روحوں کا نوہ۔ جنگ کے بعد امن اور شان و شوکت حاصل ہوتی ہے۔ مگر وہ چند روزہ اور سخت ناقابل اعتبار ہے۔

اور دنیا فانی ہے۔ ''لہٰذا چوتھے قسم کے نوہ کے ذریعے ہم مہاتما بدھ پر دھیان کرتے ہیں۔ اس نوع کے نوہ کو موضوع کے اعتبار سے بیکراں کہاں جاتا ہے اور اسے شاستر کا درجہ حاصل ہے۔''

(5) اخلاقی نوہ

(6) آخری حصے میں امرا اور اداکاروں کو تہنیت پیش کرنے کے بعد دوبارہ خداؤں کی تقدیس کی جاتی ہے۔

اس طرح نوہ ساری زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ان اقسام میں نمبر ۴ یعنی روحوں کا نوہ نفسیات کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے (میں نے ان ہی میں سے تین کا ترجمہ کیا ہے۔)

نوہ اداکاری کے قوانین بے حد کٹھن ہیں جس سے ذرا سا انحراف بھی ممکن نہیں۔ اس اداکاری کے لیے زندگی کی نقالی کے بجائے زندگی کو اندر سے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ نوہ کہاوت ہے کہ دل نوہ کا اصل فارم ہے، ماسک اس فن کی خصوصیت ہے اور بذات خود اعلیٰ ترین فن ہے۔ ایک بڑا اداکار ماسک کو زندگی بخش دیتا ہے۔ بوڑھے اور عورتیں ماسک پہنتی ہیں، ہیروئن کا رول ہمیشہ مرد ادا کرتا ہے۔ نوہ کے ماسک پر برنجت نے یہ غیر معمولی اشعار لکھے ہیں:

میرے سامنے دیوار پر ایک راکھشس
کا سنہرا ماسک آویزاں ہے
اس کی کنپٹیوں کی ابھری رگیں دیکھ کر مجھے
خیال آیا۔ بد ہونا خود اپنے لیے
کتنی بڑی اذیت ہے۔

بدی کے پیچھے انسان کو کتنی جان ہارنی پڑتی ہے۔ اسٹیج پر صرف ایک پائن کے درخت کی تصویر ہوتی ہے۔ پائن زندگی کے ناقابل تغیر ہونے کی علامت ہے چونکہ ہمیشہ سرسبز رہتا ہے باقی اسٹیج بالکل خالی ہوتا ہے۔ دونوں طرف برآمدے اور سامنے ایک پل ہوتا ہے۔ پردے نہیں ہوتے (نوہ اسٹیج کا تذکرہ میں 'ستمبر کا چاند' میں بھی کر چکی ہوں) کھیل عموماً کسی کردار کے سفر پر جانے سے شروع ہوتا ہے، پل پر سے گزرتے ہوئے وہ اناؤنس کرتا ہے کہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ اکثر کردار اپنی علامتی حرکات و سکنات کا مطلب بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ نوہ کے آخری الفاظ اکثر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ عموماً رقص پر کھیل کا اختتام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پڑھتے وقت ممکن ہے ان تمثیلوں کا خاتمہ ہمیں بے ربط سا معلوم ہوگا۔

نوہ کی وجہ جذبات میں ہے۔ ہم اسے UNITY OF IMAGE وحدت تخیل کہہ سکتے ہیں۔ نوہ خالص روح کی تمثیل ہے۔ اس لیے دوسرے آرٹ فارمز سے بلند تر ہے۔ ایک نوہ ادا کار کو بڑا فنکار بننے کے لیے ایک پا کباز اور اونچے درجے کا انسان بھی بننا پڑتا ہے۔ اسٹیج پر نوہ دیکھنے کی کیفیت ایسی ہے گویا موسیقی سنی جا رہی ہو۔

مغرب میں تجدید رومانیت اور CELTIC REVIVAL کے ساتھ ساتھ مشرق کو بھی دوبارہ تلاش کیا گیا۔ یہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ جاپانی مصوری اور شاعری نے امپریشنزم اور امیجسٹ تحریکوں کو متاثر کیا۔ ٹیگور اور ویدانت نے مغربی ادیبوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس زمانے کی سمبالک شاعری اور ڈرامے میں بالخصوص ییٹس رومان پرست انقلابی تھے جو باغی آئرلینڈ کی دکھی قوم کی نئی علامتوں کے ذریعہ ترجمانی کرنے میں مصروف تھے اسی زمانے میں امریکن امیجسٹ شاعر ایذرا پاؤنڈ نے نوہ ڈرامہ 'دریافت' کیا ییٹس کے لیے نوہ ڈرامے میں وہ سب کچھ تھا جس کی انھیں اور ڈبلن کے ایبے تھیٹر والوں کو تلاش تھی کرداروں کی جگہ اس تمثیل میں سمبلز نے سنبھال لی تھی۔ ییٹس نے خواب اور حقیقت کو ماسک میں متحد کیا۔ اور کئی ڈرامے نوہ تکنیک میں لکھے جو ان کے DANCER PLAYS کہلائے۔ ییٹس کی تمنا تھی کہ ڈرامے کو شعر کا درجہ بھی حاصل ہو سکے۔ اپنی ایک تمثیل AT THE HAWK'S WELL کے متعلق انھوں نے لکھا:

میرا یہ ڈرامہ ایک جاپانی رقاص کی وجہ سے ممکن ہوا جسے میں نے ایک اسٹوڈیو میں ایک ڈرائنگ روم میں اور ایک بیحد چھوٹی سی اسٹیج پر ناچتے دیکھا ہے ڈرائنگ روم اور اسٹیج کی روشنی میں میں نے اس کی وہ الیہ تصویر دیکھی ہے جس نے میرے تخیل کے تار جھنجھنا دیے۔ اس جگہ پر کوئی تھیٹریکل لائٹنگ نہ تھی۔ پل کی پل میں وہ ہم سے دور ہوتا چلا گیا اور ایک زیادہ پر اسرار ہیبت ناک دنیا میں کھو گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ہر آرٹ کی عظمت کو اس کی دوری یا قرب کے پیمانے سے ماپا جا سکتا ہے۔ سارا تخیلی آرٹ ایک فاصلے پر رہتا ہے...... اور جب اس فاصلے کا تعین کر لیا جائے تو ایک دخل انداز ہونے والی دنیا سے اسے بچا کر رکھنا بھی اشد ضروری ہے۔ شعر

RITUAL موسیقی، رقص، مدرائیں، ملبوسات، چہرے کے تاثرات، اسٹیج کی آرائش سب چیزیں ایسی ہوں جو اس دروازے کو بند رکھنے میں کامیاب رہیں۔ ہمارے تخیل سے عاری آرٹ ہماری روزمرہ کی دنیا کی ہو بہو نقل ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن جن فنون لطیفہ سے مجھے دلچسپی ہے وہ اجسام، شبیہوں، شکلوں، علامتوں کو ہماری دنیا اور ہم سے جدا کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم ذہن کی ان گہرائیوں میں چند لمحے گزار لیں جو اپنی لطافت اور گمبھیرتا کی وجہ سے اب تک ہماری پہنچ سے باہر تھے۔

ایذرا پاؤنڈ نے ان گنت نوہ تمثیلیں ترجمہ کی ہیں۔ گو ترجمہ در ترجمہ سے بات نہیں بنتی لیکن میں ان ہی میں سے تین تمثیلیں یہاں پیش کر رہی ہوں۔

(1)

کاکت سوباتا۔ سوسن کے پھولوں کی روح

پروہت

کورس

پروہت: میں ایک پروہت، دیس دیس گھومنے والا، میں میاکو بھی گیا اور میں نے سارے مندر اور محلے بھی دیکھے۔ اب میں پورب کی اور جاتا ہوں۔ ہر رات میرے لیے نیا بچھونا لاتی ہے اور میرے دل میں پرانا دکھ ہے۔ میں مکاوا آیا ہوں کہ سوسن کی بہار کا نظارہ کروں اب سبزہ میرے سامنے ہے پھولوں کو نزدیک سے دیکھنے کی خاطر میں آگے بڑھتا ہوں۔

وقت تو نہیں ٹھہرتا۔ بہار گزر جاتی ہے۔ جیٹھ مہینہ بھی آن پہنچے گا۔ نئی ٹہنیوں والے درخت اور بے نیاز گھاس اپنا سے نہیں بھولتی۔ ان کو پروا نہیں۔ لیکن فصل گل میں اپنے رنگ بکھیرنا یاد رکھتے ہیں۔

کاکت سوباتا: اس ویران دلدل میں تم کیا کرتے ہو بھائی؟

پروہت: میں ایک سیلانی پروہت، اپنے سفر پر جا رہا ہوں یہ کون جگہ ہے؟

کاکت سُوباتا: یاتُوسوباشی مکاوا۔ 'آٹھ پُل'۔ سوسن کا باغ دنیا کے بہتریں پھول تمھارے سامنے کھلے ہیں۔ اگر تم میں جذبہ ہے تم ان کے گہرے رنگ پہچان پاؤ گے۔

پروہت: یہ پرانی داستان والی کاکت سوباتا کے سوسن نہیں؟ ان کا قصہ کس نے لکھا تھا؟ تمھیں معلوم ہے؟

کاکت سوباتا: 'اسی سے سونوگاتاری' میں مرقوم ہے۔ 'اٹھ پلے' کے پاس کمودو کے پانیوں کی جھیل میں سوسن کھل کر اپنی پنکھڑیاں بکھیر گئے۔'' اور نری ہیرا نے لکھا ''یہ پھول اپنا درباری لباس ملک چین سے لائے تھے' دور دراز اوزدما سے نری ہیرا یہاں آیا تھا۔ یہاں اور آخر کے آخری کھونٹ تلک وہ مارامارا پھرا۔

کورس: کنارے کے قریب جل گہرا ہے۔ وہ جس نے خود کو مجھ سے باندھ دیا تھا ان گنت بار میرے اور اس جھیل کے پاس آیا۔

کاکت سوباتا: میں بولوں؟

پروہت: کہو۔

کاکت سوباتا: میں غریب آدمی ہوں۔ پر کیا تم میرے جھونپڑے میں رات گزارو گے۔؟

پروہت: یقیناً۔

(اب روح اس علاقے کی ایک سادہ سی نوجوان لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے اور ستون کے پاس سے ہٹ کر تبدیل لباس کی غرض سے اسٹیج کے دوسرے سرے پر چلی جاتی ہے۔ اب وہ اپنی اصلی حالت میں یعنی گزرے زمانوں کی اس شاندار خاتون کی حیثیت سے واپس آتی ہے جسے نری ہیرا نے چاہا۔ وہ سنہرے اور اودے بیل بوٹوں والی باریک زربفت کے اوپری لبادے کے نیچے تیز نارنجی، سبز اور طلائی کام کی پوشاک میں ملبوس ہے۔ اور ایک شب رنگ ٹوپی سر پر اوڑھ رکھی ہے۔)

کاکت سوباتا: (اپنی خواصوں سے) یہ ٹوپی۔ نگار خانۂ چین کی اطلس کا یہ لبادہ۔

پروہت: یا مظہر العجائب، اس خستہ حال جھونپڑی، اس سنسان کنج میں ایسی عالی مرتب بی بی۔

سوگی بوتائی کے عہد کی ٹوپی اوڑھے۔

کاکت سوہاتا: یہ لباس چین سے منگوایا گیا تھا، وہاں کے لوگ گیتوں نے اسے آج تلک یاد رکھا ہے۔ یہ تو جاپان کے قدیم شہنشاہ سیواتنو[2] کی مہارانی کی پوشاک ہے، وہ جسے نزی ہیرا نے چاہا، یہ ٹوپی اس کے ناچ کے لیے تھی، میں تو یادوں میں ملبوس ہوں پروہت جی

پروہت: اس پوشاک کو الگ رکھ دو۔ بی بی تم کون ہو؟

مہارانی: میں یادوں کا رنگ ہوں، اور نزی ہیرا خدائے موسیقی کا اوتار تھا، اس کے الفاظ، اس کے سروں میں سحر تھا۔ پودے گھاس، کلیاں، پتے، اس سے دعا مانگتے تھے کہ وہ انھیں شبنم عطا کرے۔

پروہت: ایسی دنیا میں جہاں ہر چیز برباد جاتی ہے۔ ایسی دعا کیا ضروری تھی! ذہن سے عاری پودوں کی خاطر میں بودھی ستوا کے قانون کا پرچار کرتا ہوں۔

مہارانی: یہ رقص بدھ کے حضور میں ہماری عبادت تھی۔

پروہت: (موسیقی کی آواز سنتا ہے) یہ یقیناً آتماؤں کی سنگیت ہے۔

مہارانی: اس نے آدمی کا روپ دھارا۔

پروہت: اپنے جگمگاتے شہر سے باہر جا کر وہ دور دور نکل گیا۔

مہارانی: خلق کو۔

پروہت: اپنی دیا سے بچاتا رہا۔

کورس: دور ——— اور دور ——— کتنی دور ——— میں ناچ کے کپڑے پہنتی ہوں۔

مہارانی: غم فراق کا لباس۔

اس کہانی کی نہ ابتدا رہے نہ انتہا، کسی نے نہ کرنے والے کو دیکھا۔ نہ کسی نے کرم پہچانا۔ اگلے وقتوں میں ایک نوجوان نارا کی طرف شکار کھیلنے گیا۔

کورس: ہمارا خیال ہے وہ سیواتنو کا دور تھا۔ شہنشاہ کے فرمان کے ان الفاظ کے ذریعہ ''مارچ کے شروع میں جبکہ پہاڑیوں پر کہرہ چھایا ہوتا ہے۔'' اسے خلعت عطا کر کے کاروگا کے تہوار

کا خاص پیغامبر بنایا گیا۔

مہارانی: جو غیر معمولی عزت افزائی کی بات تھی۔

کورس: شاہی محل میں ناٹک بہت کم کھیلا جاتا تھا (پہلی مرتبہ ناٹک کھیلا گیا)۔ دنیا کی شان و شوکت چندروزہ ہے۔ پھول کھلا مرجھا گیا۔ چنانچہ وہ بھی قسمت آزمانے اوذو ما چلا گیا۔ بادل کی طرح آوارہ۔ برسوں بعد ایسے کی لہروں کو دیکھ کر اسے اس عارضی عیش وعشرت کی یاد آئی۔ موجیں لوٹ کر آتی ہیں پر زمانہ نہیں لوٹتا۔ نری ہیرا۔ نری ہیرا میری شان و شوکت کبھی واپس نہ آئے گی۔ پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر وہ جوالا مکھی کا دھواں اوپر اٹھتا دیکھا کیا۔

مہارانی: آساما کی چوٹی سے دھواں اب بھی اٹھ رہا ہے۔ نری ہیرا۔ نری ہیرا۔ میری شان وشوکت کبھی واپس نہ آئے گی۔

کورس: وہ سارے میں گھومتا رہا۔ اور پھر مکاوا آن پہنچا جہاں جھیل کنارے سوسن کھلے ہیں۔ مونوگاتری کی حکایت میں اس کے سفر کے قصے طولانی ہیں لیکن آٹھ پلوں کے نیچے ندی بہتی رہتی ہے۔ جگنو چاروں طرف اپنی روشنی پھیلاتے اڑا کرتے ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی روحیں آسمان پر جارہی ہیں۔ یہاں پاتال میں خزاں کی ہوائیں چلتی ہیں اور جنگلی بطخیں چیختی ہیں—— کاری—— کاری—— میں جو آوارہ گردوں کا ہمزاد ہوں اِدھر اُدھر بھٹکتا لوگوں کو بتلانا چاہتا ہوں چاہے وہ مجھے جانیں یا نہ جانیں۔ روشنی جو اندھیارے کی سمت نہیں جاتی۔

کورس: (نری ہیرا کا گیت گاتے ہوئے)

چاند وہ چاند نہیں۔ بہار پچھلے زمانوں کی بہار نہیں۔ میرا جسم میرا جسم نہیں۔ خالی ایک بوڑھا ڈھانچہ ہے۔ نری ہیرا۔ نری ہیرا میری شان وشوکت واپس نہ آئے گی۔

کورس: (دوبارہ) جاننا چاہیے کہ نری ہیرا نے یہ نظمیں سیوا تسو کی ملکہ کے لیے کہی تھیں۔ جسم کا ریشہ ریشہ الگ ہو جاتا ہے۔ اصل شبیہہ سائے اور روشنی میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور اب

میں اپنا پرانا جگر جگر کرتا لبادہ پہن کر رقص شروع کرتی ہوں۔

(ناچ جس کی وہ تشریح کرتی جاتی ہے)

پھولوں پر سے پگھلتی برف۔ اڑتی تتلی۔

کورس: بید مجنوں کے کنج میں اڑتے سونے کے ڈلے۔

روح: کاکت سوباتا کی سوسن پھر سے بوئی جارہی ہے۔

کورس: پرانے جگمگاتے رنگ لوٹ آتے ہیں۔

روح: اسی طرح ہر کہانی شروع ہوتی ہے۔

کورس: سوسن کے رنگ کیا ہیں کاکت سوباتا آیا ہے؟

سرمئی اور زیتونی چوغوں میں ملبوس کورس شوخ رنگوں والی رقاصہ کو چاروں طرف چھپا لیتا ہے) درخت پر کون ہے۔

(روح فضا میں غائب ہونا شروع ہوتی ہے)

کاکت سوباتا: یہ تو محض ٹڈی کے جسم کا خشک چھلکا ہے۔

کورس: آستینیں اس گل پونو کی برف کی مانند سپید ہیں۔ جو اپریل مہینے میں پنکھڑیاں گراتا ہے۔

دن نکلا۔ اُودا پھول اپنا دل وا کر دیتا ہے اور اپنے خیالوں کے ذریعہ مرجھا جاتا ہے روح کا پھول بدھ میں تحلیل ہو گیا۔

(2)

واکی .... پروہت

شے نے .... ہیرو کی روح

سورے .... لڑکی کی روح

(دونوں عرصہ ہوا مر چکے ہیں اور مرنے کے بعد بھی مل نہیں پائے۔ ہیرو نے لڑکی کی بے اعتنائی کے غم میں جان دے دی تھے۔ اس کے مرنے کے بعد لڑکی نے جفا سے توبہ کی۔

اور اب اس کی روح پشیمان ہے۔)

کورس

واکی: کوہ شنوبو کا نام سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ دوسرے خانہ بدوش بھکشوؤں کی مانند میں بھی اس راستے پر عازم سفر ہوتا ہوں۔ میں اب تک پورب دیس نہیں گیا۔ پر اب تو یہ ٹھانی ہے کہ دنیا کے چھور تک جاؤں گا۔ اور کا ہے نہیں؟ میری کوئی منزل نہیں۔ دوسروں کا جھنڈا میں نہیں اٹھاتا میں تو بادل کی مانند آزاد ہوں۔ اب رات کا پرچم میرے سامنے لہراتا ہے نجانے سمندر کس طرف ہے یا وہ قصبہ کیفو جو سنا ہے۔ سمندر کے کنارے آباد ہے۔

شے سٹے اور سورے: ان گنت بار یہ رنگین شا کھا یہاں لائی گئی ہے۔ اس پر لکھے ہوئے تُو نے ان پہاڑوں پر بکنے والی 'گھاس کی اطلس' کے نقش ونگار کے ایسے دلفریب ہیں۔

شے سٹے: (سورے سے) ہم لوگ گڑبڑا گئے ہیں۔ غلطی کس کی تھی میری جان؟ ہم گھاس کی اس تصویر کے مانند جو اس کھردرے کپڑے پر چھپی ہے، یا جھینگر کی طرح جو سمندری پودوں میں گھسا چلا تا رہتا ہے، الجھ کر رہ گئے ہیں۔ ہم کو معلوم نہیں۔ ابد کے اس ویرانے کے کن جنگلوں میں ہمارے آنسو کھو گئے؟ نہ ہم جگتے ہیں۔ نہ سوتے ہیں۔ بہار کے مناظر سے ہمیں مطلب؟ سوتے میں اس کا خیال کرنا جیسے تمھارا خیال نہیں۔ یہ کون طرح کا خواب ہے؟ ہمارے دلوں میں بہت کچھ ہے اور ہمارے جسم ختم ہو چکے۔ آنسوؤں کی ندی کا پانی بہتا جا رہا ہے۔

کورس: کیفو کا کپڑا عرض میں کم ہے۔ اور پہاڑی دریا کا پاٹ چوڑا جس کے دونوں کناروں پر وہ دونوں الگ الگ کھڑے ہیں جو کپڑا دلھن نے بنا تھا بے رنگ ہو چکا۔ ایک ہزار ایک سوراتیں بیکار کے انتظار میں گزریں۔

واکی: (یہ نہیں پہچانتا کہ روحوں سے مخاطب ہے) اس بھیڑ میں دو شہر والے کہاں سے آ گئے عجیب لوگ ہیں دونوں۔ دیکھنے میں میاں بی بی معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں پروں سے بنا ہوا کپڑا ہے۔ لڑکے نے بڑی خوبصورت منقش چھڑی سنبھال رکھی ہے۔

انوکھی سی چیزیں ہیں۔

سورے: یہ کپڑا ہوسونو کہلاتا ہے اور عرض میں کرگھے کی چوڑائی کے برابر ہے۔

شے ئے: یہ محض ایک معمولی سی رنگین لکڑی ہے مگر یہ مقام انھی دونوں چیزں کے لیے مشہور ہے۔ تم ہم سے خرید و گے انھیں۔

واکی: میں جانتا ہوں۔ اس علاقے کا کپڑا اور سنہرے روغن کا سامان بہت مشہور ہے نہ معلوم ان کی اتنی شہرت کس وجہ سے ہے؟

سورے: تم نے آج تک ان کی کہانی نہ سنی؟ تعجب!

شے ئے: لوگوں کو اپنے بکھیڑوں سے ہی فرصت نہیں ان سے یہ توقع کیوں رکھتی کہ وہ تمھاری رام کہانی بھی جانیں۔

دونوں: تم سنیاس لے چکے ہو اس لیے عین ممکن ہے کہ تم کو ان دونوں چیزوں کی اہمیت کا علم نہ ہو جن پر محبت کے منتر منقش ہیں۔

واکی: یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔

شے ئے: تین سال کے عرصے میں لڑکی کے گھر کے سامنے ایک ہزار رنگین ڈالیوں کا انبار لگ گیا۔ ان کے متعلق تمھارے زمانے میں گیت بھی بنے ہیں۔

سورے: ایک ہزار۔

کورس: اب شاخ گل پیش کرنے کی رسم بھلا دی گئی، یہ کہانی ایسی ہے کہ سن کر دیوتا بھی چلو بھر پانی میں ڈوب مریں۔ ہم گھر لوٹتے ہیں۔ شام کا سورج ڈوب چکا۔

شے ئے: اس علاقے کی رسم ہے کہ خواستگار درختوں کی ڈالیوں کو رنگوں سے سجا کر اپنی مطلوبہ حسیناؤں کی چوکھٹ کے سامنے رکھ آتے ہیں۔

سورے: اور لڑکی جس کو پسند کرتی ہے اس کی لائی ہوئی شاخ گل اٹھا لیتی ہے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان تین سال تک ہر رات اپنا معروضہ لے کر آیا۔ اور پہاڑ کے دامن میں ایک ہزار چھڑیاں پڑی ملیں۔ اس نوجوان کا واقعہ مجھے معلوم ہے۔ اسے ان لکڑیوں سمیت ایک

کھوہ میں دفن کر دیا گیا۔

واکی: مجھے اس کھوہ کا راستہ دکھلاؤ گے؟

شے تے: میں تمھیں اس کھوہ کا راستہ دکھلاؤں گا۔

کورس: ہم کیفو کی اونچی اونچی گھاس سامنے سے ہٹا کر دن بھر، شام ڈھلے تک چلتے رہے اور کھوہ کے نزدیک اب تک نہیں پہنچے۔ اور پہاڑی پر گھاس کاٹنے والے بھائی۔ ذری بات سننا۔

کورس: (خود ہی گھسیارے کی طرف سے جواب دیتا ہے) پگڈنڈی پر کہرہ بکھرا ہوا ہے۔ مگر تم پوچھو گے کہ شبنم کہاں ہے۔ اب اس کا جواب تمھیں کون دے؟ اچھا مت بتاؤ۔ چلو آگے چلیں۔

شے تے: خزاں کا موسم سرد ہے اور رات آتی ہے۔

کورس: اور آندھی۔ درختوں کے پتے گر رہے ہیں۔ بارش کی پھوار برس برس جاتی ہے۔ خزاں کے شبنم آلود پتوں میں ہمارے پاؤں اٹک اٹک گئے۔ ابدی سایہ تنہا ہے، پہاڑ کی پرچھائیں اکیلی کھڑی ہے۔ پائن کے درختوں پر عشق پیچاں میں چھپا ہوا اُلو بولے چلا جا رہا ہے۔ بنفشہ اور گل داؤدی میں گھری ہوئی کھوہ میں لومڑی براجتی ہے۔ دونوں اندر چلے گئے۔

(شے تے اور سُورے گویا کھوہ میں داخل ہوتے ہیں)

دوسرا حصہ

(واکی گویا سونے کی کوشش کر رہا ہے)

واکی: (بے چینی سے) نیند نہیں آتی۔ اکتوبر کی ہوائیں۔ صنوبر کے درخت۔ رات۔ میں بودھی ستوا کی عبادت کروں گا۔

(گویا پوجا شروع کرتا ہے)

سورے: پردہت جی! اب ہم جو زندگی اور زندگی کے بعد بھی جدا رہے، ملیں گے خود رو گھاس پر،
ان پودوں کے اوپر جن میں میں رہتی ہوں، میں خواب کا پل بناؤں گی۔ پردہت جی۔
مجھے زبردستی نہ جگانا۔ میں نے دیکھا ہے کہ قانون مکمل ہے۔

شے لے: (گویا نظروں سے اوجھل ہے) آپ کی عبادت بہت خوب تھی مہاراج۔ جو دونوں لوک
تک گئی اور پرانے بندھن باندھے۔ اب میں پہلی بار رنگ میں ظاہر ہوتا ہوں۔

کورس: تین سال گزر گئے کہانی پرانی ہو گئی۔

شے لے: خواب کے اندر خواب دیکھنے کے لیے ہم واپس آئے ہیں۔

کورس: دیکھو۔ کھوہ میں سوزوکی کی شاخوں کے نیچے ایک لمحہ کے لیے وہ نمودار ہوئے۔

شے لے: جہنم کی تہہ میں شاہزادوں اور عوام کے درمیان کوئی تخصیص نہیں کی جاتی۔ میری بدقسمتی!

واکی: تعجب! پرانی کھوہ آگئی کے شعلے ایسی جگمگا اٹھی۔ جیسے کسی کے گھر کا روشن کمرہ! اندر کر گھالنگا
یا جا رہا ہے اور جادو کی ٹہنیاں اکٹھی کی جاتی ہیں۔ پردے اور سامان آرائش تو کسی
پرانے عہد کا جان پڑتا ہے۔ یہ کیسا فریب نظر ہے۔ کیسا طلسم؟

سورے: ہمارے دل تو گرتی برف کے اندھیارے میں چھپے تھے تم جو ابھی دنیا میں موجود ہو۔
تمھیں ہم سے بہتر معلوم ہونا چاہیے کہ مایا کیا ہے اور حقیقت کیا۔ ہم تو ڈوبنے اور مٹ
جانے والوں کے بھنور میں رہتے ہیں۔

شے لے: پچھلے زمانے میں نری ہیرا نے کہا تھا (اور گزرتے برسوں کے ساتھ وہ بھی غائب ہو گیا)
کہ مسافر، یہ تو تم ہی بتلاؤ کہ مایا کتنی ہے اور حقیقت کتنی۔

واکی: یہ خواب ہی سہی، یا نظر کا دھوکہ۔ مگر اس سے پہلے کہ یہ رات بھی گزر جائے میں عہد رفتہ
کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔

شے لے: دیکھو! جس طرح پھول کا سایہ گھاس پر نظر آتا ہے اور چراغ کے بجائے روشنی کے لیے
تمھارے اس صرف چاند ہے۔

سورے: لڑکی کھوہ میں چلی گئی۔ اور اب کر گھالنگا کر خزاں کے پتوں کا ایسا ہلکا کپڑا بن رہی ہے۔

شے نے: خواستگار شاخ گل لا کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔
سورے: پہلے اسے۔
شے نے: کرگھے کی آواز کے سوا۔
سورے: اور کوئی آواز۔
شے نے: جواب میں نہ سنائی دی تھی۔
سورے: اور مڈوں اور سبز جھینگروں اور موسم خزاں کی گرتی پتیوں کی ایسی خوبصورت صدا۔
شے نے: جو تمہیں ہر رات سنائی دیتی ہے۔
سورے: کری۔
شے نے: تہاری۔
سورے: چو۔
شے نے: چو۔
کورس: (جھینگروں کی آواز کی نقل کرتے ہوئے۔) کری ہتاری—— چو—— چو——
کری—— ہتاری—— چو—— چو—— کھیت کی نئی گھاس سے اپنے پھٹے پرانے کپڑے رفو کر رہا ہے۔ شو—— چو—— ای شو—— کرگھے کی آواز۔ چو۔
کورس[3]: (باز گرد) کیفو میں گھاس کا کپڑا بنا جاتا ہے۔ کیفو جو جزیرے کا آخری سرا ہے۔ دنیا کا بے مثال شہر کیفو——
شے نے: یہ بڑی پرانی رسم ہے۔ مگر پروہت جی بھی تو ماضی کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔
کورس: پروہت جی مہاراج خود بھی کہیں گے کہ اگر ہم 'سونو نو بن' ڈالیں، ایک ہزار ایک سو راتوں تلک جادو جگائیں تب بھی ہماری کوئی تمنا بر نہ آئے گی۔ نہ مدھم پڑے گی نہ ختم ہوگی۔
شے نے: آج ہمارا بروگ گیتوں میں گایا جاتا ہے۔
کورس: شاید مدھم ہیولی بھی کچھ شکتی حاصل کر سکے۔ ہمارا پچھتاوا خواب کی صورت ہی میں کیوں نہ ظاہر ہو وہ شاکھائیں لے کر جا رہا ہے۔ حالانکہ اب لڑکی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

وہ تو کھوہ میں بیٹھی جھینگر کی طرح کپڑا بنتی ہے۔ رات ہوگئی۔ اس کے دل میں محبت ہے
میں یہاں پڑا ہوں۔ ایک جسم جسے کوئی نہیں جانتا۔ کائی میں مدفون لکڑی کی مانند یہی
مناسب تھا کہ میں بھول جاتا۔ مگر ہمارا قصہ تو ساری دنیا میں پھیل گیا۔

شے لے: بتاؤ مجھے کس طرح معلوم ہوسکتا تھا کہ میری تحریروں کا پلندہ اس کے کرگھے کے نیچے پڑا ہوگا۔؟

کورس: سال کا آخری حصہ خزاں نے سرخ کردیا۔ ہزار راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں۔ میرے آنسوؤں سے بھیگ بھیگ کر میں اور میری آستیں معدوم ہوچکیں۔ کیا میں اب بھی اندر نہیں آسکتا؟ ہم سب گزر جائیں گے، تم اور میری آستینیں اور میرے آنسو۔ اور تم کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ تین برس کب نکل گئے۔

کورس: کیا میں بالآخر دلھن کا کمرہ دیکھ پاؤں گا جسے کسی نے آج تک نہ دیکھا؟

شے لے: آخرکار نجوگ کی گھڑی آئی۔

کورس: ناچ میں رقصاں آستینیں برف کے گالوں کی طرح درخشاں ہیں۔

شے لے: ناچو۔

کورس: ناچو اور راگ چھیڑو۔ یہ ناچ نشی کی گی کے لیے ہے

شے لے: یہ ناچ شام کے ناگوں اور کپڑا بننے والیوں کے لیے

کورس: ناچ عکس شراب کے پیالوں میں لرزاں ہے۔

کورس: (دوبارہ) آری —— آ گی —— صبح ہوگئی! چلو —— چلو —— اس سے پہلے کہ روشنی پھیل جائے (دا کی سے) ہماری تم سے درخواست ہے۔

جگنا نہیں پروہت۔ ہم سب مرجھا جائیں گے۔ تم ابھی جگو گے۔ تم سرحدوں پر پھرتے ہو۔ کسی شے کو تمھارا انتظار نہیں یہ سب ختم ہوجائے گا۔ یہاں پر، اس ویرانے کے کھرے میں اس سنسان کھوہ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آج کی ہوا صنوبروں میں سرسرا رہی ہے۔ سناٹا ہے کوئی روشنی نہیں —— کوئی زندگی نہیں۔

(3)

ہیرو .... ایک نوجوان زمیندار
لڑکی .... اس کی بیوی
یوگیری .... مہری
لڑکی کی روح

زمیندار: میں کن شوکا رہنے والا ہوں، آشیا کہلاتا ہوں۔ گمنام اور معمولی آدمی ہوں۔ مقدمے بازیوں کے چکر میں عرصے سے دارالسلطنت میں مقیم ہوں۔ چند روز کے لیے آیا تھا۔ پر آج پورے تین سال ہو گئے۔ اب مجھے گھر کی فکر ستا رہی ہے۔ میں اپنی مہری کو گاؤں بھیجتا ہوں۔ ہو۔ یوگیری! میں بہت پریشان ہوں۔ تم گاؤں چلی جاؤ اور میرے گھر والوں کو مطلع کر دو کہ میں اس سال کے آخر تک لوٹ آؤں گا۔

یوگیری: بہت اچھا۔ (روانہ ہوتی ہے) پل پل چھن چھن دن گھٹتا جا رہا ہے۔ اپنی سفری پوشاک میں ملبوس میں سورج کے ساتھ ساتھ راستہ طے کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم نہیں راہ میں کتنے خواب آتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں رات کے تکیے میں کتنی نیند جمع ہوتی ہے۔ آخر کار میں گاؤں پہنچ گئی۔ اب میں آہستہ سے پکارتی ہوں۔ کوئی ہے۔ اندر خبر کر دو کہ یوگیری دوار پر کھڑی ہے شہر سے آئی ہے۔

لڑکی: الم۔ الم! گھونسلے اداس ہیں۔ مچھلیاں غمگین محبت شعار عظمتیں افسردہ۔ وہ جو ایک دوسرے سے بندھے ہوں۔ ایک دوسرے کی دنیا میں رہتے ہوئے وہی زیادہ دکھی ہوتے ہیں۔ اے ہری گھاس! جب بارش تجھ پر برسے تو آنسو بہانا نہ بھولنا۔ میرے آنسو تو خاموشی کی برکھا ہیں۔ اے دل ـــــ اے دل ـــــ

مہری: کانوں والو۔ سن لو۔ کہ یوگیری آن پہنچی۔

لڑکی: یوگیری؟ مجھے تو مہری کی ضرورت نہیں۔ اندر آ جاؤ۔ یوگیری۔ تم ایسی مہمان طریق کیوں

آئی ہو۔ آؤ جم جم آؤ۔ یو گیری۔ مجھے بڑی شکایت ہے۔ تم اتنی بدل گئیں۔ نہ خط نہ پتر۔ کبھی ہواؤں کے ذریعہ ہی کوئی پیغام بھیج دیا ہوتا۔

مہری: میں تو آنا چاہتی تھی پر سرکار نے اجازت نہ دی۔ تین سال انھوں نے مجھے اس دقیانوسی شہر میں قید رکھا۔

لڑکی: شہر تم کو نہ بھایا؟ میں تو وہاں کے بہار کے شگوفوں کو اکثر یاد کرتی تھی۔ اس کے بعد میرا دل غم کے لبادے میں چھپ گیا۔

کورس: خزاں کے اختتام پر، ایک دیہاتی مکان میں، جہاں گھاس اس طرح مرجھا رہی ہے جیسے انسانوں کی آنکھوں سے روشنی زائل ہوتی ہے، اسی طرح محبت کا بھی خاتمہ ہو گیا کل کے لیے وہ کس کا سہارا ڈھونڈے؟ تین سال۔ خزاں کا خواب۔ یہاں تک کہ ان خوابوں کے الم نے اس کے دل میں خزاں کی صدائے بازگشت جگا دی۔ دن گزر گئے اگر دنیا میں جھوٹ کا وجود نہ ہوتا تو کوئی مردوں کے قول کا بھروسہ بھی کر لیتا۔ مرد پر اعتبار کیا۔! مورکھ لڑکی! مورکھ لڑکی!

لڑکی: یہ عجیب سی چیز کیا ہے جس کی شکل آواز کے روپ میں مجھ تک پہنچ رہی ہے۔؟

مہری: گاؤں کا کوئی جولاہا چوکھٹے پر تان کر نیا ریشم چھٹپھٹاتا ہے۔

لڑکی: ارے بس؟ میں تو پرانی کہاوت کی طرح گھس پٹ چکی ہوں۔ جب چین کا سیلانی سوبو بی بی بچوں کو فراموش کر کے منگولوں کے دیس میں گھومتا پھر رہا تھا تو وہ بیچاری شفاف ٹھنڈی راتوں کو اپنی اونچی برجی پر چڑھ کر ریشم کا تختہ پیٹا کرتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کی سرسراہٹ کی آواز پر سینکڑوں کوس دور بھی وہ سوتے میں کروٹ بدل لیتا تھا۔ میں نے بھی اپنے چوبی تختے پر رنگ برنگے نقش و نگار والے ریشم پھیلائے۔ جو انوکھے پرندے جھٹ پٹے کی امڈتی تنہائیوں میں سے لے کر آئے تھے کہ میرے جی کو چین ملے۔

مہری: یہ تو غریبوں کا کام ہے۔ جو جولاہوں کو بھی تھکا دیتا ہے آپ کی ایسی اونچے گھرانے کی بٹیا نے دل کے سکھ کی جستجو میں یہ کٹھن محنت بھی کی۔ لائیے مجھے دیجیے یہ کام میرے

ہاتھوں کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

لڑکی: پیٹو۔ اور زور سے پیٹو تا کہ ہمارے دل کا سارا بخار نکل جائے۔

مہری: یہ کپڑا کافی کھردرا ہے۔

کورس: صنوبر کے درختوں کی مدھم آواز مجھ سے رات کو باتیں کروائے گی۔ کتنی سردی ہے۔

لڑکی: خزاں آ گئی۔ اور نہ تمھاری ہرجائی ہوا کوئی خبر لے کر آئی نہ کہرے نے کوئی پیغام سنایا۔

کورس: تھکن اور رات

لڑکی: دور دراز کے گاؤں۔

کورس: شاید چاند بھی اندھیرا پڑے اس کے پاس یہ پوچھنے نہیں آئے گا۔ یہ کس کی رات کی دنیا ہے؟

لڑکی: اے خوشگوار موسم! کہہ کہ وقت بھی خزاں رسیدہ ہے۔ شام ڈھلی جاتی ہے۔

کورس: بارہ سنگھے کی آواز سے اس کے دل کو دکھ ہوتا ہے۔ ہمیں شاخ کا سرا دکھائی نہیں دیتا۔ آخری پتہ بغیر کسی گواہ کے گر گیا۔ سائے ہیبت زدہ ہیں۔ چاند اور گھاس جھجھکے کے نیچے خاموش ہیں۔

لڑکی: میری اندھی روح شبنم آلود پردے کی طرح معلق ہے۔

کورس: اظہار الم کے لیے کیسی رات ہے یہ! سحر زدہ لمحے۔ کپڑے کا چوکھٹا محل کی چھت پر کھڑا ہے۔ اور شمال کی ہوا اس کا ریشم پھڑ پھڑا رہی ہے۔

لڑکی: جولاہے کبھی ریشم کو دھیرے دھیرے پیٹتے ہیں کبھی زور زور سے کیا گاؤں میں بہت سارے جولاہے رہتے ہیں۔

یوکیری: چاند کی ندی مغرب کی سمت بہہ رہی ہے۔

کورس: آوارہ گرد سوبواتر کے صوبے میں کہیں پڑا سوتا ہے اور یہاں پورب کے آسمانوں پر پچھوا چل رہی ہے۔ اے ہوا! یہ بے چاری جو ریشم پیٹ رہی ہے اس کی آواز بھی اپنے ساتھ لے جا۔

کورس: (باز گرد) ہوا! باڑ کے کنارے لگے ہوئے صنوبروں سے خبر دار رہنا کہیں ان کی سرسراہٹ اس آواز میں مخل نہ ہو جائے۔
ہوشیار! آوارہ گرد طوفانوں کی صداؤں کو بھی نہ بھلانا جو تمھارے پیچھے پیچھے سفر کرتے ہیں۔ اس دکھیاری بچی کے دیوتا کے پاس جاؤ۔ اے پچھوا! میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ خواب دیکھتا رہے۔

لڑکی: اوئی۔ اگر یہ تانا بانا ٹوٹ گیا تو وقت سے تھک کر میرے پاس کون آئے گا۔ اگر آنا ہے تو ابھی آ کہ وقت باقی ہے۔ دوبارہ تراشنے سے لباس مختلف ہو جاتے ہیں۔ محبت تو گرمیوں کی ململ کی طرح کمزور ہے مجھے چاند کے نیچے نیند نہیں آتی۔

کورس: دیوتاؤں کی محبت بھی ململ کی مانند ناپائیدار ہوتی ہے۔ آسمان کی ندی کی لہروں نے ہمارے وقت کو قینچی کی طرح کاٹ ڈالا۔ کاجی کے پتے پر آنسو جگمگاتے ہیں اور تیز دھارے پر بہتی ڈونگی کی پتواراوس میں بھیگ چکی ہے۔ اگر وہ آ گیا تو کیا دیوتاؤں کی آستینوں کو کوئی نقصان پہنچے گا؟

لڑکی: بھادوں کا ساتواں دن ہے راتیں لمبی ہونے والی ہیں میں اس کو ان دس ہزار آوازوں کی اداسی بھیجوں گی چاند کا رنگ، ہوا کی مہک، کہرہ، لمحہ جب دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ ریشم پیٹنے کی صدا، رات کے طوفان جھگڑوں میں بلند ہونے والی چیخ، جھینگروں کا گیت، شبنم گرنے کا احساس، سرگوشی کی آہیں...... ہیرا...... ہیرا......

مہری: اب میں کیا کروں؟ شہر سے ایک آدمی خبر لایا ہے کہ مالک اس سال نہ آسکیں گے۔ لگتا ہے شاید۔

کورس: دل جو سوچتا ہے کہ اب نہ سوچے گا، بیٹھ رہا ہے۔ باہر جھینگروں کی آواز ڈوب گئی۔ پھول ہوا میں کھلا پڑا ہے دیکھنے والے دیوانگی کی طرف بڑھ گئے۔ پھول کا دل زندگی کی وحشی ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا سارا راز بکھر گیا۔

(لڑکی مر جاتی ہے۔ اس کا شوہر داخل ہوتا ہے)

زمیندار: اس کے غم وغصہ نے ہماری تین سالہ جدائی کو ابدی فراق میں تبدیل کر دیا۔

کورس: آٹھ ہزار پر چھائیوں نے ہمیں بتلایا ہے کہ قتل سے پہلے پشیمان کوئی نہیں ہوتا۔
الم......! کہ ہم تانت پر بات کرتے ہیں۔ الم......! کہ ہم محض سارنگی اور کمانچے کے ہم زبان ہیں۔

لڑکی کی روح: اوئی......! قسمت جو آخر کار بجھ گئی اور تین دھاراؤں والی ندی میں جا ڈوبی۔
آلو چے کے پھولوں کی روشنی غائب ہوگئی۔ جو دنیا میں آمد بہار کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

کورس: راستے کے اجالے کے لیے اس نے مشعل جلالی۔

روح: جس کی روشنی میں وہ کبھی نہ ڈوبنے والے چاند کے تلے خزاں کے موسموں کا نظارہ کرے گی۔ اور اس کے باوجود، خواہشوں کا شکار کون نہیں بنا؟ خیال کی آگ اور اس کے دھوپ کے مرغولوں میں لپٹ کر تمناؤں کے انبار میں دب جانا بہت آسان تھا۔ اے دل۔ تو نے انتہائے کرب کے عالم میں پچھتاوے کے ریشم کو پیٹا۔

کورس: موہ مایا اور قسمت! اس کے آنسو ریشم کے تختے پر گرتے ہیں۔ آنسو شعلے میں تبدیل ہو گئے۔ اور دھویں نے اس کی چیخوں کو گھونٹ دیا۔ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکتی۔ نہ ریشم پیٹنے کی آواز۔ نہ صنوبروں کی سرسراہٹ۔ محض اس المناک سزا کی آواز آ رہی ہے۔ اوی...... اوی......! نیند کی رفتار کی طرح آہستہ۔ وقت کے راہوار کی طرح تیز۔ تبدیلی اور گزر جانے کے چھ راستوں کے ذریعے ہم چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ نہ کرم کے شعلوں سے گو ہم زندگی اور موت میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ یہ عورت بھاگ کر ایسی دنیا میں پہنچی جہاں سواد ہے نہ سانس۔

روح: کانسو گھاس بھی اپنی پتیاں ٹیڑھی کر کے پاتال سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

کورس: او اشتیاق مجسم! تو نے اس شخص کو دونوں لوک میں عزیز رکھا تھا۔ اور امید نے ایک ہزار نسلوں تک پیچھا نہ چھوڑا۔ پر سب بیکار تھا۔ صنوبروں سے ڈھکی کوہ ماتسویاما کی چٹانیں وقت کے اختتام پر کھڑی ہیں تمھارے الفاظ بے کار ہیں۔ اوی...... اوی...... مرد کا دل

بس یہی ہے۔

روح: کبھی! تم کو میرا کوئی اونگھتا ہوا خیال بھی نہ آیا۔ تمھارا کوئی خواب مجھ تک نہیں پہنچتا۔
شرم......! شرم!

کورس: وہ 'پھول کے دھرم' کا جاپ کر رہی ہے اور اس کی آتما بودھی ستوا میں داخل ہوتی ہے۔
راستہ روشن ہو گیا۔ اس کے مستقل ریشم پہنے نے پھول کو وا کر دیا۔ اور وہ رسان سے
بودھی ستوا میں شامل ہو گئی۔

(ترجمہ: 'نقوش' لاہور، جون 1960)

حواشی:

1. رابرٹ فیولوزا (Robert Feuollosa)
2. نویں صدی عیسوی
3. Antistrophe

غزل پارے

جدید غزل کا درونی سلسلہ میر سے ہے کہ میر ایک غیر معمولی حسیت کے شاعر تھے اور آج کے شاعر ہی کی طرح ایک بحرانی عہد میں لکھ رہے تھے۔ شجاع خاور اور ان کے ہم عصر شاعروں کا رابطہ اٹھارہویں صدی کے میر سے اس لیے بھی گہرا ہے کہ یہ شعرا بھی ایک ایسے عہد میں شعر کہہ رہے ہیں جو خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ شجاع خاور کی شاعری میں تنہائی کے ساتھ ساتھ سماجی مجلسیت اور انفرادیت کے شانہ بہ شانہ روایت کا شعور جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں ایک طرح کے غیر رسمی پن، اور شاعرانہ تصنع سے انحراف کی کیفیت کہیں زیادہ موجود ہے۔

اس انتخاب (غزل پارے) میں شامل کچھ اشعار اپنی بندش اور گہرائی کے سبب متاثر کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کی جودت اور تیکھا پن ترجمے میں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ شجاع خاور کے ایسے مخصوص اشعار ہمارے ذہن کو ان مخصوص عامل کی طرف لے جاتے ہیں جن سے اردو زبان کے ذخیرے اور اس کی معنویت عبارت ہے۔

نہ جانے کیوں شجاع خاور کی شاعری میں ان قلندروں کے نعروں اور آوازوں کی گونج سی سنائی دیتی ہے جو کبھی پرانی دلی کے خاموش گلی کوچوں میں شبانہ آوارہ گردی کیا کرتے تھے مگر

ان غزلوں میں وہ بھی موجود ہے جسے ہم شہری فہم وفراست اور اجتماعی تجربات سے منسوب کر سکتے ہیں۔

اردو کے اہم اور غیر اہم شعرا نے بے شمار اشعار کہے ہیں جو انسانی صورت حال پر زمان و مکان کی حدود سے ماورا ایک ہمہ گیر تبصرے کا وقار اور اعتبار رکھتے ہیں۔ ایسے اشعار میں ایک ہمہ گیر اور آفاقی تاثیر ہوتی ہے، اور اردو شاعری کی اسی خصوصیت نے اسے خاص و عام کے لیے یکساں طور پر خاصے کی چیز بنایا ہے، جس سے عالم اور نادان دونوں اثر، ادراک اور حظ لیتے ہیں۔ شجاع خاور اردو شاعری کی اسی مخصوص اور عوامی روایت کے شاعر ہیں جس میں اشعار زبان زد ہو جاتے ہیں۔

کچھ اشعار:

ہمیں سب کچھ پرانا چاہیے تھا
دکانیں شہر میں ساری نئی تھیں

نہ وہ تیور قلندر کے نہ وہ لہجہ قلندر کا
اٹھاتا ہے کوئی اور آج کل خرچہ قلندر کا

مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں
تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں

گذشتہ لمحات کو بلا لو نوشتہ الفاظ کو ملا لو
جواب تیار کر کے نکلو سوال باہر کھڑا ہوا ہے

(شجاع خاور کی غزلوں کے سوا سو منتخب اشعار، مرتبین: نور جہاں ثروت و سراج درپن)

(انگریزی سے ترجمہ، 'کتاب نما'، فروری 1991)